متاعِ قلم

محمد رضوان القاسمی

دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد

شمس الاسلام
26/06/07
140/-

متاعِ قلم

محمد رضوان القاسمی

دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب :	متاعِ قلم
نام مؤلف :	مولانا محمد رضوان القاسمی
کتابت :	مولانا محمد عرفان عالم قاسمی / سید مسرور احمد
طبع اوّل :	جون ۲۰۰۴ء
تعداد :	گیارہ سو
قیمت :	Rs. 200/=

ناشر

دارالعلوم سبیل السلام

مدینۃ العلم، حیدرآباد (الہند)

Darul Uloom Sabeelus Salam, Madinatul Ilm
(Behind Salala, Barkas)Hyderabad. 500005, A.P. INDIA.
Phone: 0091-40-24440450, 24446917, 56899169. Fax: 0091-40-24441835.

﴿بسم اللہ الرحمٰن الرحیم﴾ □ بہ خط استاد شفیق الزماں

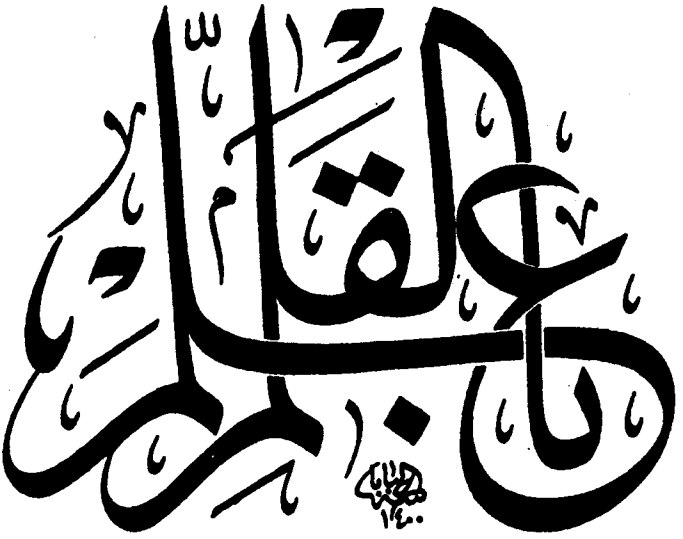
اقرأ باسم ربك الذي خلق
١٤٠٠

فہرستِ مضامین

قلم	شورش کاشمیری	۷
پیشِ لفظ	مولانا بدرالحسن القاسمی	۹
عرضِ مؤلف	مولانا محمد رضوان القاسمی	۱۶
نظامِ اخلاق میں الفاظ کے صحیح استعمال کی اہمیت		۱۸
اقبال اور رازِ حیات		۳۳
شاہین اور علامہ اقبال		۴۳
کبھی اے حقیقتِ منتظر، نظر آ لباسِ مجاز میں		۵۳
پیغامِ اقبال۔ حج اور قربانی کے پسِ منظر میں۔		۶۱
اردو ــــ مولانا ابوالکلام آزاد کی دکھلائی ہوئی راہ		۷۳
ولی دکنی اور اصلاحی پیغام		۹۰
حکیم الشعراء حضرت امجد حیدر آبادی اور ان کی اصلاحی رباعیات		۱۰۴
نظیر کی بے نظیر شاعری		۱۲۶
انسان، انسانیت اور شاعر		۱۴۶
بہادر شاہ ظفر اور ان کی شاعری ــــ انسان اور انسانیت کی تلاش		۱۵۸
اکبر الہ آبادی کے خطوط، خواجہ حسن نظامی کے نام		۱۷۱
جگر کی شاعری ــــ پیغامِ عزم و حوصلہ		۱۸۶
صفی اورنگ آبادی کی شاعری ــــ ایک مطالعہ		۱۹۸
خمار کی شاعری ــــ ایک مطالعہ		۲۳۰

چراغِ کلیم	۲۴۶
تہنیت النساء بیگم کی نعتیہ شاعری کا مجموعہ ۔ ایک مطالعہ	۲۶۹
جدوجہد آزادی میں قلم کا کردار	۲۸۴
تحریک آزادئ ہند کے جانبازوں سے ملاقات	۲۹۷
کال کرے سو آج کر، آج کرے سو اب	۳۱۷
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست	۳۲۶
"تندرستی ہزار نعمت ہے" ـــــ اصل شاعر کی تلاش	۳۳۸
برسات کی بہاریں	۳۵۱
غم ـــ شاعر اور شریعت	۳۵۹
ہے یہ شامِ زندگی، صبحِ دوامِ زندگی	۳۷۵

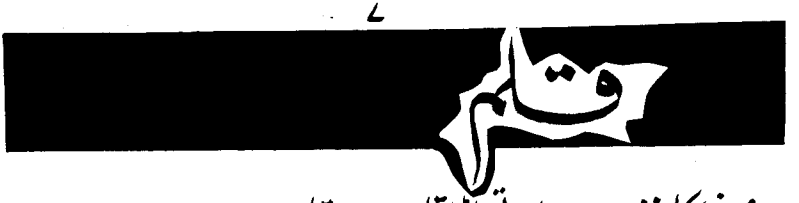

صفحۂ کاغذ پہ جب موتی لٹاتا ہے قلم
ندرتِ افکار کے جوہر دکھاتا ہے قلم
آنکھ کی جھپکی میں ہو جاتا ہے تیغِ بے پناہ
آنِ واحد میں حریفوں کو جھکاتا ہے قلم
آندھیوں کا سیل بن کر عرصۂ پیکار میں
زلزلوں کے روپ میں محلوں کو ڈھاتا ہے قلم
دوستوں کے حق کا پشتیباں خود اپنے زور پر
دشمنوں پر دشنہ و خنجر چلاتا ہے قلم
بندگانِ علم و فن کی خلوتوں کا آشنا
ان کے فکر و فہم کی باتیں سناتا ہے قلم
یادگاروں کا محافظ تذکروں کا پاسباں
گم شدہ تاریخ کے اوراق لاتا ہے قلم
محفلوں میں عشق اس کے بانکپن کا خوشہ چیں
محملوں میں حسن سے آنکھیں لڑاتا ہے قلم
شاعروں کے والہانہ زمزموں کی آبرو
دانش و حکمت کی راہوں کو سجاتا ہے قلم
اہلِ دل، اہلِ سخن، اہلِ نظر، اہلِ وفا
ان کے خدوخال کا نقشہ جماتا ہے قلم

برق بن کر ٹوٹتا ہے خرمنِ اغیار پر
دوستوں کے نام کا ڈنکا بجاتا ہے قلم

ہم نے اس کی معرفت دیکھا ہے عرش و فرش کو
آسمانوں کو زمینوں سے ملاتا ہے قلم

زندۂ جاوید ہو جاتے ہیں اس سے معرکے
حشر کے آثار قوموں میں اٹھاتا ہے قلم

کانپتے ہیں اس کی ہیبت سے سلاطینِ زمن
دبدبہ فرماں رواؤں پر بٹھاتا ہے قلم

حافظ و خیام و سعدی، غالب و اقبال و میر
ماضیِ مرحوم میں ان سے ملاتا ہے قلم

شہسواروں کے جلو میں ہفتمیں افلاک پر
سربکف اسلاف کے پرچم اڑاتا ہے قلم

کیسی کیسی منزلوں میں رہنما اس کے نقوش
کیسے کیسے معرکوں میں دندناتا ہے قلم

شاعری میں اس سے قائم ہے خمِ گیسو کی آب
نثر میں اعجاز کے تیور دکھاتا ہے قلم

قطع کرنی پڑتی ہیں فکر و نظر کی وادیاں
تب کہیں شورشؔ مرے قابو میں آتا ہے قلم

شورشؔ کاشمیری

پیشِ لفظ

"قلم" علم و آگہی کا وسیلہ ہے، اس کی شہادت خود قرآنِ کریم نے دی ہے، بلکہ ربِ کائنات نے "قلم" کی قسم کھا کر اس کی عظمت و اہمیت کو لازوال کر دیا ہے۔

"قلم" کا استعمال آسمان پر بھی ہوتا ہے اور زمین میں بھی، بلکہ زمین میں جو کچھ ہوتا ہے اس کی منصوبہ بندی بھی آسمان میں ہی ہوئی ہے۔

"لوح و قلم" مقامِ "صریف الاقلام" اور خود اپنی تقدیر کے نوشتہ کے لئے استعمال ہونے والے "کلکِ تقدیر" کا کون انکار کر سکتا ہے؟

افسوس ہے کہ دنیا کے ادیبوں، شاعروں اور قلمکاروں میں سے کم ہی لوگوں کو "قلم" کی حقیقت اور عظمت کا صحیح ادراک ہو سکا ہے، ورنہ بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے، جو "زبان و قلم" دونوں ہی کے صحیح استعمال سے محروم رہے، وہ "ادیب" کہلانے کے باوجود علم و ادب کی بیخ کنی کرتے رہے اور "قلم" رکھتے ہوئے بھی قلم کی حرمت کو انہوں نے پامال کیا، بلکہ "روشن خیالی" اور "ترقی پسندی" کے نام پر اباحیت کو فروغ دیا، معاشرے میں برائی پھیلائی، اخلاقی انارکی کو ہوا دی اور اپنے قلم کی "ریزش کا انبار" نسلِ انسانی کے ایمان و عقیدے کو خراب کرنے، اخلاقی قدروں کو تاراج کرنے، ہوا و ہوس کو فروغ دینے اور

سوسائٹی میں برائی اور اخلاقی گراوٹ کا ناسور پھیلانے کے لئے چھوڑ گئے، بعض نے تو کھل کر ؎

عقائد وہم ہیں، مذہب خیالِ خام ہے ساقی
ازل سے ذہنِ انساں بستۂ اوہام ہے ساقی

کا ملحدانہ نعرہ لگایا اور بعض نے خاموشی کے ساتھ "ترقی اور اباحیت پسند ادب و شاعری" کے عنوان سے پڑھے جانے والے لٹریچر کو مسموم کیا، ایسے لوگ "قلمکار" نہیں، عورتوں کی عزت و ناموس اور شراب و کباب کے سوداگر اور سوسائٹی کے حق میں "گنہگار" ہیں، نسلِ انسانی کے خلاف ان کا جرم نقب لگانے اور ڈاکہ زنی کرنے والوں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

لیکن ایسے ادیبوں، شاعروں اور قلمکاروں کی فہرست بھی کم طویل نہیں ہے، جنہوں نے قدرت کے عطا کردہ بیان و تعبیر کی صلاحیت کی قدر کی، شاعری کو ذہن سازی اور تعمیر و اصلاح کا ذریعہ بنایا اور "قلم" کے استعمال کا حق ادا کیا، جس سے تہذیب و تمدن کو فروغ ملا، انسانی اور اخلاقی قدریں عام ہوئیں، اور "متاعِ قلم" کو "متاعِ ذوقِ عصیاں" بننے نہیں دیا۔ ایسے ہی لوگ صحیح معنوں میں "قلمکار" ہیں اور ان سے ہی ادب کی عظمت اور قلم کا وقار و اعتبار قائم ہے، ادب کسی بھی زبان کا ہو انسانیت کے لئے زینت اور خود ادیب کے لئے عزت و شرافت کا تاج اور اس کی شخصیت کے لئے رونق و جمال کا باعث ہے۔ عبدالملک بن مروان کا قول ہے:

علیکم بالادب فان احتجتم	ادب حاصل کرو، کیونکہ ضرورت کے وقت وہ تمہارے
الیہ کان مالا وان استغنیتم عنہ کان جمالا	لئے مال اور بے نیازی کے وقت باعثِ جمال ہے۔

اور ادب بھی وہ ہے جو ابن السکیت کے بقول :

ما یعلق بالقلوب — جو دل میں جگہ بنا لینے کی صلاحیت رکھتا ہو
وتشتھیہ الاذان۔ — اور جسے سننے کے لئے کان بے تاب رہتے ہوں۔

دوسرے لفظوں میں "ادب" قلب و روح کی غذا، ذہن و دماغ کی بالیدگی کا سامان اور برتنے والے کے لئے جنت نگاہ اور فردوس گوش سبھی کچھ ہے، پھر قلمکار کو صرف لفظوں کے پیچ و خم میں نہیں الجھنا چاہیئے کہ

ادب النفس خیر من ادب الدرس۔ — نفس کا ادب درس کے ادب پر فوقیت رکھتا ہے۔

اور یہ کہ :

ادب السر طہارۃ القلوب وادب العلانیۃ حفظ الجوارح من الذنوب۔ — خفیہ ادب دلوں کی پاکیزگی اور ظاہری ادب گناہوں سے اعضاء و جوارح کی حفاظت کا نام ہے۔

چنانچہ زندہ ادب وہی ہے، جس میں تعمیر کا پہلو نمایاں ہو۔

"متاعِ قلم" جناب مولانا محمد رضوان القاسمی۔ جن کی شخصیت اب خود دوسروں کے لئے عنوانِ تعارف ہے۔ کے ادبی شہ پاروں یا متفرق ادبی مضامین کا مجموعہ ہے اور بامقصد اور تعمیری ادب کی ایک اچھی مثال ہے۔ اس مجموعہ میں آپ کو "الفاظ کا رشتہ" ادبی قدروں سے جوڑنے کی کوشش ملے گی، کہیں آپ میں علامہ اقبال "شاہینی نظر" اور "عقابی روح" بیدار کرتے نظر آئیں گے اور کہیں "رازِ حیات" واشگاف کرتے ہوئے، مولانا ابوالکلام آزاد آپ کو اردو کی ترقی کی راہ دکھلاتے اور اس کے ادب کا اسلوب و آہنگ سکھلاتے نظر آئیں گے۔

عام طور پر فارسی ادب میں "رباعیات عمر خیام" اور اردو ادب میں "اکبر الہ آبادی کی رباعیات" سے لوگ مانوس ہیں اور "اکبر کی رباعیات" کو ظریفانہ ادب کا بہترین نمونہ اور حکمت و دانائی کا بے مثال گنجینہ تصور کیا جاتا ہے، لیکن "متاعِ قلم" میں آپ کو دکن کے نامور شاعر امجد حیدرآبادی کی حکیمانہ اور اصلاحی رباعیات کا صرف تعارف ہی نہیں ان کی شاعری اور شخصیت کا بھی بھرپور تجزیہ ملے گا، جس سے آپ محسوس کریں گے کہ امجد حیدرآبادی کو "حکیمانہ رباعیات" کی حد تک دوسرے رباعیات گو شاعروں سے بجا طور پر یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ: ؎

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے ولے
میرا لہو بھی خوب ہے، تیری حنا کے بعد

"نظیر کی بے نظیر شاعری" اور بہادر شاہ ظفر کی چھنتی ہوئی بادشاہت کے دوران انسانیت کی تلاش کی مہم میں آپ کو صرف وعظ و نصیحت اور پند و موعظت ہی نہیں ملے گی، اچھی اور تعمیری شاعری اور ذہن و حافظہ میں محفوظ رکھنے کے قابل منتخب اشعار کے نمونے بھی دستیاب ہوں گے اور ذائقہ تبدیل کرنے اور دلچسپی پیدا کرنے کے لئے شعر گوئی میں پیکرِ ظرافت اکبر الہ آبادی کی طرف سے نثر نگاری میں شگفتگیوں کے شہنشاہ خواجہ حسن نظامی کے نام خطوط بھی "متاعِ قلم" میں آپ کو ملیں گے، بلکہ اور آگے بڑھیں تو آپ کو جگر مرادآبادی، صفی اورنگ آبادی اور خمار بارہ بنکوی جیسے رندوں کے نام بھی نظر آئیں گے، لیکن ناؤ نوش پر آمادہ کرتے ہوئے نہیں، بلکہ عزم و حوصلہ صدق و صفا اور غیرت و حمیت کی روح پھونکتے ہوئے اور تعمیر و اصلاح کا اپدیش دیتے ہوئے۔

"متاعِ قلم" میں نہ صرف یہ کہ آپ کی صحت و تندرستی کو فراموش نہیں کیا گیا ہے، بلکہ "تندرستی ہزار نعمت ہے" کہہ کر روپوش ہو جانے والے شاعر کو بھی پاتال سے نکال لایا گیا ہے

وقت اور زندگی۔ اور زندگی وقت کے علاوہ ہے بھی کیا؟ ــــ کی قدر کرنے کے لئے آپ کو "کال کرے سو آج کر آج کرے سو اب" کی نصیحت آپ کو ضرور کی گئی ہے، لیکن نہ تو برسات کی بہاروں سے لطف اندوز ہونے سے منع کیا گیا ہے اور نہ صنفِ نازک کی نعتیہ شاعری سے فیض اٹھانے سے روکا گیا ہے، بلکہ ہر وادی میں بھٹکنے والے شاعروں کو غم کی دنیا سے نکل کر جادۂ شریعت پر چلنے کی راہ بھی سجھائی گئی ہے۔

ادیبوں، شاعروں اور قلمکاروں کو آزادی کی جدوجہد میں حصّہ لیتے ہوئے بھی دکھلایا گیا ہے اور جب کہ عام طور پر لوگ چراغ لے کر "رخِ زیبا" کو تلاش کیا کرتے ہیں، کلیم عاجز صاحب جیسے "شاعرِ غم" کے یہاں خود "چراغ" تلاش کرنا "متاعِ قلم" کے مصنف کا کمال ہی نہیں کرامت ہے، اس کے بارے میں میرا کچھ عرض کرنا سورج کو "چراغ" دکھلانے کے مرادف ہوگا، البتہ اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مولانا محمد رضوان القاسمی نہ صرف اپنی اس مہم میں کامیاب رہے ہیں، بلکہ کلیم عاجز صاحب کے تمام "دیوانوں" کو کھنگال کر انہوں نے "چراغاں" کا ماحول پیدا کر دیا ہے اور کلیم عاجز صاحب کو "چراغِ سحری" بننے کے بجائے سدا روشنی دینے والا "چراغ" ثابت کر کے دکھلایا ہے اور اس طرح پڑھنے والوں کے لئے رنج و الم سے نجات پانے کا "شاعرانہ" بلکہ "ساحرانہ" نسخہ بھی پیش کر دیا ہے۔

بہرکیف اس معیار کی کتابوں پر مقدمہ لکھنا شاعروں، ادیبوں اور ادیبانہ ذوق رکھنے والے قلمکاروں کا کام ہے، میں اپنی دخل اندازی ختم کرتے ہوئے یہی کہوں گا کہ "متاعِ قلم" کو سنبھال کر رکھئے، پڑھکر نصیحت حاصل کیجئے اور لطف بھی لیجئے، کبھی اس سے غمِ زندگی دور کرنے کا کام لیجئے اور کبھی قلب و روح کی صفائی و بالیدگی کا اور ناشر کو دعا دیجئے کہ اس نے یہ ادبی و اصلاحی تحفہ آپ کو پیش کیا اور مصنف کے لئے اس کی دعا کیجئے کہ باقی ماندہ "متاعِ قلم" بھی وہ ناشر کے حوالے کردیں، تاکہ "دین و ادب" کا رشتہ اور بھی لوگوں پر واشگاف ہو جائے اور مصنف کی محنت اخباروں اور میگزینوں کی زینت بنی رہنے کے بجائے کتابی شکل میں آکر بقائے دوام حاصل کرسکے۔

عربوں کا کہنا ہے کہ: عقول الرجال فی اطراف اقلامھا۔ یعنی نوکِ قلم ہی لوگوں کی عقلوں کا پتہ دیتی ہے۔

اور یہ کہ:

فی القلم حکمتان: بلاغۃ المنطق وجلالۃ الصمت۔

یعنی قلم کی دو حکیمانہ شانیں ہیں، ایک طرف تعبیر کی بلاغت، دوسری طرف خاموشی کا وقار۔ چنانچہ بظاہر خاموش رہکر ہی قلم بلاغت کے موتی بکھیرتا اور فصاحت کے جادو جگاتا ہے۔

تعمیری ادب میں قلم کی یہ شان اور نکھر جاتی ہے اور قلم کے "نقوش" میں اگر خونِ جگر بھی شامل ہو جائے، تو وہ دو آتشہ بن جاتے ہیں، ذوقِ ادب رکھنے والے علمائے دین اور مصلحینِ امت کی تحریروں میں تاثیر کا راز اسی میں مضمر ہے۔

مولانا محمد رضوان القاسمی کا اصل فریضہ تو واعظ و ناصح اور دینی حقائق کے شارح کا ہے، لیکن اللہ نے شعر و ادب کا پاکیزہ ذوق اور تحریر میں شگفتگی عطا کی ہے، اس لئے "متاعِ قلم" قدرتی طور پر ایک اچھا ادبی سرمایہ، یا ادبی شہ پاروں کا مجموعہ بن گیا ہے۔ امید ہے کہ اربابِ ذوق اس کی قدر کریں گے اور اہلِ ادب اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور مصنف کی یہ متاعِ بے بہا بارگاہِ خداوندی میں بھی قبولیت حاصل کرے گی۔

وما ذٰلك على الله بعزيز

۱۸/۴/۲۵ھ
۷/۶/۲۰۰۴ء، دوشنبہ

بدر الحسن القاسمی
(مقیم کویت)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ مؤلف

ایک عرصہ سے میری قلمی وابستگی روزنامہ سیاست حیدرآباد سے ہے، اردو دنیا میں اس اخبار کا جو مقام و رتبہ ہے، اس سے اخبار بیں طبقہ بخوبی واقف ہے، پہلے ہر یکشنبہ کو "سنڈے ایڈیشن" نکلتا تھا اور دوشنبہ کو "ادبی و ثقافتی ایڈیشن"۔ ادھر نئی تبدیلیاں جو آئیں، ان میں پانچ ایڈیشن کا اضافہ اور کیا گیا، لیکن یکشنبہ اور دوشنبہ کا ایڈیشن اپنی تمام تر خوبیوں اور روایات کے ساتھ برقرار رہا۔ راقم الحروف یکشنبہ ایڈیشن میں "آپ کے سوال" کے عنوان سے دینی، مذہبی، سماجی، تاریخی، ادبی اور شعری نوعیت کے سوالات کے جواب چار پانچ سال سے دیتا چلا آرہا ہے، اس کے ساتھ دوشنبہ ایڈیشن میں علمی، تحقیقی اور اصلاحی مضامین کا سلسلہ ۲۶، ۲۷ سال سے جاری ہے اس کے دوشنبہ ایڈیشن پر ادبی پہلو کا غلبہ ہے، اس لئے اس ایڈیشن میں میرے ادبی مضامین بھی شائع ہوتے رہے، بعض عزیزوں اور مخلصوں (مولانا عبدالباسط ندوی، مولانا خورشید انور ندوی، مدنی، مولانا شکیل احمد قاسمی، مولانا تنظیم عالم قاسمی، مولانا محمد عثمان قاسمی، مولانا محمد ایوب ندوی۔ اساتذہ دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد) نے ان مضامین کو یک جا کیا اور انہوں نے ہی ترتیب اور تصحیح کے کام کو انجام دیا، یہی مضامین "متاعِ قلم" کے نام سے آپ کی خدمت میں پیش ہیں، مضامین کی مجموعی تعداد پچیس ہے اور اسی نوعیت کے دوسرے مجموعوں کی الحمدللہ گنجائش موجود ہے، تاہم میرے لئے خوشی کی بات

ہے کہ دعوتی، تعمیری اور اصلاحی نقطۂ نظر سے جو مضامین مختلف حالات میں لکھے گئے تھے ان کا ایک مجموعہ "اسرارِ حیات" کے عنوان سے ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس مجموعہ کو قارئین نے قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور بعض اکابر اور اہلِ علم نے اس کی اشاعت پر حوصلہ افزائی کے خطوط لکھے۔

مضامین کا یہ مجموعہ جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے، اس کے تمام تر مضامین وقتی حالات و تأثرات کی بنیاد پر قلم بند کئے گئے ہیں، تاہم قارئین ان مضامین کو پڑھتے ہوئے یہ محسوس کریں گے کہ یہ زمانہ کی قید سے ماوراء ہیں اور ان میں نفع کا کچھ پہلو نظر آئے تو امتدادِ زمانہ راہ میں حائل نہیں آسکتا۔

میں برادرِ عزیز مولانا بدرالحسن القاسمی (مقیم کویت) کا شکرگزار ہوں کہ ادیبانہ شان کے ساتھ دل آویز "پیش لفظ" تحریر فرمایا، اس کتاب کے تعارف میں ان کے قلم نے محبت کے جو جلوے دکھائے ہیں، عنوانات کی مناسبت سے جس طرح نیرنگیاں پیدا کی ہیں اور بین السطور کے ذریعہ "ادبِ کثیف" اور "ادبِ لطیف" کے فرق کو جس انداز میں نمایاں کیا ہے، وہ ان کے قلم کا کمال ہے، بقول شورش کاشمیری ؎

صفحۂ کاغذ پہ جب موتی لٹاتا ہے قلم ❊ ندرتِ افکار کے جوہر دکھاتا ہے قلم

امید کہ یہ کتاب اپنے مقصد میں کامیاب ہوگی اور دین و ادب کے درمیان جس مضبوط رشتہ کی تلاش کی گئی ہے، مؤلف کا قلم اس سمت رواں دواں رہے گا۔

۲۲ ربیع الآخر ۱۴۲۵ھ
۱۱ جون ۲۰۰۴ء / جمعہ۔

محمد رضوان القاسمی
ناظم دارالعلوم سبیل السلام، حیدرآباد۔

نظامِ اخلاق میں
الفاظ کے صحیح استعمال کی اہمیت

تاریخ مذاہب پر جن لوگوں کی نظر ہے، وہ جانتے ہیں کہ مذاہب کی تاریخ میں پانچویں صدی قبل مسیح خاص اہمیت کی حامل ہے، یہی وہ زمانہ ہے جس میں ہندوستان میں جین مت اور بدھ مت کے افکار، فلسطین میں یوسیاہ کی تعلیمات، ایران میں زردشت کے عقائد اور چین میں لاؤزو اور حکیم کنفیوشس (Confucius.....) کے نظریات کارفرما رہے ہیں۔ اس وقت آخرالذکر (کنفیوشس) کا تذکرہ مقصود ہے۔ یہ اپنے دور (۵۵۱ — ۴۷۹ ق م) میں ایک عظیم فلسفی اور دانشور کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا تھا۔ ریاست شان تونگ کے ایک کسان گھرانے میں پیدا ہوا۔ بچپن ہی سے بڑا ذہین تھا۔ بیس سال کی عمر تک چینی رسم و رواج، رہن سہن کے طریقوں اور اصولوں کا مطالعہ کیا۔ چوبیس سال کی عمر میں ریاست سونگ کا وزیر قانون اور پھر وزیر اعلیٰ مقرر ہوا۔ اس نے اپنے اخلاقی درسوں سے رعایا کے کردار و عمل میں بہتری پیدا کی۔ بعد میں ریاست کا راجا اور اس کے لڑکے کنفیوشس کی صاف گوئی اور انصاف پسندی سے

خائف ہو گئے اور اسے ریاست سے باہر نکال دیا گیا۔ بیس سال تک کنفیوشس نے چین کی مختلف ریاستوں کی سیاحت کی اور لوگوں کو اپنے اخلاقی نظریات کا درس دیا۔ اس نے اپنی زندگی میں ایسے اصولوں پر زور دیا جو میانہ روی کے علمبردار ہیں۔ وہ بذاتِ خود بھی ان پر عمل پیرا رہا۔ چونکہ وہ ایک سرکاری عہدیدار کا لڑکا تھا اور خود بھی برسوں سرکاری ملازمت سے وابستہ رہ چکا تھا، اس لئے اس کی تعلیم کا زیادہ تر تعلق عملی زندگی سے ہے، جس میں سچائی، پاکیزگی اور دیانت داری کو زیادہ دخل ہے۔ کنفیوشس کا نقطۂ نظر تھا کہ انسان کائنات کا مرکز ہے اور اس کی ذات میں اعلیٰ کردار کے جوہر پوشیدہ ہیں۔ اگر وہ دھیان دے تو اپنے ان جوہروں کو دریافت کر سکتا ہے۔ وہ اپنے شاگردوں کو شاعری، ادب، تاریخ اور روایات کا درس بھی دیتا تھا اور انہیں یہ بھی بتاتا تھا کہ نظامِ اخلاق میں الفاظ کے صحیح استعمال کی کتنی اہمیت اور اس کا کتنا اونچا مقام اور مرتبہ ہے۔

سب سے پہلا کام

اس سلسلہ میں اس کا ایک واقعہ بڑا دلچسپ ہے۔ ایک دفعہ اس کے ایک شاگرد زالو نے اس سے کہا کہ فرض کیجئے، ایک ریاست کا والی آپ کو دعوت دیتا ہے کہ آپ اس کے نظامِ حکومت کو چلانے میں اس کی مدد کریں۔ آپ اس وقت سب سے پہلے کیا قدم اٹھائیں گے؟ کنفیوشس نے جواب دیا، سب سے پہلا کام یہ ہوگا کہ

الفاظ کا صحیح استعمال شروع کیا جائے، زالو نے مذاق سمجھا اور پھر سوال کیا۔ اس پر کنفیوشس کو غصہ آگیا اور اس نے ترش لہجہ سے کہا تم کتنے بد اخلاق ہو، اگر الفاظ صحیح نہ ہوں تو زبان واقعات کے تابع نہیں ہوسکتی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زندگی کے تمام معاملات درہم برہم ہو جائیں گے۔ اخلاق ناپید ہوگا، نفاق بڑھ جائے گا، انصاف دنیا سے مٹ جائے گا، معصوم لوگ سزا پائیں گے اور گناہگار اور مجرم آزادی سے لوگوں کو اپنے ظلم کا تختۂ مشق بنائیں گے، اسلئے ایک مصلح کا سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہیئے کہ وہ صحیح الفاظ کا استعمال کرے۔ (مبادیات تحقیق از عبدالرزاق قریشی صفحہ ۵۹ ـ ۵۸)

ایک فاضل کا فریضہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ حکیم کنفیوشس کی مذکورہ بات میں بڑی حکمت ہے۔ ایک عالم، فاضل، محقق، دانشور، باخبر اور باادب آدمی کے لئے ضروری ہے کہ وہ الفاظ کا صحیح استعمال کرے، معنی و مفہوم اور مراد و مطلب کو الفاظ کا جو جامہ پہنائے وہ موزوں اور چست ہو، الفاظ سے اندر کی حقیقت چھلک رہی ہو، اور زبان واقعات کی تابع ہو، اس سے اخلاقی نظام کی درستی اور بہتری میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ آج کی دنیا میں جو فتنہ و فساد، عداوت و نفاق اور ظاہر و باطن میں دوعملی اور تضاد کا سکہ ہر طرف چلتا نظر آتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ نیت کا کھوٹ اور الفاظ کی ملمع سازی ہے، بقول شاعر ؎

یوں تو الفاظ ہیں اظہارِ مطالب کیلئے
لوگ الفاظ میں نیت کو چھپا دیتے ہیں

اصحابِ دل اور قلندروں کے اس طریق سے بہت کم لوگ آشنا ہیں، جس کے بارے میں علامہ اقبالؒ کا فرمان ہے ؎

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

الفاظ کا استعمال، موزونیت اور دل و زبان کی رفاقت کی ضرورت

موقع خوف و ہراس کا ہو یا شوق و رغبت کا، دونوں میں ایک شریف انسان کو چاہیئے کہ الفاظ کے استعمال میں اس کی موزونیت اور دل و زبان کی رفاقت کا خاص خیال رکھے اور الفاظ کے پردے میں اپنی نیت کے فساد اور کھوٹ کو وہ چھپا نہ دے، اس سلسلہ میں ایک اہم ہدایت قرآن حکیم کی سورہ بقرہ آیت (۱۰۴) میں ملتی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مجمع میں قرآنِ مجید سناتے یا تبلیغ کرتے ہوتے اور لوگ کوئی بات سن نہ پاتے تو قدرۃً دوبارہ آپؐ کو اپنی جانب متوجہ کرنا چاہتے یہود نے ایسے موقع کے لئے از راہِ شرارت لفظ "راعنا" استعمال کرنا شروع کیا تھا، اس کے اصل معنی عربی کے لحاظ سے تو صرف اس قدر ہیں کہ "ہماری مصلحت کی رعایت فرمائیے اور دوبارہ ارشاد فرمائیے"، لیکن راعنا کے "ع" کو ذرا کھینچ کر پڑھا جائے تو اس سے عبرانی زبان میں جو مفہوم پیدا ہوتا ہے وہ بد دعائیہ اور گستاخانہ ہے یہود ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ مسلمان ان کی اس شرارت سے غافل، بے خبر اور خالی الذہن تھے۔ وہ خود بھی بعض اوقات یہ لفظ بولنے لگتے، اس سے ان شریروں کو اور گنجائش ملی، آپس میں بیٹھ کر ہنستے تھے

کہ اَب تک تو ہم ان کو خفیہ ہی بُرا کہتے تھے، اَب علانیہ کہنے کی تدبیر ایسی ہاتھ آگئی کہ مسلمان بھی اس میں شریک ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس گنجائش کو ختم کرنے کیلئے مسلمانوں کو حکم دیا کہ "اے ایمان والو! تم لفظ "راعنا" مت کہا کرو اور اس کی جگہ "اُنظرنا" (ہمارے اوپر نظر کیجئے) کہہ دیا کرو" کیوں کہ اس لفظ کے معنی اور "راعنا" کے معنی عربی زبان میں ایک ہی ہیں۔ راعنا کہنے میں یہودیوں کی شرارت چلتی ہے، اس لئے اس کو ترک کر کے دوسرا لفظ استعمال کرو" اس حکم کا خصوصی پہلو تو یہ ہے کہ مرتبۂ رسالت کا ادب صرف معنوی ہی حیثیت سے نہیں، لفظی حیثیت سے بھی ضروری ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ جن الفاظ سے آپؐ کی شان میں احتمال بھی اہانت کا نکلتا ہے وہ ممنوع ہیں اور ان سے احتیاط لازم ہے، بلکہ امام مالکؒ کے یہاں تو ایسے الفاظ پر حد واجب ہوتی ہے۔ جہاں تک حکم کا عمومی پہلو ہے تو اس سے ثابت ہے کہ سماجی زندگی میں ایک انسان کو الفاظ کے استعمال میں اخلاقی اقدار کا پابند ہونا چاہیئے۔ ایسے الفاظ جو فتنہ انگیز، اہانت آمیز، کردار شکن، غیر حقیقت پسندانہ اور مشتبہ ہوں، انکے استعمال سے احتراز کیا جائے، بصورتِ دیگر ادب و شرافت کی دنیا میں اسے قابلِ مؤاخذہ عمل قرار دیا جاسکتا ہے۔

سیرتِ طیبہ سے دو نمونے

قرآنِ حکیم کی مذکورہ آیت کے علاوہ احادیث میں بکثرت مثالیں ملتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر کسی کو کوئی ایسا

لفظ استعمال کرتے سنا جو غیر موزوں، غیر حقیقت پسندانہ اور حال اور واقعہ کے مطابق نہیں ہے تو آپؐ نے اسے ٹوکا اور تصحیح فرمائی نمونہ کے طور پر دو واقعات پیش ہیں:

حدیث کی مشہور کتاب ابو داؤد (کتاب الادب باب فی الاستیذان) میں ہے کہ آپؐ گھر میں تشریف فرما تھے، قبیلہ بنو عامر کے ایک آدمی آپؐ سے ملنے کے لئے آئے۔ آتے ہی بغیر سلام کے انہوں نے کہا "أَأَلِجُ" کیا میں داخل ہو سکتا ہوں؟ آپؐ نے آواز سن کر اپنے خادم کو بلایا اور فرمایا کہ یہ شخص اندر آنے اور اجازت طلب کرنے کے آداب سے ناآشنا ہے۔ اس سے جا کر کہو کہ وہ پہلے سلام کرے پھر کہے "أَأَدْخُلُ"، کیا میں داخل ہو سکتا ہوں (یا اندر آسکتا ہوں) آنے والے صاحب نے آپؐ کی ہدایت باہر سن لی اور فوراً انہوں نے سلام کیا اور "أَأَدْخُلُ" کے لفظ سے اجازت طلب کی۔ آپؐ نے اجازت مرحمت فرمادی اور وہ اندر آگئے۔ اس میں قابل توجہ جو پہلو ہے وہ یہ ہے کہ "أَأَلِجُ" کے لفظ کو بدل کر "أَأَدْخُلُ" کا لفظ استعمال کرنے کے لئے فرمایا جو مناسب حال تھا۔ حالانکہ دونوں لفظ کے معنی داخل ہونے کے ہیں مگر اول الذکر (أَأَلِجُ) کا استعمال تنگ جگہ میں داخل ہونے کے لئے ہوتا ہے، نیز جس کیلئے یہ لفظ استعمال کیا جا رہا ہو، اس میں اس کے لئے اعزاز و اکرام کا پہلو نہیں نکلتا ہے۔ جب کہ ثانی الذکر (أَأَدْخُلُ) کا استعمال گھر اور کشادہ جگہ میں داخل ہونے کے لئے ہوتا ہے اور اس میں لفظی اعتبار سے وقار اور اعزاز و اکرام کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ گویا آپؐ کی

نظر جہاں لوگوں کے اخلاق و کردار کو بنانے اور سنوارنے پر تھی۔ اس کے ساتھ الفاظ کے غلط اور صحیح استعمال پر بھی تھی کہ کون کس وقت، کیا لفظ استعمال کر رہا ہے اور پھر ایک "مصلح" اور "مصحح" کی حیثیت سے بروقت اصلاح اور تصحیح فرما دیا کرتے تھے، یہی حال آپؐ کا ناموں کے بارے میں بھی تھا کہ اگر کسی کا نام معنی کے اعتبار سے ناموزوں اور نامناسب ہوتا تو آپؐ اسے فوراً بدل دیتے تھے۔ اس سلسلہ میں متعدد واقعات، حدیث اور سیرت کی کتابوں میں ملتے ہیں، جس کے ذکر کا یہ موقع نہیں ہے۔

دوسرا واقعہ "عشار" کو "عتمہ" کہنے کی ممانعت سے متعلق ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قدیم زمانہ سے عرب کا دستور تھا کہ دیہاتی رات میں شفق ڈوبنے کے بعد اپنی اونٹنیوں کا دودھ دوہنا شروع کرتے تھے اور پھر کافی دیر تک اس میں مصروف رہا کرتے تھے حتیٰ کہ رات بالکل تاریک ہو جاتی تھی۔ اسی اعتبار سے انہوں نے اس خاص وقت کا نام "عتمہ" (تاریکی) رکھ لیا تھا۔ جب اسلام کی روشنی نے سرزمینِ عرب کو منور کیا اور اس کے ساتھ پانچوں وقت کی نمازیں (مخصوص ناموں کے ساتھ) شروع ہوئیں تو دیہاتوں اور بیابانوں میں رہنے والے مسلمان (اعراب یعنی دیہاتی) نہ صرف یہ کہ شفق چھپنے کے بعد کے وقت کے اپنے قدیم نام "عتمہ" کے اعتبار سے عشار کی نماز کو "عتمہ کی نماز" کہنے لگے بلکہ اونٹنیوں کو دوہنے میں مصروف رہنے کی وجہ سے اس نماز میں بہت تاخیر بھی کر دیا کرتے تھے، پہلے اونٹنیوں کا دودھ نکالتے

اور جتنا بھی وقت اس میں لگتا، لگاتے اور پھر نماز پڑھنے کے لئے آتے۔ خرابی اس میں یہ تھی کہ عشار کی نماز کو "عتمہ کی نماز" کہنے سے زمانۂ جاہلیت کے لوگوں کے ساتھ مشابہت لازم آتی تھی، لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "عشار کی نماز" کے لئے اس نام کو ناپسند فرمایا اور اس سے منع فرمایا اور اپنے اس امتناعی حکم سے بعد میں آنے والے مسلمانوں کو بتا دیا کہ ان کو اپنی زبان اور اپنی بول چال کو شرعی مصطلحات کے مطابق درست کرنا چاہیئے اور جو مصطلحات و محاورات خالص دوسرے لوگوں کی زبانوں پر جاری ہوں اور صرف ان کی بول چال میں استعمال کی جاتی ہوں ان سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ ہر لفظ اپنا خاص مزاج اور پس منظر رکھتا ہے، اس کے استعمال میں دانا کو دانائی سے کام لینا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں خلط ملط کرنا یا بے احتیاطی اور بے اعتنائی سے کام لینا، گویا الفاظ کی روح کو متأثر کرنا اور ان کی "حیثیتِ عرفی" کو مجروح کرنا ہے۔

الفاظ کے استعمال میں آدمی کی حیثیت اور مرتبہ کا لحاظ

اسی طرح اگر کسی عبارت کا تعلق آپس میں دو آدمیوں سے ہو تو اس سلسلہ میں جو الفاظ منتخب کئے جائیں اس میں دونوں کی حیثیت اور مرتبہ کا لحاظ اور خیال رکھنا چاہیئے۔ بسا اوقات الفاظ کی ترکیب سے جو جملے بنتے ہیں وہ صحیح اور درست ہوتے ہیں مگر بات چیت کے وقت متکلم کا جو انداز اور تیور ہوتا ہے وہ مناسب

حال نہیں ہوتا، دونوں صورتوں کی ایک ایک مثال لیجئے۔

ہندوستانی علماء میں محدّث جلیل علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا بڑا اونچا مقام ہے، علامہ اقبالؔ بھی ان کے علم و فضل کے معترف و مداح تھے۔ "اقبال کے ممدوح علماء" نامی کتاب میں اس کا ذکر بھی ہے، علامہ کشمیریؒ ایک دفعہ حیدرآباد کے مشہور ایڈوکیٹ جناب فیض الدین مرحوم کی دعوت پر حیدرآباد تشریف لائے، مقصود یہ تھا کہ علامہ سے وہ بخاری شریف کی تعلیم کا آغاز کریں۔ اب تک وہ معروف عالم مولانا ادریس کاندھلویؒ سے عزلی کی قابلِ لحاظ کتابیں پڑھ چکے تھے، علامہ کشمیریؒ کی حیدرآباد تشریف آوری میں مولانا کاندھلوی کی بھی خواہش کا دخل تھا۔ جب وہ تشریف لائے تو یہاں کے قیام میں بقول مصنف "نقشِ دوام" (مولانا انظر شاہ کشمیری) "علامہ کی خسروئے دکن سے ملاقات ہوئی۔ اس زمانہ میں دیوبند سے "مہاجر" کے نام سے ایک اخبار نکلتا تھا اس اخبار میں نظامِ حیدرآباد اور علامہ کی ملاقات کی خبر اس جلی سُرخی کے ساتھ شائع کی جارہی تھی کہ "بارگاہِ خسروی میں علامہ جلیل مولانا انور شاہ کشمیری کی باریابی"۔ اخبار چھپا نہیں تھا کہ کسی طرح آپ کو اس عنوان کی اطلاع ہوگئی۔ اخبار کے منتظمین کو بلا کر ارشاد فرمایا کہ "ہر چند کہ میں ایک فقیر بے نوا ہوں مگر اتنا گیا گذرا ہوا بھی نہیں کہ اس طرح کے عنوانات پسند کروں۔ آپ صرف اتنا لکھئے "نظام حیدرآباد سے انور شاہ کی ملاقات"۔ (نقشِ دوام صفحہ ۸۹، ۸۸) گویا سلطانِ دکن کی دین دوستی اور علم پروری اپنی جگہ بجا مگر علامہ کی جو دینی و علمی شہرت اور محدثانہ عظمت تھی، اس کے پیشِ نظر "بارگاہِ خسروی" اور "باریابی"

کے الفاظ کو پسند نہیں فرمایا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ خود دار اور غیرت مند علماء نے اپنی جبینِ علمی کو ہمیشہ بلند رکھا ہے اور کبھی بھی ایسے الفاظ کو پسند نہیں فرمایا جو علم، دین اور وقار و اعتبار کے لئے ننگ و عار کا باعث ہوں۔

صحیح الفاظ کے ساتھ صحیح انداز کی اہمیّت

صحیح الفاظ کے ساتھ صحیح انداز کی جو اہمیت ہے، اسکا اندازہ مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کے بیان کردہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ "حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ جب حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کے پاس پہونچے تو ایک روز حضرت گنج شکرؒ نے ان سے کہا کہ "آؤ! آج تم کو "عوارف المعارف" پڑھائیں۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ اس کتاب کو پہلے پڑھ چکے تھے اور اس پر پوری طرح حاوی تھے، اسلئے ان کو خیال ہوا کہ درس سے ان کے علم میں کوئی اضافہ نہ ہوگا مگر مرشد کا حکم تھا، اس لئے کتاب لے کر پہونچے۔ درس میں کسی مسئلہ پر حضرت نظام الدینؒ نے بحث کرنے کی کوشش کی۔ حضرت فرید الدینؒ کتاب بند کر کے اٹھ کھڑے ہوئے اور کئی روز تک حضرت نظام الدینؒ سے مخاطب نہیں ہوئے۔ مرشد کی یہ آزردگی دیکھ کر حضرت نظام الدین نے ان سے پوچھا، کیا میں نے درس میں کوئی غلط بات کہی تھی؟ حضرت گنج شکرؒ نے فرمایا نہیں، جو بات کہی تھی وہ تو صحیح تھی لیکن جس مقام اور انداز سے کہہ رہے تھے وہ صحیح نہ تھا۔" (بزمِ رفتگان، حصہ اول از سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم، صفحہ ۳۱۸)

ایک صاحبِ قلم کا اہم تبصرہ

الفاظ کی مختلف نوعیتوں کو سامنے رکھتے ہوئے جناب سید غلام ربانی نے ایک زمانہ میں متعدد مضامین لکھے تھے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ کتابی شکل میں "الفاظ کا مزاج" (صفحات ۱۳۶) کے نام سے دستیاب ہے۔ اسے مکتبہ جامعہ نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ نہایت قابل قدر اور لائقِ مطالعہ کتاب ہے، موضوع کی مناسبت سے اس کتاب کے دو اقتباسات پیش ہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

"زبان اپنے وسیع معنی میں خیالات ظاہر کرنے کا ذریعہ ہے، جانوروں کی چیخیں بھی ایک حد تک زبان کہی جاسکتی ہیں بشرطیکہ ان کے دل کی حالت ظاہر کریں، الفاظ بامعنی آوازیں ہیں۔ چرند اور پرند بھی ایسی آوازیں نکالتے ہیں جن کے معنی ہوتے ہیں، وہ خوف ظاہر کرتے ہیں، خوشی اور خواہش بھی ظاہر کرسکتے ہیں مگر اپنے خیالات ظاہر نہیں کرسکتے۔ جانداروں میں ایک انسان ہی ہے جو کچھ وہ محسوس کرتا اور سوچتا ہے اس کو بیان بھی کرسکتا ہے، زبان وہ چیز ہے جس پر تمام انسانی تعلقات قائم ہیں۔ یہ الفاظ سے بنتی ہے اور الفاظ سانچے ہیں جن میں خیالات ڈھلتے ہیں، چنانچہ ہر لفظ جو کسی چیز کے لئے بنتا ہے اس میں کوئی نہ کوئی خیال لپٹا ہوتا ہے۔" (صفحہ ۷)

اسی کتاب میں دوسری جگہ ہے :

"کہتے ہیں کہ نام میں کیا دھرا ہے مگر یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ نام کو شاندار بنانے کے لئے طرح طرح کی کوشش کی جاتی ہے۔ لوگ اپنے نام کے ساتھ میر، سیّد، مرزا خان وغیرہ کا اضافہ کرتے ہیں۔ بعض وقت نسبتی الفاظ بڑھا دیئے جاتے ہیں۔ اب سے پچاس ساٹھ سال پہلے ملک میں جب تعلیم کی کمی تھی تو گریجویٹ حضرات نے بی۔ اے اور ایم۔ اے الفاظ کو اپنے نام کا جزو بنا لیا تھا اور اگر وہ ولایت کی سند رکھتے تھے تو ڈگری کے ساتھ آکسن یا کینٹب لکھ دیتے تھے۔ اسی طرح ایک عرصہ پہلے کچھ انشاء پرداز اور شاعر اپنے نام کے ساتھ دہلوی یا لکھنوی لکھ کر رعب جمانے کی کوشش کرتے تھے۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ اسم کو اپنے موسوم سے کچھ تعلق ہوتا ہے۔ بڑے بڑے شاعروں نے جب کبھی موقع ملا، اس انسانی جذبہ سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ڈاکٹر اقبالؔ کا ایک شعر جو مرحوم نے جنگ کے متعلق کسی جلسے کے لئے لکھا تھا ؎

اقبالؔ میرے نام کی تاثیر دیکھنا
میں جس کے ساتھ ہوں اسے ہوتی نہیں شکست

غالبؔ نے بھی کہا ہے :

؎ چھیڑتا ہوں کہ ان کو غصّہ آئے
کیوں رکھوں ورنہ غالبؔ اپنا نام"

(صفحہ ۱۶-۱۵)

قرآنی الفاظ

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ علم اور اصحابِ ادب، تذکیر و موعظت کے طور پر "قرآنی الفاظ" کی حقیقت کو بھی نگاہ میں لے آئیں۔ اس سلسلہ میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے درج ذیل تجزیہ کا مطالعہ بہت کافی ہوگا۔ وہ ارشاد فرماتے ہیں:

"جسے قرآن کا صحیح ذوق نصیب ہوگا اور عربی اسلوب پر اسے بصیرت ہوگی وہ دیکھے گا کہ قرآن اس انداز پر رواں دواں نہیں جو عامیانہ ہے۔ بلکہ قرآنِ کریم الفاظ کے انتخاب میں خود اپنا ایک معیار رکھتا ہے اور اس کا معیار نہایت صاف ستھرا، شگفتہ اور اس قدر جامع ہے کہ آپ قرآن کے کسی ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ لانے سے عاجز ہیں جو قرآن کے منتخب لفظ کی واقعی قائم مقامی کر سکتا ہو اور یہ اس لئے کہ مخلوق اشیاء کی حقائق پر صحیح اطلاع نہیں رکھتی اور وہ یہ بھی فیصلہ نہیں کر سکتی کہ یہاں کونسا لفظ حقیقت کی صحیح ترجمانی اور مقام کے واقعی مناسب و زیبا ہے۔"

(نقشِ دوام، صفحہ ۳۵۸)

الفاظ اور نظامِ اخلاق

الفاظ کی مختلف جہتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اوپر جو کچھ عرض کیا گیا اس کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ الفاظ کو حالات

اور واقعات کے تابع ہونے چاہئیں اور جو لفظ جس کے لئے تاریخی اور روایتی طور پر استعمال ہوتا چلا آرہا ہے اس کی خلاف ورزی گویا نظامِ اخلاق میں خلل پیدا کرنا ہے۔ اللہ، رسول، نبی، فرشتہ، جنت، دوزخ جلّ جلالہ، علیہ السلام، صلی اللہ علیہ وسلم، رضی اللہ عنہ، رحمۃ اللہ علیہ، مولوی مولانا، علامہ، ایڈوکیٹ، انجینئر، ڈاکٹر، سائنٹسٹ، ادیب، شاعر، مکتب، مدرسہ، جامعہ، پرائمری اسکول، ہائی اسکول، کالج، یونیورسٹی، یہ سب الفاظ اصطلاحی اعتبار سے مخصوص ہیں اور ان کے معنی و مطلب بھی متعین ہیں، لیکن آجکل بعض الفاظ کے استعمال کے سلسلہ میں بے احتیاطیاں اور بے اعتدالیاں پائی جاتی ہیں، ان میں ایک لفظ "جامعہ" بھی ہے، تعلیم بالکل ابتدائی یا درمیانی سطح کی ہوتی ہے، جس کو "مکتب" یا "مدرسہ" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، لیکن ... لوگ اسے "جامعہ اسلامیہ" سے موسوم کرتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ بعض ادارے اپنی زندگی کے پہلے ہی دن سے "جامعہ اسلامیہ" کا لبادہ اوڑھے جلوہ گر ہوتے ہیں۔ بلاشبہ لفظ کا یہ غلط استعمال ہے۔ المعجم الوسیط (اول، صفحہ ۱۳۵) میں "الجامعہ" کے تحت یہ لکھا ہوا ہے "مجموعة معاهد علمية، تسمى كليات تدرس فيها الآداب والفنون والعلوم" یعنی مختلف علمی اور تحقیقی اداروں کا مجموعہ، جس میں متعدد علوم و فنون کی تعلیم اونچی سطح سے ہوتی ہو"۔ گویا یہ لفظ یونیورسٹی کا مترادف ہے، اسی لئے اڈوانسڈ لوئینتھ سنچری ڈکشنری (مرتب پروفیسر بشیر احمد قریشی، صفحہ ۷۲۰) میں یونیورسٹی (UNIVERSITY) کا ترجمہ "جامعہ" سے کیا ہے اور تشریحی نوٹ میں یہ لکھا ہے" (Highest Seat of Learning) یعنی جہاں ابتدائی اور درمیانی

نہیں بلکہ اعلیٰ اور اونچی تعلیم کا انتظام ہو، لفظ جامعہ پر اُردو دائرہ معارف اسلامیہ (جلد ۷، صفحہ ۷۴ تا ۷۵، شائع کردہ دانش گاہ پنجاب، لاہور) میں پوری تحقیق مختلف ممالک کی جامعات کے تعارف کے ساتھ موجود ہے جس میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ عثمانیہ اور جامعہ ملیہ کا بھی تذکرہ ہے۔ اہل ذوق کے لئے اس کا مطالعہ بھی مفید ہے۔ اسی طرح شاہکار اسلامی انسائیکلو پیڈیا (صفحہ ۵۹۶ تا ۵۹۸ شائع کردہ کراچی پاکستان) میں تفصیلی معلومات ہیں۔ راقم الحروف ایک عرصہ سے بعض اہلِ علم کی تنقید کی وجہ سے اس طرف توجہ دلانا چاہتا تھا، جس کا موقع آج مذکورہ عنوان کے تحت ملا۔ آخر میں جی چاہتا ہے کہ زیرِ نظر مضمون کو حکیم کنفیوشس کے اس اہم اور معنی خیز جملہ کو دہراتا ہوا ختم کروں کہ :-

"ایک مصلح کا سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہیئے کہ وہ صحیح الفاظ کا استعمال کرے"

اقبالؒ اور رازِ حیاتؔ

علامہ اقبالؒ نے اپنی شاعری میں حیات و کائنات، علم و آگہی، وقت و زمانہ امروز و فردا، آج کل، شب و روز، شام و سحر، آہِ سحرگاہی، صبح کی بیداری بوقت صبح اذانِ مومن، سورج، چاند، ستارے، ان الفاظ اور ان سے وابستہ تصورات و کیفیات کا بکثرت تذکرہ کیا ہے، چونکہ ان کی طبیعت میں جودت و جدّت ہے، ذہن انقلابی، تعمیری اور اصلاحی ہے، کارگہہ فکری میں ہر روز بلکہ ہر لمحہ افکار تازہ ڈھلتے رہتے تھے، اس لئے انہوں نے ان الفاظ کا سہارا لے کر کائنات کی سب سے اعلیٰ اور برتر مخلوق یعنی "انسان" کو مختلف نوعیتوں اور حیثیتوں سے "پیغام" دیا ہے، پیغام کا حاصل یہ ہے کہ انسان دنیا کی رنگینیوں اور رعنائیوں میں گم نہ ہو جائے، اس عارضی اور فانی زندگی کے بعد جو دائمی اور غیر فانی زندگی آنے والی ہے، اس پر نگاہ رکھے تعطّل اور جمود کا شکار نہ ہو، حرکت میں برکت ہے، اور مسلسل چلتے رہنے ہی سے منزل ملتی ہے، وقت کو ضائع اور برباد نہ کرے، دانشوری اور دانشمندی یہ ہے کہ "آج" (امروز) سے بھرپور فائدہ اٹھالے، کیوں کہ گذشتہ کل (دوش) پر اختیار نہیں، اور آنے والے کل (فردا) کی امید نہیں۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ جسے وقت یا زمانہ کہتے ہیں، وہ ہر آن گزرنے والا "لمحہ" ہے، اس میں ثبات، قرار اور ٹھہراؤ نہیں، جیسے ایک بہتی ہوئی نہر ہو جو اپنی

مقررہ رفتار کے ساتھ بغیر رکے بہہ رہی ہو، وقت اور زمانہ اپنے اِس تصور کے اعتبار سے تقسیم پذیر کمیت اور مقدار ہے، یہ ایک طرح کا طول ہے جس کو چھوٹے بڑے اور برابر کے ٹکڑوں میں کاٹا جا سکتا ہے، سکنڈ، منٹ، گھنٹے، دن، رات، ہفتے ماہ و سال اور قرنیں اور صدیاں اسی کے مختصر اور طویل حصے ہیں، ماضی، حال، مستقبل کی تین تعبیریں بھی مسلسل اور متواتر سرگرمِ سفر رہنے والے وقت اور زمانہ ہی کی ہیں اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جو وقت یا زمانہ گزر گیا وہ نہ اب ہے اور نہ آئے گا (یعنی ماضی) یہ لمحہ جو اَب ہے نہ کبھی پہلے تھا، اور نہ آئندہ ہوگا (یعنی حال) اور آنے والی ساعتیں آنے والی ہیں نہ اب ہیں اور نہ پہلے آچکی ہیں (یعنی مستقبل) اقبالؔ یہ تعلیم دیتے اور تلقین کرتے ہیں کہ "حال" سے اپنے "احوال" کو درست کرنے کی کوشش کرو، غافل ہو کر بیٹھ مت جاؤ، شریکِ محفل ہی کو جام ملتا ہے اور "غائب" کا کوئی حصہ نہیں ہوتا، زمانہ کسی کی رعایت نہیں کرتا، جو قوم مستقبل میں سربلندی کے لئے آج تیاری نہیں کرتی، وہ مستقبل میں کبھی سربلندی حاصل نہیں کرتی، کائنات کی ہر چیز حالتِ سفر میں ہے، تم بھی اپنے سفر کو جاری رکھو، مقصدِ سفر بلند ہو، سفر کرتے ہوئے طبیعت میں جوش، ولولہ اور ہمت ہو، ہر انسان کی عمر برف کی سِل کی طرح پگھلتی رہتی ہے، کامیاب تاجر وہ ہے جو برف کو پگھلنے سے پہلے بیچ لے، اِس سے پہلے کہ تمہاری مقررہ عمر ختم ہو جائے اور مستعار زندگی کا شیرازہ بکھر جائے اسے کام میں لے آؤ، "کام" ہی سے "انعام" ملتا ہے، اور "حیاتِ عارضی" سے "حیاتِ جاودانی" بنتی ہے، کسی نے دوش دیکھا ہے نہ ہی فردا، ہر زندہ شخص کے لئے اِمروز ہی اس کا زمانہ ہے، جس سے اس کو کام لینا ہے قوت اور عزت علم و فن میں ہے، چنگ و رباب اور رقص و سرور میں کسی طرح کی رفعت اور ترقی نہیں ہے، اس سے تو ہمیشہ زوال جھانکتا ہے، ظاہری حسن میں کھونے اور مست کرنے والی سریلی آواز میں الجھنے کا مطلب اپنی منزل کو کھوٹی کرنا

ہے، زندگی کے اعلیٰ مقاصد ہیں، ان کی تکمیل ہی کا نام دراصل "زندگی" ہے۔

اقبالؔ کی نظر تیز، علم عمیق اور مطالعہ وسیع ہے، ایک بات کو سو سو رنگ میں پیش کرنے کا انہیں ڈھنگ آتا ہے، چنانچہ مؤثر اور دل نشیں انداز اور پیرایہ میں پیغام دینے کے لئے کبھی وہ سورج پر نگاہ ڈالتے ہیں، چاند کو دیکھتے ہیں، ستاروں سے باتیں کرتے ہیں، شب و روز کے جلوے ان کے سامنے آتے ہیں، شام و سحر کے مناظر ان کا دل لبھاتے ہیں، تڑکے جاگنا ان کے من کو بہت بھاتا ہے، آہِ سحرگاہی ان کے لئے دوا آتشہ کا کام کرتی ہے، صبح کی پرکیف فضا، ان کے قلب کو مسرور کرتی اور نظر کو نور بخشتی ہے، زمانہ کی نیرنگی انہیں بتاتی ہے کہ بدلے ہوئے حالات پر نظر رکھی جائے، نہ ہی مشرق سے "بیزار" ہونے کی ضرورت ہے، نہ ہی مغرب سے "حذر" کرنے کی حاجت، البتہ فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کیا جائے، اس لئے تعمیر نو سے ڈرنا اور طرزِ کہن پر اڑنا نہیں چاہیئے۔ وہ اپنے اسی فلسفۂ حیات کے پیشِ نظر قدیم و جدید کی بحث کو "بے بصری" سے تعبیر کرتے ہیں۔

آیئے! علامہ اقبال کی شاعری کا اس نقطۂ نگاہ سے مطالعہ کریں، اور دیکھیں کہ تذکرہ، تاریخ، فلسفہ، قانون، تصوف، اسلامیات، عمرانیات، سماجیات اور فرد و قوم کے عروج و زوال کی کہانی پر گہری، بھرپور اور باریک نگاہ رکھنے والے عظیم شاعر نے اپنی تمام تر شاعرانہ عظمتوں کے ساتھ مذکورہ بالا پہلوؤں سے ہمیں کیا پیغام دیا ہے۔

ہم اس سلسلہ میں جب آگے بڑھتے ہیں، اور ان کی شاعری کے مجموعہ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو سب سے پہلے "بالِ جبریل" کی ایک نظم ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے، نظم کا عنوان "زمانہ" ہے، اہلِ زمانہ اگر اقبال کی نظم زمانہ کو

سمجھ لیں تو زمانہ میں ان کا نام روشن ہو جائے، اس نظم کو غور سے پڑھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس میں فلسفہ بھی ہے اور سیاست بھی، اسرارِ حیات بھی ہیں اور پیغامِ انقلاب بھی، آج مسلمانوں کی سب سے بڑی کوتاہی یہ ہے کہ وہ یا تو ماضی کی یاد میں محو رہتے ہیں یا مستقبل کا حسین اور خوش آئند خواب دیکھتے رہتے ہیں، وہ زمانۂ حال کے تقاضے سے بالکل غافل رہتے ہیں، یہ نظم جدید تقاضوں سے باخبر کراتی ہے، چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا یہی ہے اک حرفِ محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی، اسی کا مشتاق ہے زمانہ

مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ

ہر ایک سے آشنا ہوں، لیکن جدا جدا رسم و راہ میری
کسی کا راکب، کسی کا مرکب، کسی کو عبرت کا تازیانہ

نہ تھا اگر تو شریکِ محفل، قصور میرا ہے یا کہ تیرا؟
مرا طریقہ نہیں کہ رکھ لوں کسی کی خاطر مئے شبانہ

وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا، وہ عالمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے، بنا دیا ہے قمار خانہ

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

زمانہ سے متعلق "ساقی نامہ" میں ان کا یہ شعر ہے:

زمانہ کہ زنجیرِ ایام ہے
دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے

زمانہ کے ساتھ "زندگی" بھی اقبال کا خاص موضوع ہے، ان کی ایک مشہور نظم "خضرِ راہ" ہے، جس میں انہوں نے خضر سے بطورِ خاص بعض چیزوں کے بارے میں سوال کیا ہے، ان میں سے ایک "زندگی" بھی ہے۔

زندگی کا راز کیا ہے
سلطنت کیا چیز ہے

خضر نے اِس سوال کا تفصیلی جواب دیا ہے، جس کا ایک حصہ یہ ہے:

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی!
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِّ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی
بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اِک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

ایک شعر یہ بھی ہے:

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

کس قدر فکر انگیز ہے ان کا یہ شعر ؎

رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

حیات کی تعبیر ان کے نزدیک یہ ہے ؎

رگوں میں گردشِ خوں ہے اگر تو کیا حاصل
حیات سوزِ جگر کے سوا کچھ اور نہیں

زندگی اور علم کے فرق کو بتاتے ہیں ؎

زندگی کچھ اور شئ ہے، علم ہے کچھ اور شئ
زندگی سوزِ جگر ہے، علم ہے سوزِ دماغ

اقبال اسرارِ حیات اس طرح سمجھاتے ہیں ؎

زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرارِ حیات
یہ کبھی گوہر، کبھی شبنم، کبھی آنسو ہوا
پھر کہیں سے اس کو پیدا کر بڑی دولت ہے یہ
زندگی کیسی جو دل بے گانۂ پہلو ہوا

اگر آبرو کی تمنا ہو ؎

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزارِ ہستی میں
تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے

زندگی کو اگر خزاں نا آشنا رکھنا منظور ہو ؎

اگر منظور ہو تجھ کو خزاں نا آشنا رہنا
جہانِ رنگ و بو سے پہلے قطعِ آرزو کر لے

پھول کو مخاطب کر کے انسان کو زندگی کا راز سمجھاتے ہیں ؎

اسی میں دیکھ! مضمر ہے کمالِ زندگی تیرا
جو تجھ کو زینتِ دامن کوئی آئینہ رو کرلے

زندگی گزارنا کوئی آسان کام نہیں ہے، بہت ہی احتیاط کے ساتھ سنبھل سنبھل کر قدم رکھنا پڑتا ہے، کچھ اِس طرح کہ جیسے شیشے کا برتن دوش پر ہے تھوڑی سی لغزشِ پا ہوئی اور وہ پورا برتن چکنا چور ہوگیا، شیشے کا ایسا نازک برتن رکھ کر کوئی ہوشمند آدمی بے احتیاطی کے ساتھ قدم نہیں رکھتا، تمہیں بھی شیشہ کی طرح اپنی نازک زندگی کو احتیاط کے ساتھ متوازن اور معتدل انداز میں گزارنی چاہیئے ؎

زندگی کی رَہ میں چل لیکن ذرا بچ بچ کے چل
یہ سمجھ لے کوئی مینا خانہ بارِ دوش ہے

زندگی رواں دواں ہے، دکھ، درد، تکلیف، مصیبت، غم سے اس کی روانی میں کوئی فرق نہیں آنا چاہیئے، زندگی کے گزرنے پر اور موت کے آنے پر بھی غم نہیں کرنا چاہیئے، جب تک دنیا میں رہو فکرِ ایں و آں سے بے نیاز پوری شانِ قلندری کے ساتھ اپنی زندگی کے سفر کو جاری رکھو ؎

دَمِ زندگی، رمِ زندگی، غمِ زندگی، سمِ زندگی
غمِ رم نہ کر، سمِ غم نہ کھا کہ یہی ہے شانِ قلندری

یہ کہہ کر وہ زندگی کو حوصلہ دیتے ہیں ؎

کانپتا ہے دِل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا
ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحِل بھی تو

وہ اپنی مشہور نظم "ذوق و شوق" میں قلب و نظر کی زندگی کی مثال دیتے ہیں ؎

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں
چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں!

مسلکِ زندگی کی تقویم کیا ہے؟ کہتے ہیں ؎

دیں مسلکِ زندگی کی تقویم
دیں سرِّ محمدؐ و ابراہیمؑ

اقبال سلسلۂ روز و شب کی طرح زندگی میں مسلسل حرکت دیکھنا چاہتے ہیں، وہ یہ تلقین کرتے ہیں کہ انسان کی زندگی ترقی کی سمت گامزن رہے، اور کسی مقام پر جاکر ٹھہرے نہیں، بلکہ اس کا ذوقِ سفر ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف رواں دواں رکھے اور وہ آگے کی طرف بڑھتا ہی چلا جائے۔

ہر ایک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

پہلی تاریخ کا چاند "ہلال" کی حیثیت سے طلوع ہوتا ہے، اور اپنی مسلسل تگ و دو سے "بدرِ کامل" (چودھویں کا چاند) کا مقام حاصل کرلیتا ہے، وہ کہتے ہیں۔

ہر ایک مقام سے آگے گزر گیا مہِ نو
کمال کس کو میسر ہوا ہے بے تگ و دو

وہ یہ بھی آئینہ دکھاتے ہیں ؎

مہ و ستارہ سے آگے مقام ہے جس کا
وہ مشتِ خاک ابھی آوارگانِ راہ میں ہے

راہ نورد کو اندھیری شب میں منزل پر پہونچنے کے لئے چیتے کی آنکھ چاہیئے ؎

ملے گا منزلِ مقصود کا اسی کو سراغ!
اندھیری شب میں ہے چیتے کی آنکھ جس کا چراغ

وہ یہ بھی کہتے ہیں ؎

ہر شئ مسافر ہر چیز راہی
کیا چاند تارے، کیا مرغ و ماہی

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے اِمتحاں اور بھی ہیں

بانگ درا میں ایک نظم "چاند اور تارے" کے عنوان سے ہے، اس نظم کے سبق آموز اشعار دیکھئے ؎

کام اپنا ہے صبح و شام چلنا
چلنا، چلنا، مدام چلنا!

بے تاب ہے اِس جہاں کی ہر شئ
کہتے ہیں جسے سکوں، نہیں ہے

رہتے ہیں ستم کشِ سفر سب
تارے، انساں، شجر، حجر سب

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی
یہ رسم قدیم ہے یہاں کی

ہے دوڑتا اشہبِ زمانہ
کھا کھا کے طلب کا تازیانہ

اس رہ میں مقام بے محل ہے
پوشیدہ قرار میں اجل ہے

چلنے والے نکل گئے ہیں
جو ٹھہرے ذرا، کچل گئے ہیں

اقبال اپنی نظم "ساقی نامہ" (بالِ جبریل) میں بحیثیتِ ساقی زندگی کا یہ جام دیتے ہیں

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی!
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند
سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند

سفر زندگی کے لئے برگ و ساز
سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز

چونکہ سفر کی حیثیت زندگی کے لئے برگ و ساز اور اسبابِ زیست کی ہے، سفر حقیقت ہے، اور حضر مجاز ہے، اس لئے اس سفری مضمون کو ایک منزل تک پہونچا کر آگے بھی اس سلسلہ کو جاری رکھنا ہے۔ (وَباللّٰہِ التّوفیق) تاہم اقبال نے سفر کی ایک درمیانی منزل تک پہونچتے ہوئے جو کچھ کہا ہے، اس کے بارے میں وہ خود یہ کہنا چاہتے ہیں ؎

مجھے رازِ دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

شاہین اور علامہ اقبال

پرندوں کی دنیا میں "شاہین" کو تقریباً وہی مقام حاصل ہے جو جانوروں کی دنیا میں "شیر" کو حاصل ہے، شیر اگر جنگل کا بادشاہ ہے تو شاہین بھی پرندوں کے زمرے کا شاہ ہے ایک قلندر صفت شاہ کے اندر جو بے فکری، بے غمی، اولوالعزمی، عالی حوصلگی، بلند نظری، تیز نگاہی، پرواز خیالی، شرافت و سادگی اور غیرت و خودداری وغیرہ کی صفات ہوتی ہیں، یہ صفات شاہین میں بھی پائی جاتی ہیں، کیا عجب کہ شاہ ہی سے شاہین (فارسی) بنا ہو اور واضع لغت نے شاہین کی خصوصیات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس کے لئے لفظ کا یہ جامہ تیار کیا ہو جو اس کی قامت پر بالکل فٹ آرہا ہو، اور اس کی معنوی حیثیت کا صحیح تعارف کرا رہا ہو۔ اور اگر لغت کے اعتبار سے شاہین کا ترجمہ "ترازو کی سوئی یا ڈنڈی" سے کیا جائے تو اس لحاظ سے بھی اس لفظ کی اہمیت واضح ہے کہ جس طرح ترازو کے لئے اس کی سوئی یا ڈنڈی اہمیت کی حامل ہے اسی طرح پرندوں کے حلقہ میں شاہین کو اس کی خصوصیات کے اعتبار

سے اہمیت کا مقام حاصل ہے، فکر و شعور رکھنے والا انسان بھی چاہے تو اس پرندہ سے اپنی زندگی کے لئے بہت کچھ سبق لے سکتا ہے شاہین کی یہی وہ امتیازی حیثیت ہے جس سے علامہ اقبالؔ (۱۹۳۸ ـــــ ۱۸۷۷ء) متاثر ہوئے ہیں اور اپنی شاعری میں ایک "علامت" کے طور پر اسے استعمال کیا ہے۔ اس پر بھی نظر رہے کہ اقبالؔ کی شاعری چوں کہ روایتی اور رسمی نہیں بلکہ حقیقی اور انقلابی ہے، اس لئے جس لفظ کو بھی انہوں نے اپنی شاعری میں بطورِ علامت استعمال کیا ہے اس میں ان کا انقلابی ذہن کارفرما رہا ہے۔ شاہین کے لفظ سے بھی جو درس اور پیغام دینا چاہتے ہیں وہ نہایت انقلابی ہے بلکہ اگر علامہ اقبالؔ کی شخصیت اور شاعری کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت اور شاعری کے انقلابی عناصر ترکیبی میں یہ عنصر (شاہین) سب سے غالب اور طاقتور ہے۔

شاہین کے بارے میں علامہ اقبالؔ نے خود ایک جگہ وضاحت کی ہے کہ "شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں ہے، اس جانور میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں، خود دار اور غیرتمند ہے، اوروں کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا، بے نیاز ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا، بلند پرواز ہے، خلوت پسند ہے اور تیز نگاہ ہے۔" (انوارِ اقبالؔ، صفحہ ۲۲۰)

شاہین کی یہ صفات اقبالؔ کو بیحد پسند ہیں اور دل و جان سے وہ چاہتے ہیں کہ ان کے من پسند نوجوانوں میں یہ شاہینی

صفات پائی جائیں، چنانچہ انہوں نے اپنے کلام میں ایسے مثالی نوجوانوں کو عموماً اسی نام سے پکارا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
میرا نورِ بصیرت عام کر دے

○

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں

○

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

○

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو
فروغ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صیدِ زبوں افرشتہ حور
کہ شاہیں ہے شہِ لولاک ہے تو

○

نگاہِ عشق، دل زندہ کی تلاش میں ہے
شکارِ مردہ سزاوارِ شاہبازِ نہیں

○

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

○

وہ فریب خوردہ شاہین جو پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی

○

افسوس صد افسوس کہ شاہین نہ بنا تو
دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

○

خشت را معمار ہا کج می نہد
خوئے بط با بچۂ شاہین دہد

(ان مدارس کے معماروں نے پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھی ہے
شاہین بچوں کو بطخوں کے آداب سکھائے جا رہے ہیں)

اس موقع پر بعض ماہرینِ اقبالیات کی یہ رائے بھی قابلِ توجہ ہے کہ "اگر کلامِ اقبال کا تاریخ وار مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ شاہین کی تشبیہ ان کے فکر و ذہن کی ارتقائی صورت رکھتی ہے، یہ

تشبیہ پہلے پہل "بانگِ درا" کے چوتھے یا آخری حصے یعنی ۱۹۰۸ء کے بعد کے کلام میں نظر آتی ہے، پھر کثرتِ استعمال اور تکرار کے ذریعہ ارتقاء کی ایسی منزلوں میں پہونچ گئی ہے جہاں اقبال کا فلسفۂ حیات کسی خاص علاقہ، وطن، ملت تک محدود نہیں رہا بلکہ ساری دنیا کے لئے امن و آشتی اور سعی و عمل کا پیغام بن گیا ہے" (خیابان، اقبال نمبر ص: ۵۷) چنانچہ بالِ جبریل میں اقبال کی نظم "شاہین" اسی قبیل کی ہے اس میں خود شاہین نے اپنی زبان سے اس امر کی وضاحت کردی ہے کہ میرا مسلک جارحیت نہیں، بے نیازی و درویشی ہے جس کا تعلق رہبانیت سے نہیں فقرِ اسلامی سے ہے۔

حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں — کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ
جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا — لہو گرم رکھنے کا ہے اِک بہانہ
یہ پورب یہ پچھم چکوروں کی دنیا — مرا نیلگوں آسماں بے کرانہ
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں — کہ شاہین بناتا نہیں آشیانہ

یہ تو علامہ اقبال کی شاعری کی بات ہوئی جس میں انہوں نے "شاہین" کے لفظ کو ایک خاص تناظر میں استعمال کیا ہے، جہاں تک تعلق ان کی شخصیت کا ہے تو شاہینی صفات کی جلوہ گری اس میں بھی ہے۔ اس نتیجہ تک وہ لوگ نہایت آسانی کے ساتھ پہونچ سکتے ہیں جنہوں نے حیاتِ اقبال کا مطالعہ کیا ہے، تفصیلات میں جائے بغیر صرف دو واقعات کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے جن سے انکے شاہینی مزاج کا اندازہ ہو سکے گا۔

شاہین کے بارے میں عام طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ وہ تنہا

جنگلوں میں درختوں کی سوکھی ٹہنیوں کے سروں پر یا پہاڑ کی چوٹیوں پر بیٹھتا ہے، وہ اپنا نشیمن نہیں بناتا ہے البتہ انڈے دیتے وقت (جس کی تعداد دو تا چار ہوتی ہے) ناگزیر ضرورت کے تحت عارضی طور پر پہاڑی درّوں یا چٹانوں کی شگافوں میں چند سوکھی ٹہنیوں اور گھاس وغیرہ جمع کر کے نشیمن بنا لیتا ہے۔ اس پسِ منظر میں نہایت باریک بینی کے ساتھ علامہ اقبال کے بارے میں حکیم ریاض قریشی مرحوم کا یہ انکشافی بیان (بحوالہ "نوائے وقت" میگزین پاکستان) پڑھئے:۔

"علامہ نے میوروڈ پر جو اب علامہ اقبال روڈ کہلاتی ہے، جو کوٹھی "جاوید منزل" کے نام سے تعمیر کروائی وہ ان کی ذاتی ملکیت نہیں تھی بلکہ ان کے فرزندِ ارجمند جاوید اقبال کے نام تھی۔ اور علامہ بطور کرایہ دار کے اس کے دو کمروں میں رہتے تھے، کرایہ دار ہونے کی حیثیت سے انہوں نے اپنے بیٹے کو کرایہ نامہ بھی لکھ کر دیا تھا اور باقاعدہ ماہ بماہ کرایہ بھی دیتے تھے وہ جب تک زندہ رہے کرایہ ادا کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔"

شاہین اگر اپنے مستقل نشیمن کی تعمیر سے بے زار ہے اور بوقتِ ضرورت عارضی بسیرا بنا لیتا ہے تو علامہ اقبال بھی اپنے شاہینی مزاج کے سبب ذاتی مکان سے دلچسپی نہیں رکھتے اور اپنی قلندری کے باعث فانی اور عارضی دنیا میں کرائے کے دو کمروں کو اپنی ضرورت کے لئے کافی سمجھتے ہیں اور غیرت و خودداری ان سے تقاضہ کرتی ہے کہ بیٹا ہی

سہی مگر کرایہ نامہ لکھ کر دیا جائے اور پابندی سے کرایہ ادا کیا جائے۔
اس لئے اقبالؔ کو یہ حق پہونچتا ہے کہ وہ پوری قوت کے ساتھ کہیں:

لذتِ سیر است مقصودِ سفر　　گر نگہ بر آشیاں داری مپر
زندگی جز لذتِ پرواز نیست　　آشیاں با فطرت او ساز نیست

یعنی آشیانے سے بے نیاز رہ کر سرگرمِ سفر رہا جائے، اور لذتِ سیر کو مقصودِ سفر سمجھا جائے۔ اس لئے کہ زندگی حقیقت میں لذتِ پرواز ہی کا نام ہے اور آشیاں بندی اس کی فطرت کے خلاف ہے۔

شاہین کی اہم ترین صفات میں توکل، قناعت، خودداری اور غیرت مندی بھی ہے، علامہ اقبالؔ کی زندگی میں یہ صفات بھی بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ مذکورہ بالا واقعہ تو جزوی طور پر اس حیثیت سے روشنی ڈالتا ہی ہے، تاہم الگ سے ایک دوسرا واقعہ نگاہ میں لے آئیے، ڈاکٹر فرمان فتحپوری لکھتے ہیں:۔

"توکل و قناعت کے ساتھ خودداری اور غیرت مندی ان کے مزاج میں ایسی تھی کہ بلاضرورت کسی قسم کی مالی امداد طلب کرنا پسند نہ کرتے تھے، جزرسی و کفایت شعاری نے انہیں احسانِ غیر سے ہمیشہ محفوظ رکھا، آخر میں علالت کی وجہ سے چوں کہ ذرائع آمدنی مفقود ہو گئے تھے، اس لئے نواب بھوپال سے ۵۰۰ روپے کا ماہانہ وظیفہ ضرور قبول کر لیا تھا اور اپنے مصارف کے لئے اسی کو کافی سمجھ کر سر راس مسعود کو ایک خط میں لکھا تھا کہ "میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں، بہترین مسلمانوں نے سادہ

اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے، ضرورت سے زیادہ ہوس کرنا روپے کا لالچ ہے جو کسی طرح بھی مسلمان کے شایانِ شان نہیں۔" چنانچہ سر راس مسعود ہی کی توجہ سے سر آغا خاں نے پانچ سو روپے کا جو ماہانہ وظیفہ مقرر کرنا چاہا تھا، اس کو لینے سے اقبال نے انکار کر دیا اور نواب صاحب بھوپال کے وظیفہ ہی کو بہت کافی خیال کیا، اسی طرح اس سے پہلے ریاستِ حیدرآباد دکن کے وزیر اعظم سر اکبر حیدری نے توشہ خانہ سے علامہ اقبال کو ایک ہزار روپے کا چیک بطورِ امداد بھیجا تو اقبال نے واپس کر دیا اور چیک کے ساتھ مندرجہ ذیل اشعار بھی لکھ بھیجے تھے۔ اس لئے کہ جس فنڈ سے یہ رقم بھیجی گئی تھی اسے ان کی غیرت مندی قبول نہ کر سکتی تھی۔

تھا یہ اللہ کا فرمان کہ شکوہ پرویز
دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر
حسنِ تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات
میں تو اس بارِ امانت کو اٹھاتا سر دوش
کام درویش میں ہر تلخ ہے مانند نبات
غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

(اقبال سب کے لئے، ص: ۲۸-۲۷)

علامہ اقبالؔ کی شاعری اور شخصیت میں "شاہین" اور "شاہینی صفات" کے مطالعے کے بعد اس کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ کلامِ اقبال میں شاہین کا تذکرہ محض "شاعرانہ آئیڈیل" کے طور پر نہیں ہے بلکہ اس میں گہری معنویت ایسی ہی چھپی ہوئی ہے جیسی کہ پھول میں خوشبو۔ سو نگھتے جائیے اور مشامِ جان کو تازہ اور معطر کرتے جائیے۔ جہاں تک تعلق شاہین کی صفت خلوت پسندی کا ہے تو اس کا مفہوم و مطلب بھی معاشرہ اور سماج سے کٹ جانا نہیں ہے اور نہ ہی غرور اور خود بینی میں مبتلا ہو کر اجتماعی زندگی سے راہِ فرار اختیار کرنا اور اس میں پیش آنے والی مشکلات سے گریز ہے بلکہ مقصود کچھ دیر تنہائی اور خلوت میں بیٹھ کر خدا کی یاد اور ذکر سے اپنے آپ کو طاقت پہچانا، غور و فکر کی صلاحیت کو بڑھاوا دینا، قوم و ملت کے مفاد میں سوچنا اور عملی پروگرام ترتیب دینا ہے۔ قرآنی آیات، سنتِ رسولؐ اور مفکرین و مصلحین کے عمل سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اہم بات یہ ہے کہ فرض کیجئے کوئی شخص زید کو شیر سے تشبیہہ دے تو زید میں شیر کی ہر ہر چیز تلاش نہیں کی جائے گی بلکہ اس کے اصلی جوہر شجاعت اور بہادری کو سامنے رکھا جائے گا، اسی طرح شاہین کی تشبیہ سے اصل مراد اس پرندہ کی عالی ظرفی، بلند پروازی، تیز نگاہی، خودداری اور چاق و چوبندی ہے۔ ان صفات پر ہی زیادہ نظر ہونی چاہیئے، نہ یہ کہ اس کی ہر ہر صفت کو انسان پر چسپاں کرنے کی کوشش کی جائے۔ نیز کسی شاعر

یا فلسفی کی طرف کوئی چیز منسوب کی جائے تو دیدہ وری کو کام میں لاتے ہوئے اس کے مناسب حال اور معنی خیزی بھی پیدا کرنی چاہیئے۔ اس معنی خیزی کو عام کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ مختلف انداز سے اس کی مسلسل تشریح اور تشہیر کی جائے، کچھ دنوں بعد خود بخود اس کا معنوی پہلو اور فلسفیانہ رمز مخصوص حلقے سے نکل کر عام حلقہ کے فہم تک رسائی حاصل کر لیتا ہے اور آگے چل کر یہی چیز عمومی حیثیت کا درجہ پاکر روایت بن جاتی ہے۔

بہر حال یہ حقیقت ہے کہ شاہین جسمانی طور پر اگرچہ فضا میں اپنی شانِ امتیازی کے ساتھ پرواز کرتا ہے لیکن علامہ اقبالؔ نے اپنی فراست اور حکمتِ عملی سے اس کی روح کو گرفتار کر کے اپنی شاعری اور شخصیت میں بند کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے، اگر کوئی ان کی شاعری اور شخصیت کو اصولی اور بنیادی طور پر سمجھنا چاہتا ہے تو اس کے لئے شاہین سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے جس کا مختصر تعارف اور پیغام علامہ اقبالؔ ہی کے الفاظ میں یہ ہے کہ:

گذر اوقات کر لیتا ہے وہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لئے ذلّت ہے کارِ آشیاں بندی

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

علامہ اقبال کے شعری مجموعوں میں "بانگِ درا" اہم ترین مجموعہ ہے، اس مجموعہ میں اقبال اپنے پورے رنگ اور آہنگ کے ساتھ جلوہ گر ہیں اسی مجموعہ میں ان کی وہ مشہور غزل ہے جو صاحبِ قال اور صاحبِ حال دونوں کو بہت پسند آئی، اور قوالوں نے بھی اسے محفلِ قوالی میں گا کر خوب رنگ جمایا ہے، غزل کا مطلع یا پہلا شعر یہ ہے ؎

کبھی اے حقیقتِ منتظر! نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں، مری جبینِ نیاز میں

غزل کا مطلع یا آخری شعر یہ ہے ؎

جو میں سر بہ سجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
تیرا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

مطلع اور مقطع میں زبان و بیان اور فکر و خیال کی جو ہم آہنگی ہے، وہ ظاہر ہے۔ اس مطلع اور مقطع کے علاوہ سات اشعار پر مشتمل غزل کے ان تین اشعار نے بھی بڑی شہرت حاصل کی ہے ؎

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی!
مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

زیرِ نظر مضمون کا محور پوری غزل یا غزل کے وہ اشعار نہیں ہیں جنہیں انداز اور لب و لہجہ کو جاننے کے لئے اوپر نقل کیا گیا ہے، بلکہ غزل کا صرف پہلا شعر پیش ہے، بلاشبہ یہ شعر اقبال کے ان اشعار میں سے ہے، جنہیں "مشکلاتِ اقبال" کے ذیل میں جگہ دی جاسکتی ہے، یعنی اقبال کے وہ اشعار جن کو سمجھنے میں اقبالیات کے طالب کو مشکل پیش آتی ہے، اور لفظوں کے صدف سے معانی کے گہر کو نکالنا آسان نہیں ہوتا، کاش کہ اقبال پر مختلف زاویوں سے کئے گئے کام میں ایک کام مستقل طریقہ پر ایک خاص ترتیب کے ساتھ "مشکلاتِ اقبال" کا بھی کسی سخنور یا سخن فہم کی جانب سے کیا جاتا تو طالبانِ اقبالیات کو فہمِ اقبالیات کے کٹھن اور دشوار گزار مرحلہ میں سہولت ہوتی، اور ایسے کسی مجموعہ میں اقبال کے ایسے تمام اشعار ایک ساتھ پڑھنے کو مل جاتے، جس سے حکیم اور دانا اقبال کے حکمت اور دانائی کے نکتے ہاتھ آتے، اور "اقبال آگاہی" کا ایک نیا دروازہ کھلتا، اقبال ہی نے کہا ہے۔ ع

ہم ڈھونڈنے والے کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

کام کی اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے آگے بڑھئے، اور غور کی نظر سے دیکھئے، تو واضح طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ اقبال نے مطلع کا زیرِ تذکرہ ایک شعر ہی نہیں، بلکہ پوری غزل، کیف و مستی اور جذب و بے خودی کے عالم میں کہی ہے، غزل اور غزل کے ہر شعر میں تصوف کی رُوح وجد کرتی نظر آرہی ہے

بعض دینی حقائق اور تاریخی واقعات کی طرف اشارہ بھی شاعر نے کچھ اس طرح کیا ہے کہ دین کا حقیقت پسندانہ مزاج اور تاریخ کی خشکی بھی عشق و محبت کی رنگینی اور رعنائی میں بدل گئی ہے، مطالعہ کے بعد آپ اس حقیقت کو پالیں گے۔

اس پسِ منظر میں دوبارہ اِس شعر پر نگاہ ڈالئے ؎

کبھی اے حقیقتِ منتظر! نظر آ لباسِ مجاز میں!
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

حقیقت کے لغوی معنی ہیں وہ ذات جسے فنا نہ ہو، یہاں اس سے مراد محبوبِ حقیقی یعنی ذاتِ خداوندی ہے، منتظر کے معنی ہیں، جس کا انتظار کیا جائے، اور جس سے لَو لگائی جائے، اور لباسِ مجاز سے مادی شکل مراد ہے، جو حواسِ خمسہ سے محسوس ہو سکے، اس شعر کے لب و لہجہ، انداز اور بین السطور سے صاف واضح ہے کہ شاعر معمول کی حالت میں نہیں ہے اس کی ہستی میں ایک مستی ہے، اور اس کے وجود کے بحر میں مدوجزر آیا ہوا ہے، دل میں ایک آگ لگی ہوئی ہے، اور عشقِ حقیقی کی تپش سے اس کا سینہ بریاں ہے، وہ اپنے اس اضطراب اور بے تابی کی حالت میں اپنے محبوبِ حقیقی کو دیکھنا اور اس کے قرب کی انمول دولت حاصل کرنا چاہتا ہے، تاہم وہ جذب و کیف کے اس عالم میں بھی اس سے باخبر ہے کہ میں اپنے محبوبِ حقیقی کو اس کی حقیقی صورت میں دیکھ نہیں سکتا، اور لباسِ مجاز میں آنے کی خواہش اس کے اضطرابِ عشق کا مظہر ہے، کیونکہ اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دید کی خواہش کا انجام معلوم ہے کہ جواب انہیں یہ ملا تھا لن ترانی (تم مجھ کو ہرگز نہیں دیکھ سکتے) اسے یہ بھی معلوم ہے کہ محبوبِ حقیقی

کی تجلی جب پہاڑ پر ظاہر ہوئی تو موسیٰ دیکھتے ہی بیہوش ہو کر گر گئے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا، اس لئے دیوانگی میں بھی ہشیاری سے کام لیتے ہوئے شاعر یہ کہہ رہا ہے کہ اے حقیقتِ منتظر! آپ کے احسانات اور انعامات بے شمار ہیں، ان احسانات اور انعامات کے بوجھ سے میری گردن جھکی ہوئی ہے دل شکر کے جذبات سے لبریز ہے، جبینِ نیاز ہے کہ اس میں ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں، اگر آپ اپنے شایانِ شان اور میرے مناسبِ حال کسی "لباسِ مجاز" میں آجاتے تو آپ کے قدموں پر گر کر اپنی جبینِ نیاز کے سارے سجدے نچھاور کر دیتا، اس لئے کہ تو سجدے میں اپنے بندے سے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے، آپ نے اپنے فرمان میں بھی یہ بات بتائی ہے، اور آپ کے نبیؐ کا بھی یہ ارشاد ہے، پھر اس کے لئے میرا دل "کبھی" بے تاب ہوتا ہے، اس لئے لباسِ مجاز میں آنے کی خواہش "کبھی" کے لئے ہے، ہمیشہ کے لئے نہیں، اس سے میرے دلِ بیتاب کو سکون و قرار آئے گا، اور ایک "عبد" کو اپنے "معبود" کا قرب حاصل ہوگا۔

اس شعر کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شاعر حقیقتِ منتظر کے غیبی وجود سے آگاہ ہے، وہ اپنی نگاہ کی تیزی اور احساس کی شدت سے "غیب" سے "شہود" کی سمت اور "علم الیقین" سے "عین الیقین" کی جانب سفر کرنا چاہتا ہے، اس لئے غیب اور علم الیقین کے لئے "حقیقتِ منتظر" اور شہود اور عین الیقین کے لئے "لباسِ مجاز" کے الفاظ کا استعمال کیا ہے، محبوبِ حقیقی کے غیبی وجود پر ایمانِ غیب میں اپنی عقیدت کا اظہار ہے، اور شہود کے جلوے کی خواہش میں بے پایاں "عشق و محبت"

کا اعلان ہے، ایک مومن ان دو طرفہ جلوؤں کے درمیان ہی رہتا ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ کے صفاتی اسماء میں اول بھی ہے اور آخر بھی باطن بھی ہے، اور ظاہر بھی۔

اقبالؔ کے اس شعر کے معنی و مفہوم کو ان کے پیر دانا مولانا روم کی ذکر کردہ اس حکایت سے بھی سمجھا جا سکتا ہے، جسے مولانا روم نے "معارفِ مثنوی" میں "حکایت چرواہا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام" کے عنوان سے لکھا ہے، اس حکایت کا حاصل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ایک مجذوب اللہ تعالیٰ کا عاشق جنگل میں بکریاں چراتا تھا، وہ عشق سے سرشار حالتِ جذب میں کہا کرتا تھا کہ اے اللہ! آپ مجھے کہاں ملیں گے، آپ اگر ملتے تو میں آپ کے ہاتھ کو بوسہ دیتا، پیر کی مالش کرتا، اور سر میں تیل لگاتا، سونے کے وقت بستر صاف کرتا اور اس طرح کی تمام خدمت ایک خادم کی حیثیت سے میں کرتا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چرواہے کو اس کے ان الفاظ پر ٹوکا، اور الوہیت کی حقیقت بتائی، تاہم چرواہے کے الفاظ میں جوشِ عشق تھا نہ کہ ترکِ ادب۔ ایک بندہ کی زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں، جن میں ظاہری حدبندیوں سے ماورا، وہ عشق و محبت کی آخری سرحد میں داخل ہوتا ہے، زندگی کی یہ لمحاتی کیفیت اس حدیث سے بھی معلوم ہوتی ہے، جس میں یہ بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ کی توبہ سے بہت زیادہ خوش ہوتا ہے، اتنا خوش کہ ایک آدمی سفر کرتے ہوئے جنگل میں ایک درخت کے نیچے آرام کرنے لگا، اسی دوران اس کی وہ سواری غائب ہوگئی، جس پر سوار ہو کر وہ سفر کر رہا تھا، اور اسی پر اس کا کھانا پانی تھا، تلاشِ بسیار کے باوجود وہ

سواری مِل نہ سکی، آبادی بہت دُور اور جنگل میں کھانے پینے کا کوئی سامان نہیں، مایوسی کا عالم ہے اور موت وزیست کا مرحلہ، اسی اضطرابی کیفیت میں کھانے پینے کے سامان کے ساتھ اس کی وہ سواری اچانک نگاہوں کے سامنے آگئی، اور وہ شدتِ فرحت میں پکار اٹھتا ہے کہ اے اللہ! تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں، حالانکہ اس کا مقصد اس جملہ سے کفر نہیں ہوتا، بلکہ خوشی کے جذبہ سے سرشار بے شعوری میں یہ جملہ اس کی زبان سے نکل گیا، اقبال بھی اضطرابِ عشق میں "حقیقتِ منتظر" سے "لباسِ مجاز" میں آنے کی خواہش کر رہے ہیں، اس لئے اقبال جیسے موحّد کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کا یہ شعر کفر وشرک سے آلودہ ہے "برہمنیت" اور "وحدانیت" کے درمیان جو واضح لکیریں ہیں، ان لکیروں پر برہمن آباء واجداد کے پسِ منظر میں بھی ان کی گہری نظر تھی۔

ایک بات یہ بھی یاد رکھنی چاہئے کہ جہاں "عبد" (بندہ) اپنے "معبود" (جس کی عبادت کی جائے) سے اپنی عبادتی اداؤں سے قریب ہونا چاہتا ہے، وہاں معبود بھی اپنی مختلف شانوں کے ساتھ بندے کو اپنی طرف بلاتا ہے، معبودِ برحق کا اعلان ہے کہ میں آخری شب سمائے دنیا پر آجاتا ہوں، نیند کے ماتے ذرا اٹھو، اپنی ضرورتوں اور حاجتوں کو میری بارگاہ میں رکھو، وہ یہ بھی کہتا ہے کہ "میں بیمار بھی ہوتا ہوں، مجھے بھوک بھی لگتی ہے اور پیاس بھی، تمہیں اس پر حیرت نہیں ہونی چاہئے اگر تم بیمار، بھوکے اور پیاسے انسان کے قریب جاؤ گے تو تم وہاں مجھے پاؤ گے، معبودِ برحق کے نبیؐ برحق نے یہ بھی بتایا ہے کہ عبادتوں کے ذریعہ

ایک بندہ اپنے معبود سے اتنا قریب ہوجاتا ہے کہ معبود اس بندہ کا ہاتھ پیر اور زبان بن جاتا ہے، یعنی یہ اعضاء معبود کی خوشنودی کے کام میں لگ جاتے ہیں، اسی طرح یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ بندہ اگر اپنے رب کی طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہے، تو وہ دو ہاتھ بڑھتا ہے، اور اگر بندہ چل کر آتا ہے تو رب بندہ کی طرف دوڑ کر آتا ہے۔

اقبال فلسفۂ اسلامی اور اس کے رموز و نکات سے آگاہ ہیں، بشری جذبات سے بھی باخبر ہیں، اگر وہ اپنی اس آگہی اور باخبری کے سبب یہ کہیں کہ ؎

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

تو ان کے اس شعر پر تعجب کیوں اور حیرت کیسی؟۔

اقبال کے اس شعر کی تفہیم نامکمل ہی رہے گی، اگر آخر میں اس کا تذکرہ نہ کیا جائے کہ اقبال بڑے شاعر ہیں، اور ہر بڑے شاعر کی طرح ان کی قوتِ متخیلہ نہایت طاقتور، احساس شدید قوی، نظر تیز اور نگاہ نازک بیں ہے، اس پسِ منظر میں علامہ اقبال کے مذکورہ بالا شعر کو مولانا شبلی نعمانی کے ایک عمومی تبصرہ کی عبارت سے بھی سمجھنے کی کوشش کی جاسکتی ہے، مولانا شبلی نعمانی "شعر العجم" میں لکھتے ہیں:

"شاعر کے سامنے قوتِ تخیل کی بدولت تمام بے حس اشیاء جاندار چیزیں بن جاتی ہیں، اس کے کانوں میں ہر طرف سے خوش آئند صدائیں آتی ہیں، زمین، آسمان، ستارے بلکہ ذرہ ذرہ اس سے باتیں کرتا ہے" (شعر العجم جلد ۴، صفحہ ۱۰)

ایک دوسری جگہ بیان کا پیرایہ بدلتے ہوئے لکھتے ہیں:

تخیل کی تعریف ہنری لوئس نے یہ کی ہے کہ "وہ قوت جس کا یہ کام ہے کہ ان اشیاء کو جو مرئی نہیں ہیں (ناقابلِ دید) یا جو ہمارے حواس کی کمی کی وجہ سے ہم کو نظر نہیں آتیں، ہماری نظر کے سامنے کر دے۔"
(ایضاً صفحہ ۹)

مولانا شبلی نعمانی نے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے:

"تخیل جس قدر قوی، باریک، متنوع اور کثیر العمل ہوگا، اسی قدر اس کے لئے مشاہدات کی زیادہ ضرورت ہوگی، جس قدر بلند پرواز طائر (پرندہ) ہوگا، اس کے لئے فضاء کی وسعت درکار ہوگی" (ایضاً صفحہ ۴۰)

عشق و معرفت اور وجد و حال کی کیفیت سے بھرپور اقبال کے اس شعر پر تبصرہ کو اقبال کے درجِ ذیل شعر پر ہی ختم کر دینا زیادہ مناسب اور موزوں نظر آ رہا ہے ؎

مری نوا سے ہوئے زندہ عارف و عامی
دیا ہے میں نے انہیں ذوقِ آتشِ آشامی

پیغامِ اقبالؒ
حج اور قربانی کے پسِ منظر میں

دیں مسلکِ زندگی کی تقویم
دیں سرِّ محمدؐ و ابراہیمؑ

ہجری سال کا پہلا مہینہ محرم اور آخری مہینہ ذی الحجہ ہے، بوقتِ تحریر ذی الحجہ کا مہینہ رواں دواں ہے، اس مہینہ کی اہم ترین عبادت قربانی اور حج ہے، اس مناسبت سے اس مہینہ کو "ماہِ قربانی و حج" کا نام بھی بطورِ تعارف دیا جا سکتا ہے، حج کے فریضہ کی ادائگی کے لئے ایک مسلمان کو حجازِ مقدس جانا پڑتا ہے، یہی وہ علاقہ ہے جہاں مکہ مکرمہ ہے، خانۂ خدا (بیت اللہ، کعبہ) ہے، حرم ہے، صفا اور مروہ ہے، چاہِ زمزم ہے، منیٰ عرفات اور مزدلفہ ہے، آگے بڑھئے تو دل و نگاہ کی سرزمین مدینہ منورہ ہے، مسجدِ نبویؐ ہے، روضۂ اطہر ہے، پھر قربانی و حج کے اس خاص مہینہ میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل (علیہما السلام) کی یادوں کا ایک تسلسل ہے، نویں ذی الحجہ کی فجر سے تیرہویں ذی الحجہ کی عصر تک نمازوں کے بعد اور نمازوں کے علاوہ بھی تکبیر و تہلیل (اللہ اکبر، اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر، اللہ اکبر وللہِ الحمد) کی صدائے مسلسل ہے، یہی وہ زمانہ ہے کہ حاجیوں کی زبانیں لبیک اللھم لبیک

لبیک لا شریک لک لبیک، ان الحمد والنعمۃ لک والملک، لا شریک لک،" کا نغمہ فضا میں بکھیرتی رہتی ہیں۔

اس مہینہ کے یہ جو معنی خیز پہلو ہیں، اس مناسبت سے معنویت کے موتی لٹانے والے، ہر موقع کے لحاظ سے موزوں پیغام دینے والے، تاریخی واقفیت، دینی حمیت اور ملی غیرت رکھنے والے، حکیم اور دانا شاعر ڈاکٹر محمد اقبال یاد آگئے، چلئے دیکھیں کہ وہ حجاز، کعبہ حرم، اذان، مکہ، مدینہ، ابراہیمؑ خلیل اللہ، اسماعیلؑ ذبیح اللہ، محمد عربی، قربانی، حج اور زمزم کے مقدس و متبرک پسِ منظر میں کیا شعری پیغام دیتے ہیں۔

سب سے پہلے حجاز کو لیجئے، یہ علاقہ نہایت مقدس ہے، اس علاقہ کو نبیِ آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص نسبت ہے، حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل اور دیگر انبیاءِ کرام علیہم الصلاۃ والسلام کی جائے سکونت کی حیثیت اور ان کی آمد و رفت کے سلسلہ نے بھی اسے عظمت و رفعت بخشی ہے، اس تاریخی پسِ منظر نے اقبال کے دل میں اس دیار کی محبت راسخ کر دی ہے، وہ مشتاقانہ انداز میں کہتے ہیں

ہَوا ہو ایسی کہ ہندوستاں سے اے اقبالؔ
اڑا کے مجھ کو غبارِ رہ حجاز کرے

اقبالؔ وارفتگی کے عالم میں یہ بھی کہتے ہیں ؎

عجمی خم ہے تو کیا، مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا، لے تو حجازی ہے مری

اقبالؔ کو جب معلوم ہوا کہ جدہ میں "شفا خانہ حجاز" کھلنے والا ہے،

تو اسی عنوان سے آٹھ اشعار پر مشتمل ایک نظم کہی، ذیل کے دو شعر میں ان کا معنوی ذوق و شوق دیکھئے، اور غور کیجئے کہ اس سرزمین سے وہ کس طرح کے جذبات وابستہ کئے ہوئے ہیں ؎

اوروں کو دیں حضور یہ پیغامِ زندگی
میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں

آئے ہیں آپ لے کے شفا کا پیام کیا؟
رکھتے ہیں اہلِ درد مسیحا سے کام کیا۔

بانگِ درا میں ایک جگہ اقبال اپنے اوپر نگاہِ ناقدانہ ڈالتے ہیں، انہیں اپنی بعض عملی کوتاہیاں نظر آتی ہیں، اپنے کو بھی اور عملی کوتاہیوں کے شکار دیگر افراد کو بھی "نصیحت" کرتے ہیں، اس نصیحت میں دل اور زبان کے فاصلے کو ختم کرکے ان کے درمیان باہمی رفاقت کی تلقین کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ دین اور علاقۂ حجاز کے تعلق کے معاملہ میں "ریاکاری" ٹھیک نہیں ہے، اشعار یہ ہیں ؎

میں نے اقبالؔ سے ازراہِ نصیحت یہ کہا
عاملِ روزہ ہے تو اور نہ پابندِ نماز

تو بھی ہے شیوۂ اربابِ ریا میں کامل
دل میں لندن کی ہوس، لب پہ ترے ذکرِ حجاز

اقبالؔ ایک جگہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا کرتے ہیں، اس التجا میں قومِ حجاز کی ایک اہم خصوصیت بھی اپنے مخصوص انداز میں بیان کرتے ہیں:

آگیا عینِ لڑائی میں اگر وقتِ نماز
قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہونچے تو سبھی ایک ہوئے

ابلیس کا فرمان جو اپنے سیاسی فرزندوں کے نام ہے، اقبالؔ نے ایک جگہ اس کا ذکر کرتے ہوئے اہلِ حجاز کو سوچنے سمجھنے کا ایک وسیع میدان فراہم کیا ہے ؎

فکر عرب کو دے کے فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو

حضرت حسین رضی اللہ عنہ، کے تاریخی کردار کے پسِ منظر میں انہیں "قافلۂ حجاز" سے یہ شکایت ہے ؎

قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں!
گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

اقبالؔ کی ایک مشہور نظم ہے "ترانۂ ملّی"، اس کے درج ذیل شعر میں میرِ حجاز (صلی اللہ علیہ وسلم) سے گہری عقیدت کا اظہار بھی ہے، اور اس یقین و اعتماد کا بیان بھی کہ جب وہ ہمارے سالارِ کارواں ہیں، تو پھر ہمیں کسی تشویش، خلجان اور اضطراب میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں، یہ نام اور اس نام سے عشق و محبت، ہماری جان کو آرام کی ضمانت دینے کے لئے بہت کافی ہے ؎

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

حجاز کے بعد کعبہ کو لیجئے، کعبہ کے بارے میں قرآنِ کریم نے ایک جگہ (آلِ عمران ۹۶) یہ حقیقت بیان کی ہے کہ کعبہ دنیا کا سب سے پہلا گھر بھی ہے، اور پہلا عبادت خانہ بھی، جس کے معمارِ اول دنیا کے سب سے پہلے آدمی اور پیغمبر حضرت آدم علیہ السلام ہیں، اقبالؔ اس قرآنی اور تاریخی حقیقت سے واقف ہیں، اپنی اس واقفیت کو اپنے ایک شعر میں بیان کرتے ہوئے وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ دنیا میں خدائے واحد کی عبادت کے اس پہلے گھر کے نگہبان ہم ہیں، اور وہ ہمارا نگہبان ہے، جب تک کعبہ موجود ہے، مسلمان موجود رہیں گے، اور جب تک مسلمان زندہ ہیں، کعبہ بھی قائم اور برقرار رہے گا، یہ دونوں لازم اور ملزوم کی حیثیت سے ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں، جنہیں جدا نہیں کیا جا سکتا، وہ کہتے ہیں ؎

دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں، وہ پاسباں ہمارا

کعبہ کے پسِ منظر میں اقبالؔ ایک اہم پیغام مسلمانوں کو یہ دیتے ہیں کہ وہ ابتلاء و آزمائش اور مصائب و حوادث سے گھبرائیں نہیں، کسی مسلم علاقے میں تباہی کا مطلب مسلمانوں کا مٹنا نہیں ہے، مسلمانوں پر ایک ذمہ داری یہ ہے کہ وہ کعبہ کی حفاظت میں سرگرم رہیں، یعنی حفاظتِ اسلام ان کی زندگی کا محبوب مشن ہو، حالات خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے، اور آج کے دشمن کل کے دوست بن جائیں گے، اقبالؔ اس سلسلہ میں یہ تاریخی حقیقت پیش کرتے ہیں کہ ترکوں نے سلطنتِ عباسیہ کا چراغ گل کر دیا تھا، لیکن بعد میں وہی ترک مسلمان ہو کر کعبہ (مراد یہاں اسلام ہے) کے

محافظ بن گئے ؎

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

کعبہ کے خصوصی مقام سے "حرم" کے عمومی ماحول میں آیئے، یہاں بھی آپ کو اقبالؔ کا یہ معنی خیز پیغام ملے گا ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

حرم کا عنوان اختیار کرتے ہوئے اہلِ حرم سے اقبال اِس طرح مخاطب ہیں ؎

ہو تری خاک کے ہر ذرے سے تعمیرِ حرم
دل کو بیگانۂ اندازِ کلیسا کر

اقبالؔ تہذیبِ اسلامی اور تہذیبِ فرنگی کے درمیان تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے اپنے اخذ کردہ نتیجہ سے آگاہ کرتے ہیں ؎

عرب کے سوز میں سازِ عجم ہے
حرم کا راز توحیدِ امم ہے

تہی وحدت سے ہے اندیشۂ غرب
کہ تہذیبِ فرنگی بے حرم ہے

اقبالؔ کے نزدیک حرم میں توحید کے درس کے ساتھ اتحاد کا پیغام بھی ہے ؎

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی ایمان بھی ایک۔

حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی، ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

حرمِ مکی ہو یا حرمِ مدنی، یہاں کی اذانوں میں خاص درد اور سوز ہوتا ہے، پھر یہی وہ اذانیں ہیں، جن کی بازگشت پوری دنیا کی مسجدوں میں سننے میں آتی ہے، اقبالؔ نے اس اہم اسلامی شعار کی حقیقت کو اس طرح سمجھایا ہے ؎

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

بالِ جبریل میں "اذان" کے عنوان سے جو ان کی مستقل نظم ہے، اس کا آخری شعر یہ ہے ؎

ناگاہ فضا بانگِ اذاں سے ہوئی لبریز
وہ نعرہ کہ ہِل جاتا ہے جس سے دلِ کہسار

اذان کے کلمات میں جو عظیم حقیقت اور معنویت پوشیدہ ہے، اس کی بنیاد پر اقبالؔ کامل یقین کے ساتھ کہتے ہیں ؎

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِّ کلیم و خلیل

اسلامی نقطۂ نگاہ سے "مکہ مکرمہ" دنیا کے تمام شہروں کے مقابلہ

میں با عظمت ہے، اس شہر نے حج کے اعمال کے اعتبار سے بھی اور اپنی عام حیثیت سے بھی دنیا کو "وحدتِ آدم" کا پیغام دیا ہے "ضربِ کلیم" میں "مکہ اور جنیوا" کے عنوان سے چند شعروں پر مشتمل ان کی یہ نظم اقوامِ عالم کو چشمِ بصیرت عطا کرتی ہے ؎

اس دَور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
تفریقِ ملل، حکمتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم
مکّے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم

مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ چلیے، جہاں کی خاک، اقبال ہی کی آنکھ کے لئے نہیں، ہر مسلم کی آنکھ کے لئے "سرمہ" ہے، کسی مسلم کی آنکھ میں جب یہ سرمہ ہو تو دنیا کا کوئی بھی جلوہ اس کی آنکھ کو خیرہ نہیں کر سکتا ؎

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف۔

اقبال کی جو نظمیں "ایک حاجی مدینہ کے راستے میں" "حضورِ رسالت مآب میں" اور "اے روحِ محمدؐ" کے عنوان سے ہیں، وہ مدینہ اور صاحبِ مدینہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بے پناہ عشق و محبت کا مظہر ہیں، ان کی یہی وہ اندرونی کیفیت ہے، جس کے سبب انہوں نے "جوابِ شکوہ" کو اس شعر پر ختم کیا ہے ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

اقبالؔ کہتے ہیں کہ عالمِ عربی کی اپنی جگہ اہمیت ہے، مگر عالمِ عربی کے لئے یہ بات قابلِ غور ہے کہ محمد عربی کے بغیر عالمِ عربی کی کوئی حیثیت نہیں، محمدِ عربی ہی سے دراصل عالمِ عربی ہے ؎

کرے یہ کافرِ ہندی بھی جرأتِ گفتار
اگر نہ ہوا مرائے عرب کی بے ادبی!

یہ نکتہ پہلے سکھایا گیا کس امت کو؟
وصالِ مصطفویؐ افتراقِ بولہبی

نہیں وجود، حدود و ثغور سے اس کا
محمدؐ عربی سے ہے عالمِ عربی!

مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور رسولِ عربی کے ساتھ یہ مہینہ حج اور قربانی کی وجہ سے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل (علیہما السلام) کی یاد خصوصیت کے ساتھ دلاتا ہے، حضرت ابراہیم کی زندگی میں جو چیز نمایاں طور پر سامنے آتی ہے، وہ ہے ان کا ایمان و یقین، صبر و وفا دعوتِ توحید اور صداقت شعاری، حضرت ابراہیم خلیل اللہ (علیہ السلام) کے بارے میں اقبالؔ کے یہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

یقیں مثل خلیل آتش نشینی
یقیں اللہ مستی خود گزینی

سن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار
غلامی سے ہے بدتر بے یقینی

ذوق حاضر ہے تو پھر لازم ہے ایمانِ خلیل
ورنہ خاکستر ہے تیری زندگی کا پیرہن

آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

آج بھی ہو جو ابراہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل
یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لا الٰہ میں ہے

یہ دَور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ!

صدق خلیل بھی ہے عشق، صبر حسین بھی ہے عشق!
معرکہ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق۔

اقبالؔ کو یہ توقع ہے ؎

سرشک چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا

کتاب ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

اقبالؔ مکتب کی تعلیم کے قائل ہیں، مگر ان کے نزدیک یہاں کی تعلیم سے علم تو آجاتا ہے، مگر آداب نہیں آتے، وہ کہتے ہیں کہ اس کے لئے اہل اللہ اور اہلِ دل کی صحبت اور ہم نشینی کی ضرورت ہے، ان لوگوں کی نظر کے فیضان سے "آداب" آتے ہیں، حضرت اسماعیل علیہ السلام

اپنے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کہنے پر ذبح ہونے کے لئے جو فوراً تیار ہو گئے تھے، یہ دراصل مکتب کی کرامت نہیں، فیضان نظر کا اثر تھا ؎

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی!
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

اسلامی تاریخ میں موت اور زندگی کی جو حقیقت ہے، اس حقیقت کو حضرت اسماعیل اور حضرت حسین کے واقعات کے پسِ منظر میں اپنے مخصوص اور دل نشیں اسلوب کے سہارے ماہِ ذی الحجا اور محرم (جو یکے بعد دیگرے آتے ہیں) کو پیشِ نگاہ رکھتے ہوئے اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

غریب و سادہ و رنگین ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسین ابتدا ہے اسمٰعیلؑ

جہاں تک تعلق حج کا ہے، جو اس مہینے کی اہم ترین عبادت ہے، اسے پیشِ نظر رکھتے ہوئے اقبالؔ اپنے ایک شعر میں حاجیوں سے یہ کہتے ہیں کہ مکہ مکرمہ سے آبِ زمزم اور مدینہ منورہ سے کھجوریں بطورِ تحفہ اپنے ساتھ لانا، بلاشبہ ایک سعادت کی بات ہے مگر کیا وہاں کے تحفے یہی ہیں؟ اصل تحفہ تو یہ ہے کہ وہاں سے اپنے اندر سوز و گداز کی کیفیت ساتھ لائی جائے، حج کے بعد ایک حاجی تقویٰ اور طہارت کی صفت سے آراستہ ہو، وہ واپس آنے پر ایسی زندگی بسر کرے، جس کو دیکھ کر دوسروں کے دلوں میں اسلام کی عظمت اور دین کی حقانیت قائم ہو، اور لوگ اس کے شب و روز کی

عبادت میں اپنے لئے ایک رغبت محسوس کریں، نہایت فکرمندی اور دل سوزی کے ساتھ وہ کہتے ہیں ؎

زائرانِ کعبہ سے اقبالؔ یہ پوچھے کوئی!
کیا حرم کا تحفہ زمزم کے سوا کچھ بھی نہیں

رہ گیا معاملہ قربانی کا، تو یہ گوشت اور خون کا نام نہیں ہے بلکہ اِس حقیقت کا نام ہے کہ ہمارا سب کچھ خدا کے لئے ہے، اور اسی کی راہ میں قربان ہونے کے لئے، قربانی کرنے والا صرف جانور کے گلے پر ہی چھری نہیں پھیرتا بلکہ وہ ساری ناپسندیدہ خواہشات اور غیر شرعی رسوم و رواج پر بھی چھری پھیر کر ان کو ذبح کر ڈالتا ہے، اِس شعور کے بغیر جو قربانی کی جاتی ہے، وہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی سنت نہیں، بلکہ ایک قومی رسم کہلائے گی، جس میں گوشت اور پوست کی فراوانی تو ہوگی، لیکن "ہمارا سب کچھ خدا کے لئے ہے" اور اسی کی راہ میں قربان ہونے کے لئے ہے" والا جذبہ اور تقویٰ ناپید ہوگا، جو قربانی کی روح ہے، علامہ اقبالؔ اپنے ایک قطعہ میں تمام عبادات میں ظاہر سے باطن کی طرف پوست سے مغز کی طرف آنے کی، اپنی حقیقت پر نگاہ رکھنے کی، اور اپنی حیثیت اور اپنے مقام و مرتبہ کو پہچاننے کی دعوت دیتے ہیں، ان کا یہ درج ذیل قطعہ مسلمانوں کے لئے ایک آئینہ ہے، اور ماہِ قربانی و حج والے "شعری پیغام" کا حسنِ اختتام بھی، اقبالؔ فرماتے ہیں ؎

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے — وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج — یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

اُردو ـــــ مولانا ابوالکلام آزاد کی دکھائی ہوئی راہ

جو عالمِ ایجاد میں ہے صاحبِ ایجاد
ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ

کائنات کے فطری نظام میں سورج کی کرنیں بھی ہیں اور پانی کا بہاؤ بھی، سورج کی کرنیں جب دروازہ اور کھڑکیاں بند دیکھتی ہیں تو وہیں ٹھہر جاتی ہیں اور ان کے کھلنے کا انتظار کرتی ہیں، دروازہ وا ہوا، کھڑکیوں کے پٹ کھلے تو یہ کرنیں اندر جاتی ہیں، اس کے برعکس معاملہ پانی کا ہے، پانی کی طبیعت میں بہاؤ ہے نہ کہ ٹھہراؤ، جب کبھی بھی وہ اپنا راستہ مسدود پاتا ہے وہاں رُکتا نہیں، فوراً کترا کر رُخ بدل دیتا ہے اور دوسری راہ اختیار کر لیتا ہے، گویا سورج کی کرنوں کی راہ میں جب.... کوئی رکاوٹ پیش آتی ہے تو "کشمکش" سے اپنے لئے آگے بڑھنے کی کوئی نئی راہ نہ تراشتی ہیں نہ تلاش کرتی ہیں، بس ساکت و صامت ٹھہر کر "جمود" کی کیفیت سے دوچار رہتی ہیں، پانی جمود سے ناآشنا ہے، بس وہ ہر حالت میں اور ہر صورت میں بہنا چاہتا ہے۔ "حرکت میں برکت" کے فلسفہ کا راز داں ہے۔

نظامِ فطرت کی اس طرح کی بہت ساری مثالوں میں ہم نے صرف سورج کی کرنوں اور پانی کے بہاؤ کی مثالیں پیش کی ہیں۔ اس لئے کہ یہ مثالیں خدائی وسیع و عریض کائنات میں مختلف انداز سے پھیلی ہوئی ہیں اور خدا نے جنہیں دلِ حساس اور چشمِ بینا عطا فرمایا ہے، ان مثالوں پر شب و روز غور و فکر کرتے ہیں ان پھیلی ہوئی مثالوں کو تھوڑی دیر کے لئے قدرت کے عظیم شاہکار "انسان" پر مرکوز کیجئے تو یہاں بھی آپ کو معلوم ہوگا کہ بعض انسان ایسے ہیں جو راستہ چلتے ہوئے اپنے سامنے کوئی رکاوٹ دیکھتے ہیں تو اسے دور کر کے آگے بڑھنے کا حوصلہ نہیں پاتے ہیں، یا تو پیچھے واپس ہو کر "گلشن میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے" کے خول میں بند ہو جاتے ہیں یا جائے رکاوٹ پر حسرت و یاس کی تصویر بنے نگاہ عبرت کے لئے "تماشہ" بن جاتے ہیں۔ مگر وہ لوگ جو کشمکش حیات کے خوگر ہیں، تلاطم سے زور آزمائی میں "لطفِ زندگی" پاتے ہیں، عافیت ساحل میں نہیں بلکہ موجِ طوفاں کے حریف بننے میں محسوس کرتے ہیں، عرش و فرش کی آواز پر دھیان دیئے بغیر حدِ پرواز سے بھی آگے نکل جانے کی جرأت رکھتے ہیں، ان کے کانوں میں کبھی آبشاروں کی یہ صدائے مسلسل آتی ہے ع

چٹانیں چور ہو جائیں جو ہو عزم سفر پیدا

بسا اوقات "ہاتف غیبی" یہ آواز دیتا ہے ؎

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزار ہستی میں ۔: تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کرلے

ایسا شخص "سرِّ زندگانی" پر یوں بھی نظر رکھتا ہے ؎

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِّ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

ایسے شخص کے سامنے "بندگی" اور "آزادی" کی یہ حقیقت جلوہ گر ہوتی ہے ؎

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی

یہ نغمہ بھی اس کی زباں پر ہوتا ہے ؎

گذر جا بن کے سیلِ تند رو، کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے، تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

ایسا باحوصلہ، باہمت، باعزم اور "مستی کردار" کا حامل انسان پانی کی صفتِ بہاؤ کے ساتھ "مہِ نو" کی اس خصوصیّت پر بھی خصوصی نگاہ رکھتا ہے اور اس سے اپنے لئے سبق حاصل کرتا ہے ؎

ہر اک مقام سے آگے گذر گیا مہِ نو
کمال کس کو میسّر ہوا ہے بے تگ و دو

سورج کی کرنوں اور پانی کے بہاؤ کی تمثیلات اور اس ذیل میں پیش کی جانے والی شعری توضیحات سے بتانا مقصود یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد (۱۹۵۸ — ۱۸۸۸ء) کو خالق نے جو ذہن عطا فرمایا تھا وہ "جمودی" یا "انجمادی" نہیں، بلکہ "عملی" اور "حرکیاتی" تھا، وہ ٹھہر جانے، بیٹھ جانے، انتظار کرنے کے خوگر نہیں تھے، چلتے رہنے، ایک راستہ بند ہونے کی صورت

میں دوسرا راستہ تلاش کرنے، انتظار کی بجائے نئے اقدام کی جستجو میں سرگرداں رہنے والے تھے۔ جب کسی شخصیت میں یہ "جوہر" موجود ہوتا ہے تو وہ اختراعی اور ایجادی صلاحیتوں کی حامل بن جاتی ہے۔ اتباع اور تقلید سے زیادہ اجتہاد و تحقیق، اس کے مزاج کا حصہ بن جاتا ہے، غیب سے مضامین آنے لگتے ہیں، افکار نو کے انبار لگتے چلے جاتے ہیں، بات میں بات پیدا کرنے کا اسے ہُنر آجاتا ہے، جدّت اور ندرت اپنی عشوہ طرازیاں دکھلاتی رہتی ہیں وہ کسی ایک دائرے میں محدود نہیں رہتا، سمندر کی طرح بے کراں ہو جاتا ہے، بلاشبہ مولانا آزاد کا شمار ایسی ہی عظیم تاریخی شخصیتوں میں ہوتا ہے، بقول مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی:

"وہ ایک ہمہ گیر شخصیّت تھے، محرم اسرارِ دین تھے، مفسّر قرآن تھے، محدّث تھے، فقیہ تھے، فلسفی تھے، مؤرخ تھے، ادیب تھے، خطیب تھے، انشا پرداز تھے، اخبار نویس تھے، سیاسی مدبّر تھے، قومی لیڈر تھے، مجاہد حریت تھے۔

ع "ہے رنگ لالہ و گلِ نسریں جُدا جُدا"

مولانا آزاد کی انہیں ہمہ جہتی صلاحیتوں اور اختراعی اور ایجادی قوتوں نے انہیں جدید راہوں پر دوڑنا سکھایا تھا، ہر لحظہ ان کے سامنے نیا طور ہوتا تھا اور نئی برقِ تجلّی، ان کا مرحلۂ شوق کبھی طے نہیں ہوتا، ان کا جذبۂ تسلسلِ سفر اندر سے آواز لگاتا ؎

وہ مسافر ہوں جو ہو ختمِ سفر سے بے نیاز ∴ میری ہر منزل نشانِ راہ ہر منزل نہیں

شاید اس معاملہ میں وہ شاہین کے یا شاہین ان کا ہم دم و ہم ساز ہو ؎

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا ∴ لہو گرم رکھنے کا ہے اِک بہانہ

آدمی کی آبادی میں ایسے ہی لوگ "لاقنوطی" اور "رجائی" بن جاتے ہیں، یاس اور مایوسی اپنے اندر ہمت نہیں پاتی کہ ان کا سامنا کرے، اس اعتبار سے مولانا آزادؒ ماضی قریب کی اونچی شخصیتوں میں "مینارۂ نور" ہیں، کوئی بھی معاملہ ہو، وہ "چراغِ رہ گذر" بنے رہے اس سلسلہ میں مولانا ماہر القادری کی یہ بات ان کے عمیق مطالعے، گہرے تجزیے اور "آزاد شناسی" کا مظہر ہے، وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"نفسیاتی نقطۂ نظر سے اگر انسان کی قلبی کیفیات کی تقسیم کی جائے تو وہ دو اجزاء پر تقسیم ہو جائیں گی، اور یہ اجزاء "قنوطیت" اور "رجائیت" ہیں، تمام دنیا کے مختلف النوع اور متبائن الجنس انسانوں کے حالات پر غور کرو تو ان کو یاس و رجا کی کش مکش میں مبتلا پاؤ گے، اسی اعتبار سے بعض انشاء پردازوں نے "قنوطیت" کو اور بعض نے "رجائیت" کو اپنا موضوع قرار دیا، لیکن یاس انگیز مضامین سے عبرت حاصل کی جا سکتی ہے، مگر خیالات کی بلندی، عزم کے استحکام اور بلند حوصلگی میں ان سے کوئی مدد نہیں لی جا سکتی، بلکہ اس کے برخلاف دل اضمحلال کی طرف مائل ہوتا ہے اور خیالات میں پستی پیدا ہو جاتی ہے۔

ابوالکلام ایک سپاہی مسلمان ہیں، جن کے دامنِ امید و رجاء کو یاس نے کبھی نہیں چھوا، یاس انگیز مضامین کو وہ ہاتھ تک نہیں لگاتے، وہ رجائی ہیں اور دوسروں کو بھی رجائیت کی دعوت دیتے ہیں، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ غم انگیز موضوع کو وہ کبھی نہیں چھیڑتے، ان کے قلم نے ترکی کے شہیدوں کی لاشوں پر ماتم بھی کیا ہے، ان کی آنکھوں سے کانپور کے خونی ہنگامہ پر خون کے آنسو بھی ٹپکے ہیں طرابلس الغرب کے مسلم یتیموں اور بیواؤں کی چیخوں پر بھی انہوں نے لبیک کہی ہے مگر اس خونی ماحول اور غم انگیز فضا میں ان کی ایک سانس کو بھی قنوط کا کوئی جھونکا جنبش میں نہیں لا سکا، وہ تو ہر خونچکاں کفن اور ہر مجروح سینہ کی زبان سے نصرت و کامرانی کی بشارت سناتے ہیں تاکہ قوم میں حرکت پیدا ہو، اُردو زبان میں ابوالکلام اس طرز کے موجد ہیں، وہ رُلاتے نہیں ہنساتے ہیں، وہ بے پناہ طریقہ سے تڑپاتے ہیں مگر ہر تڑپ کو وہ عملی اضطراب کی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ شاید اسی اسلوب نگارش سے متأثر ہو کر رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے فرمایا تھا کہ "ابوالکلام کی نثر اور اقبال کی شاعری سے میں نے لیڈری سیکھی ہے۔" (ابوالکلام آزاد، ادبی و شخصی مطالعہ، صفحہ ۶۱۱ — ۶۱۰)

مولانا آزاد کے اوصاف و کمالات میں ایجادی، اختراعی اقدامی اور رجارو آس کا تذکرہ تفصیلی طور پر اس لئے کیا گیا ہے کہ "اُردو" سے متعلق اس میں پیغامِ موت بھی ہے اور تحفۂ زندگی بھی، پستی بھی ہے اور بلندی بھی، شکست بھی ہے اور فتح بھی، اردو کے سلسلہ میں مولانا آزاد نے اپنے قول و عمل، فکر و نظر، اور پختہ عزم و ارادہ سے جو راہ دکھائی ہے، جس پر ایک پورا کتب خانہ موجود ہے اس سے اگر فائدہ اٹھایا گیا تو زندگی ہے، بلندی ہے، فتح ہے، اس راہ سے روگردانی کی گئی تو موت ہے، پستی ہے، شکست ہے۔

اس موقع پر یہ پہلو اور بھی پرکشش اور قابل توجہ بن جاتا ہے جب کہ مولانا آزاد کا یہ خاندانی پس منظر نگاہوں کے سامنے ہو کہ وہ مکۂ مکرمہ کے عربی ماحول میں پیدا ہوئے اور زندگی کے ابتدائی دس برس وہیں گذرے اور پھر اردو میں شخصی دلچسپی اور ذاتی محنت سے شاعری سے انشاء پردازی تک اور صحافت سے خطابت تک وہ کمال پیدا کیا کہ اُردو کی تاریخ ان کے تذکرہ کے بغیر مکمل ہی نہیں ہو سکتی، ان کے معاصرین اور بعد کے ناقدین (خواہ حلیف ہوں یا حریف) سب کے قلم نے ان کے "ادبِ اُردو" کی پیشانی کو والہانہ عقیدت و احترام اور گہری عظمت و محبت کے ساتھ بوسہ لیا ہے۔ اس سلسلہ میں کس کس کا تذکرہ کیا جائے، بس نمونہ کے لئے دو ہی مثالیں لیجئے، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ تحریر فرماتے ہیں:۔

"ان کی ادبی شخصیت کی وسعت اور بلندی دونوں کا پوچھنا ہی کیا، ہزارہا صفحات پر چھاپ لگی ہوئی ہے، ان کی انفرادیت کی، ان کے قلم کے بانکپن کی، ان کی خدمتِ تخلیق کی، زبان کے باب میں کیسا ملکہ لے کر آئے تھے، لکھنؤ میں مستقل قیام کچھ زیادہ لمبا نہیں رہا تھا، چند مہینے ہی تو شاید رہے تھے، لیکن زبانِ لکھنؤ کی نزاکتوں پر وہ عبور حاصل کر لیا کہ جیسے سدا کے لکھنوی ہیں۔" (اُردو کا ادیبِ اعظم، صفحہ ۲۶)

پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں:-

"جدید اُردو نثر، عربی اور فارسی سے جو کچھ لے سکتی تھی وہ ابوالکلام نے لے لیا، عرب کے سوزِ دروں اور عجم کے حسن طبیعت، دونوں کو اردو میں سمو لینا اور اُردو کو عربی اور فارسی کا غلام نہ ہونے دینا معمولی کام نہیں ہے، مولانا آزاد کی نثر سے یہ کام ختم ہو گیا اور اقبال کی نظم سے۔ اب اُردو نثر کی ترقی کے لئے جو امکانات ہیں وہ عالمی ادب خصوصاً انگریزی سے لئے جا سکتے ہیں مگر اچھی اُردو نثر میں عربی اور فارسی کے اثرات جس طرح حل ہو گئے، ان کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا پڑے گا، اس وجہ سے مولانا ابوالکلام آزاد کے جوشِ قدح سے بزمِ ادب میں ہمیشہ چراغاں رہے گا۔"

(ابوالکلام آزاد، ادبی و شخصی مطالعہ، صفحہ ۵-۶)

مولانا آزاد نے اردو صحافت اور اخبار نویسی کو اپنی جودتِ طبع اور نیرنگِ خیالی سے جو نیا رنگ و روپ، نیا لب و لہجہ، نیا انداز اور نیا آہنگ دیا، اس پر مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے یہ تبصرہ خوب کیا ہے :-

" ۱۹۱۲ء میں الہلال افق کلکتہ سے طلوع ہوا، اس نے اُردو صحافت کی جیسے دنیا ہی بدل دی، صورت و سیرت، مغز و قالب، سب میں اپنے پیش رو اور معاصر ہفتہ واروں سے بالکل مختلف اور کہیں زیادہ شاندار اور جاندار، چھپائی، کاغذ، تصویریں، سب کا معیار اعلیٰ، رنگین سرورق پر ایڈیٹر کا نام یوں درج ہوتا " احمد المکنّیٰ بابی الکلام الدّہلوی "، یہ المکنّیٰ کے صحیح تلفّظ اور معنی کے لئے صراح و قاموس کی ورق گردانی کرنی پڑی، اور " ایڈیٹر " کہاں، اس کی جگہ " مدیر مسئول، محرر خصوصی اور رئیس قلم تحریر " " جریدہ " کی جگہ " مجلہ " ولایتی ڈاک کی جگہ " برید فرنگ " " حیرت انگیز کی جگہ " محیر العقول " قسم کے خدا جانے کتنے نئے اور بھاری بھرکم لغات اور نئی ترکیبیں، نئی تشبیہیں نئے استعارے اور نئے اسلوب بیان ہر ہفتے اس ادبی و علمی ٹکسال سے ڈھل ڈھل کر باہر نکلنے لگے اور جاذبیت کا یہ عالم تھا کہ نکلتے ہی سکۂ رائج الوقت بن گئے "

(اُردو کا ادیبِ اعظم، صفحہ ۱۵)

یہ بات یہاں قابلِ ذکر ہے کہ جو لوگ ذہین اور نابغۂ روزگار ہوتے ہیں ان کے بعض افکار و نظریات اور خیالات و تصورات سے دیگر اہلِ فکر و نظر کے اختلافات، زمانہ کی روش میں داخل ہے، مولانا آزاد کی اونچی اور بلند و بالا شخصیت کو بھی اس سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا، مزاجی، فکری، علمی، تحقیقی، لفظی، ادبی اور سیاسی، ان میں سے ہر ایک پہلو سے کسی نہ کسی کو ان سے اختلاف ہو سکتا ہے، یہ اختلاف تو فطری ہے لیکن اس اختلاف نے نہ تو ان کے فکری قد کو چھوٹا کیا اور نہ ہی ان کی "حیثیت عرفی" میں کوئی فرق آنے دیا، وہ اپنے سماج میں بڑے تھے، بڑے رہے اور بڑے ہیں، اردو کے سلسلہ میں جو انہوں نے مختلف زمانہ میں مختلف انداز سے نئی اور نرالی راہ دکھائی ہیں، اس میں بھی ان کی بڑائی اور بلند نگاہی صاف نظر آ رہی ہے، اس سلسلہ میں انہوں نے جو کچھ کہا، لکھا اور بتایا، اس کی حیثیت "چراغ راہ" اور "نشانِ منزل" کی ہے، جس کا سرسری اندازہ تو آپ کو اوپر کی سطروں سے ہوا ہوگا۔ مگر میں اب یہ چاہتا ہوں کہ اُردو کے بارے میں مولانا آزاد کے جو افکار و خیالات ہیں، ان کو پھیلا کر بیان کرنے کی بجائے نہایت اختصار کے ساتھ سلسلہ وار بیان کئے جائیں، اس بیان کی حیثیت بھی کسی مضمون کے عنوان ہی کی ہوگی، جسے اصحاب فکر و دانش وسعت دے کر دریا کا ہم پلہ بنا سکتے ہیں اور سمیٹنا چاہیں تو "دریا بکوزہ" کا مصداق بھی بنا سکتے ہیں۔

زیرِ نظر موضوع سے متعلق مولانا آزاد کی باتیں تو بہت سی ہیں

مگر میرے خیال میں یہ باتیں مختلف کتابوں میں بکھری ہوئی ھیں، ایک کتاب جس میں اختصار و جامعیت کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے، وہ ہے "اردو کی ترقی میں مولانا ابوالکلام آزاد کا حصّہ ـــــ ایک تاریخی و تحقیقی جائزہ"، کتاب کے مصنف ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری ہیں، ڈاکٹر شاہ جہاں پوری کے بارے میں خلیق انجم نے بجا طور پر لکھا ہے کہ :

> "وہ خود عالم، ادیب اور نقّاد ہیں، خدا نے انہیں ان تمام صلاحیتوں سے نوازا ہے، جو مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت اور کارناموں کو سمجھنے کے لئے ضروری ہیں اگر میں مولانا ابوالکلام آزاد کے مدّاح اور معتقد ادیبوں اور نقادوں کی فہرست مرتب کروں تو ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری کا نام دو تین ناموں میں ہوگا۔" (اُردو کی ترقی میں مولانا آزاد کا حصہ، صفحہ ۱۶ دہلی ایڈیشن)

یہ کتاب سب سے پہلے ادارۂ تصنیف و تحقیق پاکستان، کراچی سے ۱۹۸۸ء میں (۱۴۴) صفحات پر شائع ہوئی، بعد میں انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی نے اسی سال جناب خلیق انجم کے وقیع و بلیغ اور بسیط و عریض "پیش لفظ" کے ساتھ (۱۱۲) صفحات پر شائع کیا، اردو زبان کی ترقی میں مولانا ابوالکلام آزاد کی جو خدمات رہی ہیں، ان کے افکار کی جو ایک دنیا ہے، علمی افادات کا جو وسیع تر دائرہ ہے، ان سب کو یکجا سمجھنے اور معلوم کرنے میں یہ کتاب "سنگ میل" کا درجہ رکھتی ہے اور یہ سطریں لکھتے ہوئے نہ جانے کیوں یہ خواہش

سینہ میں مچل رہی ہے کہ کاش مولانا آزاد کے نام پر قائم ہونے والی نیشنل اردو یونیورسٹی "نیک فال" یا "گائڈ بک" کے طور پر اس کتاب کی بڑی تعداد میں شایانِ شان اشاعت سے اپنے اشاعتی اور تعلیمی سفر کا آغاز کرتی تو اس سے یونیورسٹی کے خاکوں اور منصوبوں میں جہاں رنگ بھرنے میں مدد ملتی "رہنمایانہ خطوط" متعین ہوتے، اس کے ساتھ یہ کتاب مولانا آزاد کی خدمتِ اردو کی "عظیم یادگار" بنے رہنے کے علاوہ ان لوگوں کے لئے "انمول تحفہ" بھی بنتی جو اردو کی نسبت اور محبت میں اردو یونیورسٹی کے نئے چمن میں سیر کے لئے آتے جاتے ہیں، آزاد سے متعلق یہ کتاب ہاتھ میں آتے ہی شجیع اپنے اس شعر کے ساتھ یاد آتے ؎

شجیع آج سیرِ چمن کو گئے تھے
بہت ان کے نقشِ قدم یاد آئے

مولانا آزاد نے اردو کے سلسلہ میں جو راہیں دکھائی ہیں، ان کا اندازہ زیرِ تذکرہ کتاب (اردو کی ترقی میں مولانا آزاد کا حصہ) کے درج ذیل عنوانات سے ہو سکے گا۔

(۱) دعوتی اسلوب (۲) علمی اسلوب (۳) ادبی اسلوب، (۴) بنیادی اسلوب (۵) خدمتِ زبان (۶) لغات ۔ زبان کی علمی و فنی مباحث پر ایک نظر (۷) لسان الصدق اور اس کا دائرہ بحث، (۸) ترقی اردو (۹) تنقید (۱۰) علمی مذاق کی اشاعت (۱۱) دیسی اور ولایتی الفاظ (۱۲) ترقی اردو اور تراجم علوم و فنون (۱۳) اصطلاحات سازی (۱۴) طریق طباعت (۱۵) اردو رسم الخط (۱۶) املا اور

علاماتِ تحریر (۱۷) مستی و تحریک کی بحث (۱۸) انجمن ترقی اُردو اور دیگر ادارے (۱۹) مولانا آزاد کی ادبی و فنی عظمت کی بنیاد۔

ان عنوانات کے تحت ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری نے مولانا آزادؒ کے نقطہ ہائے نظر کو جس خوبی، کمال اور استدلال سے اجاگر کیا ہے وہ ہر محبِّ اردو کے لئے زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہر دور میں "پیغام" ہے۔ اس پیغام کے بعد صرف ایک ہی "کام" باقی رہ جاتا ہے۔ اس کام کا انحصار نہ تو اردو کو فلاں فلاں ریاست میں سرکاری درجہ دینے کے لئے لاکھوں آدمیوں کے دستخط کے حصول پر ہے، نہ ہی "گجرال کمیٹی" پر جس کے گجروں کو کملائے، مرجھائے، باسی اور بوسیدہ ہوئے مدّت بیت چکی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اپنے وطن ہندوستان میں رہتے ہوئے اردو کے لئے سرکاری طور پر جو کچھ ہم کر سکتے ہیں اس سے غفلت برتیں اور جی چرائیں، حوصلہ و ہمت اور جرأت و قوت سے کام نہ لیں۔ اصل میں اس "خارجی کوشش" کے ساتھ مولانا آزاد کا داخلی حیثیت سے جو پیغام اور بتایا ہوا کام ہے، وہ یہ ہے کہ:

> "ہمارے نوجوان کئی عالمی زبانوں میں عبور حاصل کرتے ہیں، لیکن اپنی ملکی زبان "اردو" سے غفلت برتتے ہیں، حالانکہ مہذّب دراصل وہی شخص ہے جو اپنے قومی اور مذہبی لٹریچر سے واقف ہو، جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اپنی ملکی اور قومی زبان کی تحصیل

کی بھی سعی کرنی چاہیئے۔ (اُردو کی ترقی میں مولانا ابوالکلام آزاد کا حصّہ، صفحہ ۱۷۔۔۔۷ پاکستانی ایڈیشن)

ہندوستان میں خواہ کوئی بھی سیاسی جماعت برسرِ اقتدار ہو، مجاہد آزادی اور قومی قائد مولانا آزاد نے سیاسی سطح پر اُردو کو ترقی اور استحکام دینے اور اسے خوب سے خوب تر بنانے کے لئے جو بنیادی اور اصولی بات ارشاد فرمائی تھی، وہ آج بھی ہر محبِّ وطن اور ہر ہمدرد اردو کے لئے "مشعل راہ" ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ:

"انجمن ترقی اُردو (دہلی) نے ۱۵ر فروری ۱۹۵۸ء کو دہلی میں اردو کانفرنس منعقد کی، اس کانفرنس کا افتتاح پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا تھا۔ اس کانفرنس میں زندگی کی آخری عوامی تقریر کرتے ہوئے مولانا آزاد نے کہا: "آپ اُردو کے حامی ہیں لیکن کسی زبان کے مخالف نہیں ہیں، جیسا کہ ابھی میرے دوست پنڈت جی (پنڈت سندر لال) نے کہا، یہاں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو ہندی کا مخالف ہو..... یہی صحیح اسپرٹ ہے، اور اس اسپرٹ سے مل کر راستہ صاف ہوتا ہے۔ ملک آزاد ہوا، وقت آیا، دستور بنا، اسمبلی میں کافی بحث ہوئی اور اکثریت کے ساتھ ہندی کو ملک کی زبان تسلیم کرلیا گیا، جس کے نتیجے میں اردو کی حیثیت میں ایک بنیادی

انقلاب آگیا اور اردو کی بات ایک رقیب کی حیثیت سے کم ہو گئی۔ اب ہر ہندوستانی کا جو آئین کا وفادار ہے، فرض ہے کہ اسے مانے، وہ اس کے خلاف نہیں جا سکتا.... ہندی کو جو جگہ ملنی تھی وہ اسے مل گئی۔ اب ہر ہندوستانی کا خاص فرض ہے کہ اس کے آگے سر جھکائے، لیکن اس کے ساتھ ہی اردو کی جو جگہ ہے وہ اسے ملنی چاہیئے..... مجھے یقین ہے کہ کانفرنس جس مقصد کے لئے بلائی گئی ہے، اس میں اسے کامیابی ہوگی اور جب کہ وزیر اعظم (پنڈت نہرو) نے اس کانفرنس کا افتتاح کیا ہے تو یقیناً یہ اپنے مقصد میں ناکام نہیں رہے گی۔"

(آزاد کی تقریریں، مرتبہ انور عارف، دہلی ۱۹۶۱ء صفحہ ۲۹۲)

بہر حال اُردو والوں کو اردو کے سلسلہ میں پُر امید رہنا چاہیئے مولانا ابو الکلام آزاد نے بہت پہلے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ اُردو کی ترویج و ترقی اور استحکام و استقلال کے لئے جو راہیں دکھائی تھیں، کتابت، طباعت، علمی و تحقیقی مواد، لفظوں کے بہتر اور معیاری انتخاب، صحیح املا اور صحیح ترجمہ کا اہتمام، قارئینِ اردو کی ذہنی اور فکری سطح کی بلندی، ہیجانی اور انتشاری ادب سے گریز، غیر ضروری اور بعض مضحکہ خیز جدیدیت سے اجتناب، اردو کی ہر کتاب اور ہر جریدہ و اخبار کو ظاہری اور باطنی خوبیوں کے اعتبار سے بام عروج پر پہونچانا، اُردو صحافیوں، شاعروں اور قلم کاروں، خطّاطوں، کاتبوں

ناشروں کی ہمہ جہتی حیثیتوں سے حوصلہ افزائی کے جوخاکے ضابطے اور منصوبے، آزاد کے یہاں ملتے ہیں، انہیں پوری قوت اور عزم و ارادہ کی پختگی کے ساتھ روبہ عمل لانے کی ضرورت ہے، جب تک زندگی ہے اور زندگی کے مسائل ہیں "کشمکش" ساتھ ساتھ ہے، چراغ کو بجھانے کے لئے ہوائیں چلتی رہیں گی، امید کی کشتی کو ڈبونے کے لئے خوف کا طوفان اٹھتا رہے گا مگر "رازِ حیات" کو پانے والے آزاد ہر اُردو کے جیالے، متوالے اور دیوانے سے مخاطب ہیں :۔

"یہ سچ ہے کہ ہوا چراغ کی لَو کو بجھا دیتی ہے، مگر کیا
یہ بھی سچ نہیں کہ انگیٹھی کے شعلوں کو بھڑکا بھی دیتی
ہے"

وہ یہ بھی کہتے ہیں :۔

"سچائی کے شعلے، مخالفت کے طوفان سے اور زیادہ
بھڑکتے ہیں اور یہ معجزہ صرف صداقت کے درخت
ہی میں ہے کہ جس قدر اسے چھانٹا جائے اتنا ہی
اور زیادہ نشو ونما پاتا ہے"

وہ اعلان کرتے ہیں :۔

"دنیا میں کامیابی اعمال کا نتیجہ ہے اور اعمال کے لئے
پہلی چیز امید ہے"

آئیے! ایسے "آزاد" کو جس نے آزادی کی جنگ میں قائدانہ کردار ادا کیا اور آزادی کے بعد بجا طور پر اپنی عظیم شخصیت کے پسِ منظر میں پہلے "وزیر تعلیم" بنائے گئے، ان کی تمامتر

صلاحیتوں، قابلیتوں، کارناموں اور اردو کے محسنِ اعظم بلکہ "شہیدِ جستجو" ہونے کی حیثیت کو پیشِ نظر رکھ کر اس شعر کے ذریعہ خراجِ عقیدت پیش کریں کہ ؎

بھلا سکیں گے نہ اہلِ زمانہ صدیوں تک
تیری وفا کے تیرے فکر و فن کے افسانے

اور یہ بھی کہ ؎

جو عالمِ ایجاد میں ہے صاحبِ ایجاد
ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ

ولی دکنی اور اصلاحی پیغام

اے ولی جو کہ ہیں بلند خیال
شعر میرا پسند کرتے ہیں

ولی دکنی، شعری دنیا کا ایک چھوٹا سا نام ہے، مگر اس چھوٹے سے نام کو ان کے بڑے کام نے شعری دنیا میں انہیں امام کا مقام عطا کیا ہے، آج تک یہ طے نہ ہوسکا کہ ولی کب، کہاں اور کس سن میں پیدا ہوئے، وفات کا صحیح سال کون سا ہے، اصلی وطن احمد آباد گجرات ہے یا اورنگ آباد دکن، مگر اس اختلاف کے باوجود ایک بات پر سب کا اتفاق ہے کہ ولی اردو کے پہلے غزل گو شاعر ہیں، اردو کے گیسو کو انہوں نے خاص رنگ اور ڈھنگ سے سنوارا ہے، اردو شعر گوئی کو انہوں نے وقار اور اعتبار دیا ہے، آج سے کم و بیش تین سو سال قبل مخصوص ماحول میں "نئی زبان اردو" کو ایک خاص سمت، جہت اور رخ دینے کی کامیاب کوشش کی ہے، اس زمانہ میں جب کہ فارسی زبان کا طوطی بولتا تھا، ہندوستان میں یہی زبان شرفا کی سمجھی جاتی تھی، نثر ہو کہ نظم دونوں میں اسی زبان کا چرچا تھا، ولی نے للکار کر کہا ہے:

عرفی و انور و خاقانی
مج کون دیتے ہیں سب حساب سخن

اردو غزل گوئی کے اولین سفیر و نقیب بلکہ "مجددِ عصر" نے
ہندوستان میں فارسی کے سحر کو یہ کہہ کر توڑا ؎

ہم پاس آ کے بات نظیری کی مت کہو!
رکھتے نہیں نظیر آپس کے سخن میں ہم۔

ولی کی زبان پر یہ نغمہ بھی آیا ؎

جیوں گل شگفتہ رو ہیں سخن کے چمن میں ہم
جیوں شمع سر بلند ہیں ہر انجمن میں ہم
ہیں داستاں برہ منیں مجھ یاد کئی ہزار
استاد بلبلاں کے ہیں، ہر یک چمن میں ہم
خوباں جگت کے جیوں سوں ملتے ہیں ہم ستی
کامل ہوئے ہیں بس کے محبت کے فن میں ہم

ولی کا اپنے اشعار کے بارے میں یہ پر اعتماد لب و لہجہ بھی دیکھئے ؎

ہر سخن تیرا لطافت سوں ولی
مثل گوہر زینت ہر گوش ہے
لگے پھیکی نظر میں اے ولی دوکانِ حلوائی
اگر ہو جلوہ گر بازار میں شیریں سخن میرا

ولی تو بحرِ معنی کا ہے غواص
ہر اک مصرع ترا موتیاں کی لڑ ہے
ہوا جو خادمِ شاہِ ولایت
ولی ہے والیِ ملک سخن ہے

ولی جس نے سنا میرے سخن کو
زباں پر اس کے ذاکر آفریں ہے

ولی تجھ شعر کوں سنتے ہوئے ہیں مست اہلِ دل
اثر ہے شعر میں تیرے شرابِ پرتگالی کا

دکھن میں تیرے شعر سن شوقی ہوئے تیرے ولی!
جس کے لگیا ہے دل کے تیں خوش شعر تجھ دیوان کا

آج کل کے لحاظ سے ولی کی شاعری کی زبان کے بہت سے الفاظ متروک ہیں، اور لوگوں کے لئے ناقابلِ فہم بھی ہیں، لیکن ولی نے جس زمانہ میں شاعری کی تھی، اس زمانہ کے اعتبار سے ان کی زبان عصری تھی، شستہ اور شگفتہ تھی، بعض اشعار پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زبان تین سو سال پرانی نہیں، بلکہ آج کی نئی زبان ہے، یہ ان کے فن کا عروج اور زبان دانی کا کمال تھا، مستقبل میں اردو کی بدلنے والی قدروں پر عارفانہ نظر تھی ولی کا یہی وہ اختراعی ذہن تھا، جس کے باعث بعض اہلِ قلم نے یہ لکھا ہے:

"ولی کے بعض اشعار آج کل کی زبان اور مذاقِ سخن کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں، اور جن کو سن کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ آج سے تین سو برس پہلے کی زبان ہے" (دیباچہ دیوانِ ولی از حیدر ابراہیم سایانی صفحہ ۱۰۰) ——— "جو زبان ولی نے برتی ہے، وہ قریب قریب ڈیڑھ سو برس بعد دوسروں کو نصیب ہوئی ہے، درحقیقت ولی نے شاعری کی ہی نہیں، بلکہ شاعری سکھائی ہے ان کے تغزل کی تقلید آج سب کے لئے لازمی ہے، جو ان کے تغزل کی حدود میں رہ کر غزل کہتا ہے، وہ غزل کہلاتی ہے، ورنہ

غزل کی تعریف سے باہر ہے،، (ایضاً صفحہ ۱۱)

ولی کے زمانے میں ان کی غزلیں اِس قدر مشہور ہونے لگی تھیں کہ لوگ انہیں اپنے اپنے علاقہ بطورِ تحفہ لے جانے لگے تھے، ولی اس سے خوش تھے اور خوش ہوکر ہی کہا تھا ؎

ولی تجھ طبع کے گلشن میں جو کوئی سیر کرتے ہیں
وہ تحفہ لے کے جاتے ہیں مری گفتار ہر جانب

اساتذہ کی صف کے شعراء نے بھی ولی کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے، مرزا سودا کے شاگرد شاہ حاتم کہتے ہیں ؎

حاتم یہ فنِ شعر میں کچھ تو بھی کم نہیں!
لیکن ولی، ولی ہے جہاں میں سخن کے بیچ

آبرو، ولی کی آبرو کو اِس طرح بڑھاتے ہیں ؎

آبرو شعر ہے ترا اعجاز
پر ولی کا سخن قیامت ہے

میر کے اعتراف کا یہ انوکھا انداز بھی دیکھئے ؎

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

ولی دکنی کا نام مختلف کتابوں میں مختلف انداز سے ہے، ایک میں ہے شمس الدین لقب، ولی اللہ نام، ولی تخلص (گل رعنا صفحہ ۸۷) ایک دوسری کتاب میں ہے، شمس ولی اللہ، ولی محمد، محمد ولی، یا ولی الدین ولی۔ (دیوانِ ولی صفحہ)

ایک اور کتاب میں ہے:

"ولی محمد، محمد ولی اللہ، شاہ ولی اللہ،، (ولی۔ فن و شخصیت اور کلام

صفحہ ۴۴) والد کا نام شریف محمد بن شاہ نصر اللہ تھا، اس بات پر تو سب کا اتفاق ہے کہ ولی کا انتقال احمد آباد گجرات میں ہوا، اور وہیں نیلی گنبد کے کے قریب موسیٰ سہاگ اور شاہی باغ کے درمیان مدفون ہوئے، بعض لوگ ان کی جائے پیدائش بھی احمد آباد بتاتے ہیں، اور ان کا خاندانی تعلق شاہ وجیہ الدین گجراتی سے قائم کرتے ہیں، تاہم اکثر محققین کی رائے یہ ہے کہ وہ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے، مشہور محقق اور ادیب مالک رام کے بموجب ولی دکنی کی پیدائش اورنگ آباد میں ۱۰۷۹ھ مطابق ۱۶۶۸ء میں ہوئی، اور وفات ۴ شعبان ۱۱۱۹ھ مطابق ۲۰ اکتوبر ۱۷۰۷ء میں ہوئی، (تذکرہ ماہ وسال) اور صاحبِ "گل رعنا" کے بموجب تقریباً ۱۰۷۹ھ میں پیدا ہوئے، اور تقریباً ۱۱۵۵ھ میں وفات پائی (صفحہ ۸۷، ۸۹)۔

تعلیم شاہ وجیہ الدین کی خانقاہ کے مدرسہ واقع احمد آباد میں ہوئی، یہاں شاہ وجیہ الدین کے خاندان ایک سجادہ نشین کے ہاتھ پر "طریقۂ قادریہ شطاریہ" میں بیعت بھی کی، شاید پہلے کے آبائی تعلق، تعلیمی نسبت اور روحانی سلسلہ اور احمد آباد اور سورت سے محبت اور یہاں بار بار کی آمد و رفت سے انہوں نے اپنا ایک وطن گجرات اور اورنگ آباد میں مستقل سکونت اور قیام کی وجہ سے ایک دوسرا وطن دکن کو بھی بتایا ہے، جیسا کہ ان کے اِس شعر سے ظاہر ہے ؎

ولی ایران و توران میں ہے مشہور
وطن گو اس کا گجرات و دکن ہے۔

ولی کا قیام دہلی میں بھی رہا ہے، ان کے بعض اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ دِلی میں ان کا دِل خوب لگا، دلی کے قیام میں وہ اپنی شاعری کے سبب یہاں

والوں پر اثر انداز ہوئے اور زبان کے سلسلہ میں خود انہوں نے وہاں کے اثر کو قبول کیا، دلی میں شاہ سعد اللہ گلشن نقشبندیہ سلسلہ کے ایک بہت نامور اور پرگو شاعر تھے، ولی نے ان کے فیضِ صحبت سے بھی فائدہ اٹھایا، ولی عشق و محبت اور حسن جمال کے شاعر ہیں، استعارے اور تشبیہات بکثرت استعمال کرتے ہیں، اسی لئے بعض لوگوں نے انہیں اردو شاعروں میں سب سے بڑا سراپا نگار کہا ہے، یہ حقیقت ہے کہ ولی کے یہاں فکر و فلسفہ کی باتیں کم ملتی ہیں، تاہم اپنی طبیعت، بزرگوں کی صحبت اور بیعت و ارادت کی لذتِ آشنائی کے سبب ولی اپنی شاعری میں اخلاق کا درس ضرور دیتے ہیں، اور اصلاحی باتوں کو بھی وہ اپنا موضوع بناتے ہیں، ذیل میں ان کی شاعری کے اسی حصہ کا انتخاب ہے۔

ولی کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنی ذات اور صفات کے اعتبار سے تنہا اور یکتا ہیں، اس کا کوئی ساجھی اور شریک نہیں، اس کی قدرت کے جلوے کائنات میں بکھرے ہوئے ہیں، مگر اس کو کوئی بشر اپنے علم و ادراک اور حدود و قیود میں لا نہیں سکتا۔ ؎

ولی اس کی حقیقت کیوں کے بوجھے
کہ جس کا بوجھنا حدِ بشر نہیں

ولی کے ذوق و شوق کا حال دیکھئے ؎

نام تیرا ولی نے اے اکمل
شوق سوں وِرد صبح و شام کیا

ان کی غیرت ان سے یہ بھی کہلاتی ہے ؎

اے ولی غیر آستانۂ یار جبہ سائی نہ کر خدا سوں ڈر

یادِ خداوندی ان کا بہترین وظیفہ ہے ؎

یاد کرنا ہر گھڑی اس یار کا
ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا

ان کا طاقتور احساس یہ بھی ہے ؎

دونوں جہاں ہوئے ہیں فراموش اے ولی
رکھتے ہیں جب سے یاد تری مَن میں ہم

خدا کی مدح وثنا میں ان کی زبان اِس طرح بھی زمزمہ سنج ہے ؎

تنہا نہ ولی خلق میں کرتا ہے ترا وصف
دفتر لکھے عالم نے تیری مدح وثنا کے

اللہ کی محبت کے ساتھ دل عشقِ نبوی ؐ سے بھی سرشار رہنا چاہیے ؎

نامِ نبی پہ جو کوئی دِل سے فِدا نہیں
راضی قسم خدا کی ہے اس پر خدا نہیں

صاف دل رہنے کی تلقین کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں ؎

آئینے سے سنی ہے میں نے یہ بات !
صاف دِل وقت کا سکندر ہے

اسی مفہوم کو وہ اِس طرح بھی بیان کرتے ہیں ؎

مج کو پہونچی ہے آرسی سوں یہ بات
صاف دِل وقت کا سکندر ہے

وہ اپنے ایک دوسرے شعر میں کہتے ہیں ؎

نکال خاطر فاتر سے جامِ جم کا غم !
صفا کر آئینۂ دل سکندری یہ ہے

اس مفہوم کو وہ یوں بھی ادا کرتے ہیں ؎

صافی دلوں کو بیٹھنا ہے کسبِ عزت کا وِلے!
دریا سے ہو کر ہم نشیں پہونچا ہے موتی آب کو

وہ یہ بھی تلقین کرتے ہیں ؎

صاف دِل کو اگر مدام رکھو
جامِ جمشید کا مقام رکھو

ولی کہتے ہیں جن کو حق کی جانب سے فکرِ رسا بخشی جاتی ہے وہ سخن فہم ہوتا ہے، اور بلاشبہ یہ بہت بڑی دولت اور نعمت ہے ؎

اے ولی وہ سخن میرا بوجھے
حق نے بخشی ہے جس کو فکرِ رسا

انسان کو چاہیئے کہ ہمت بلند رکھے، اور مضمون تازہ کے لئے اپنے خالق سے امیدوار رہے، اس کی توفیق شاملِ حال رہی تو مضمون تازہ بند نہیں ہو سکتا ؎

راہ مضمون تازہ بند نہیں
تا قیامت کھلا ہے بابِ سخن

شاعر کے کلام میں دَرد پنہاں ہونا چاہیئے ؎

ولی شعر میرا سراپا ہے درد
خدوخال کی بات ہے خال خال

ان کا ایک شعر یہ بھی ہے ؎

جس نے بیاں لکھا ہے میرے رنگ درد کا
اس کو خطابِ غیب سے زریں رقم ہوا

ترکِ علائق کی وہ تلقین کرتے ہیں ؎

اے ولی ترکِ علائق دل کو لذت بخش ہے
جو ہے دنیا دار کو فکرِ سرومانِ لذیذ

ولی قلندر صفت کو مال و دولت کی حرص اور آرزو نہیں ہے ؎

ولی کو نہیں مال کی آرزو
خدا دوست دیکھے ہیں زر طرف

ولی کے نزدیک فقر کی دولت بہت بڑی دولت ہے، اس میں لوگوں سے استغنا اور بے نیازی ہے، اور رزاقِ دو عالم سے وابستگی اور اسی کے دروازہ کو کھٹکھٹانا ہے، ایسا شخص دولتِ سکندری کا مشتاق نہیں رہتا ؎

پایا ہے جو کوئی دولتِ فقر!
مشتاق نہیں دولتِ سکندری کا

تاہم فقر اور مفلسی کے درمیان جو فرق ہے، اس سے عارف ولی واقف ہیں، اسی لئے وہ کہتے ہیں ؎

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
حسن کا اعتبار کھوتی ہے

بعض نسخوں میں ہے ؎

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے

وہ یہ بھی کہتے ہیں ؎

باعثِ رسوائی عالم ولی
مفلسی ہے مفلسی ہے، مفلسی

اس کے ساتھ ولی کو روشن دلوں نے یہ خبر بھی دی ہے ؎

مجھ کو روشن دلوں نے دی ہے خبر
کہ سخی کا چراغ روشن ہے

ایسی خبر یا حکمت، دانائی اور نکتہ کی بات کا پتہ تو روشن قلب صاحبِ دل اور اہلِ معانی ہی دیتے ہیں، اسی لئے اس راز کو پاکر ولی خدا سے یہ دعا کرتا ہے ؎

الٰہی رکھ مجھے تو خاکِ پا اہلِ معانی کا
کہ کھلتا ہے اسی صحبت سے نسخہ نکتہ دانی کا

یہی وہ حقیقت ہے جس کے سبب وہ اپنے پڑھنے والوں کو معرفت کی راہ دکھاتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ ایک انسان اگر علم و فن میں کمال حاصل کرلے مگر اس کے اندر خود آگہی اور خدا شناسی نہیں تو کچھ بھی نہیں ؎

بغیر از معرفت سب بات میں گرکی اچھے کامل
ولی سب اہلِ عرفاں اس کو کامل نہیں گنتے

دوست کی دوستی میں وفاداری ہونی چاہئے، وفا کی مشق سے وفاداری پختہ ہوتی ہے اور دوستی کی صفت کمال درجہ حاصل کرتی ہے ؎

لے ولی ہر آن کر مشقِ وفا
ہے وفاداری کمالِ دوستی

اسی سلسلہ میں ان کی یہ بات بھی ہے ؎

وفاداری نے دلبر کی بجھایا آتشِ غم کوں
گرمی دفع کرتا ہے گلاب آہستہ آہستہ

اسی حقیقت کو ایک تمثیل سے سمجھاتے ہیں ؎

دسا نہیں جو گل بے فا میں رنگِ وفا
تو یونچہ شور میں ہیں بلبلاں خوش آہنگ

ولی کی آرزو ہے ؎

اے ولی آرزو سدا ہے یہی
کہ ملے سوں دو رفیق شفیق

ہر ایک سے ملنا اور متواضع رہنا ضروری ہے، اور کشتی دل کو سنبھال کر رکھنا یہ قلندری ہے ؎

ہر ایک سے مِل، متواضع ہو، سروری یہ ہے
سنبھال کشتی دل کو قلندری یہ ہے

ان کا نظریہ اور فلسفہ یہ بھی ہے ؎

جو کئی ہر رنگ میں اپنے کوں شامل کر نہیں گنتے
ہمن سب عاقلاں میں اس کوں عاقل کر نہیں گنتے
مدرس مدرسے میں گر نہ بولے درس، درشن کا
تو اس کوں عاشقاں استاد کامل کر نہیں گنتے

ولی نے عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی دونوں کا تصور دیا ہے، پھر اس کے بعد انہوں نے کہا ہے ؎

گر نہیں رازِ عشق سے آگاہ
فخر بے جا ہے فخرِ رازی کا

نوجوانوں کو وہ ایک کارگر نصیحت فرماتے ہیں ؎

غیرت کو کام فرما، نا آشنا سے مت مِل
اے نوجوان نہیں ہے ہنگامِ خود رسائی

ولی تسکینِ دل اور فکرِ جمعیت کا نسخہ بتاتے ہیں ؎

عالم میں تجھ کوں اے ولی ہے فکرِ جمعیت اگر
ہر دم خیالِ یار سوں ہم خانہ ہو، ہم خانہ ہو

غمزدہ دِل اور ناکام انسان کے لئے ان کا یہ پیغام ہے ؎

ولی ہرگز اپس کے دل کوں سینے میں نہ رکھے غم گیں
کہ برلاوے گا مطلب کو خدا آہستہ آہستہ

خاموشی کے سلسلہ میں ان کی ایک نظم نہایت موثر ہے، جس کے دو شعر یہ ہیں:

ہمیشہ لشکرِ آفات سے رہے محفوظ
نصیب جس کو ہوا ہے شعارِ خاموشی

غزور دل سے بجائے سکوت لے معنی
کہ بے صدا ہے سدا کو ہسار خاموشی

وہ اپنی ایک نصیحت اور خواہش کا اظہار اس طرح کرتے ہیں ؎

صحبتِ غیر میں جایا نہ کرو!
دردمندوں کو کڑھایا نہ کرو

حق پرستی کا ہے اگر دعویٰ
بے گناہوں کو ستایا نہ کرو

اپنی خوبی کے ہو اگر طالب!
اپنے طالب کو جلایا نہ کرو

ہے اگر خاطرِ عشاقِ عزیز
غیر کو شکل دکھایا نہ کرو

ہم کو برداشت نہیں غصے کی
بے سبب غصے میں آیا نہ کرو

پاکبازوں میں ولی ہے مشہور
اس سے چہرے کو چھپایا نہ کرو

ولی خلوص نیت کے ساتھ غافلوں کو ہوشیار کرتے ہیں، اور سوتوں کو جگاتے ہیں ؎

غفلت میں اپنا وقت نہ کھو، ہشیار، ہشیار ہو!
کب تک رہے گا خواب میں بیدار ہو بیدار ہو

گر دیکھتا ہے مدعا اس شاہدِ معنی کا دو
ظاہر پریشاں سوں سدا بے زار ہو، بے زار ہو

وہ تو بہارِ عاشقاں ہے جیوں سحر جگ میں عیاں
اے دیدہ وقت خواب تیئں بے دار ہو بیدار ہو

مطلع کا مصرع اے ولی وردِ زباں کر رات دن
غفلت میں اپنا وقت نہ کھو، ہشیار ہو، ہشیار ہو

ولی دکنی، تصوف میں "نور المعرفت" کے نام سے ایک رسالہ تصنیف کر چکے ہیں، اہل اللہ اور صوفیاء کی صحبت میں رہ چکے ہیں، اور جسے ایسا ماحول اور ایسی صحبت میسر آئے، اس میں فکرِ آخرت پیدا ہوتی ہے، وہ ہمیشہ یہ چاہتا ہے کہ اس کی عاقبت "محمود" ہو، اور اس کی زندگی "حسنِ عمل" سے آراستہ رہے یہ تصور ہی دراصل ایک ولی کو ولی بناتا ہے، ولی دکنی ہو یا کوئی اور، ایک مومن ہونے کے ناتے اس کی سب سے بڑی آرزو اور حسین تمنا یہی ہو سکتی ہے کہ دنیا سے جب ہم جائیں تو ہمارا ایمان سلامت رہے، جب یہ وقت آئے گا تو

دنیا کے سارے ساز و سامان، مال و دولت، دوست احباب، اعزہ و رشتہ دار ..... کنارہ کش ہو جائیں گے، منہ موڑ لیں گے، رفاقت چھوڑ دیں گے، عاقبت کی راہ، آخرت کی منزل، اور قبر کی تنہائی میں صرف "حسنِ عمل" ہی کی رفاقت ہوگی، ولی اس حقیقت سے خوب آشنا ہیں، ان کی یہ حقیقت شناسی ان کے ایک شعر سے جلوہ گر ہے، ان کا یہ شعر "صلاحِ نفس" اور "اصلاحِ خلق" یا "اصلاحِ عالم" کے لئے "شاہ کلید" کا درجہ رکھتا ہے، اور حق ہے کہ ان کے اصلاحی پیغام والے مضمون کو اسی شعر پر ختم کیا جائے۔ ؎

ولی منزلِ عاقبت میں تیرا
نہیں کوئی حسنِ عمل بن رفیق

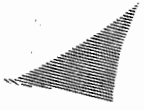

حکیم الشعراء حضرت امجد حیدرآبادی
اور
اُن کی اصلاحی رُباعیات

قرآنِ حکیم، جو اسلامی ادب کا سب سے پہلا اور کامل نمونہ ہے اس میں ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے :-

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۔ (البقرہ : ۲۶۹)

" وہ اللہ جسے چاہے حکمت عطا کرتا ہے اور جسے حکمت عطا ہو گئی، اسے یقیناً خیر کثیر عطا ہو گئی "

اسی کتابِ ہدایت میں ایک جگہ نبیِ مکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ منصبی میں " حکمت کی تعلیم " کا تذکرہ کیا گیا ہے ۔ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۔ (الجمعہ: ۲) ایک دوسری جگہ خدا کی طرف بلانے کے طریقوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ایک طریقہ " حکمت " کا بھی بتایا گیا ہے ۔ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۔ (النحل : ۱۲۶)

آپؐ کا فرمان ہے " حکمت اور دانائی کی بات مؤمن کی میراث اور

اس کی گم شدہ پونجی ہے۔ جہاں اور جس جگہ اسے ملے، وہ اس کے حاصل کرنے کا سب سے زیادہ مستحق ہے۔"

یہ بھی واضح رہے کہ حکمت و معرفت کا تعلق زندگی کے کسی ایک شعبہ اور پہلو سے نہیں، بلکہ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے، اور زندگی کے تمام ہی شعبے اس کے احاطہ میں آگئے ہیں، اسی لئے شعبۂ شعر و ادب کو پیش نظر رکھتے ہوئے اقبالؒ کے "دانائے سُبل، ختمُ الرُّسل، مولائے کُل" محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلّم نے یہ بات بجا طور پر ارشاد فرمائی: "اِنَّ مِنَ الشِّعرِ لَحِکمَۃ"، یعنی بعض اشعار حکیمانہ ہوتے ہیں۔

بڑے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کی زندگی حکمت و معرفت سے معمور ہوتی ہے، اور وہ اپنے اقوال، افعال اور اعمال میں حکیمانہ اور عارفانہ انداز و رجحان اختیار کرتے ہیں، دکن ہی نہیں بلکہ دنیائے اُردو کے مشہور رباعی گو شاعر "حکیم الشعراء حضرت احمد حسین امجدؔ علیہ الرحمہ (۱۹۶۱ - ۱۸۷۸ء) ایسے ہی خوش نصیب لوگوں میں ہیں، جنہوں نے اپنی شعری صلاحیتوں کو صحیح اور تعمیری رُخ دیا اور اپنی رباعیات میں حکمت و معرفت کے بیش بہا مضامین اس خوبی و کمال اور سلیقہ کے ساتھ داخل کئے کہ ان کو پڑھنے والا بے ساختہ بول اٹھتا ہے: ؎

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

حضرت امجدؔ کے تذکرہ کی ابتداء "حِکمت" (جس کا ترجمہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے "تہ کی بات" سے کیا ہے) سے اس لئے کی گئی کہ اُن کی شعری زندگی کا سب سے نمایاں اور ممتاز وصف "حِکمت" ہی ہے،

جس کا اظہار سخن شناس، نامور ادیب و صاحبِ قلم، سید الملّت مولانا سید سلیمان ندویؒ (۱۹۵۳ء ـ ۱۸۸۴ء) نے بھی کیا ہے، جس کا پسِ منظر یہ ہے کہ باوقار علمی و تصنیفی ادارہ "دار المصنّفین"، اعظم گڑھ کے ترجمان "معارف"، میں جب حضرت امجدؔ کا کلام اکثر و بیشتر چھپتا رہا تو بحیثیتِ مدیر سیّد صاحب کی نظر سے گذرتا رہا، سیّد صاحب بتدریج ان کے کلام سے متأثر ہوتے رہے، یہاں تک کہ فروری ۱۹۳۳ء کے "معارف"، کے اداریہ کے ذریعہ حضرت امجدؔ کے نام کے ساتھ "حکیم الشعراء"، کے لقب کا اضافہ کرتے ہوئے سیّد صاحب نے اس طرح اعترافِ کمال کیا کہ :۔

> "معارف کا یہ شیوہ نہیں کہ شاعروں کو خطابات بانٹے، لیکن حضرت امجدؔ کی نو بہ نو حکمت آموز شاعری نے اس کو اعترافِ فضائل پر مجبور کیا اور لفظ "حکیم الشعراء" سے واقعہ کا اظہار کیا گیا ہے"

سچ پوچھئے تو مولانا سیّد سلیمان ندویؒ ہی نہیں بلکہ حضرت امجدؔ کے ہم عصر تمام بڑے شاعروں اور نقّادوں نے ان کی شعری عظمت و رفعت، کلام کی تاثیری قوت اور بحیثیت انسان سوز و گداز، اخلاص و محبّت، نیک نیّتی، شفقت، شرافت، صداقت، سادگی، انکساری اور جذبۂ ہمدردی کو تسلیم کیا ہے، جن میں گرامی قدر علّامہ اقبالؔ، علّامہ علی حیدر طباطبائی، مولانا عبداللہ عمادی، پروفیسر وحید الدّین سلیم، جوشؔ ملیح آبادی، مولانا سیّد مناظر احسن گیلانی، مولانا عبدالقدیر صدّیقی حسرتؔ، نصیر الدّین ہاشمی، ڈاکٹر سیّد محی الدّین قادری زورؔ، مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا شاہ معین الدّین احمد ندویؒ شامل ہیں۔ آخر الذکر نے اپنے تعزیتی مضمون میں لکھا ہے :۔

"حضرت امجد حیدرآبادی تنہا شاعر ہی نہ تھے، بلکہ اس سے زیادہ حکیم و عارف اور صحیح معنوں میں اس دور کے سرمد اور ابوالخیر تھے شاعری کو تو انہوں نے اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا تھا، رباعی گوئی میں اس دور میں یگانہ تھے۔ اکبر اور اقبال کے بعد حکیمانہ شاعری انہیں کے دم سے زندہ تھی، اُن کے بعد اس کا خاتمہ ہوگیا، اس لئے ان کی وفات تنہا دنیائے ادب شاعری کا نہیں بلکہ حقیقتاً دنیائے دل کا حادثہ ہے۔"

(یادگار امجد، مرتبہ پروفیسر اکبرالدین صدیقی، صفحہ ۱۰۲)

مولانا اشرف علی تھانویؒ (۱۹۴۳ - ۱۸۶۳ء) کے بھائی حضرت محمد مظہر تھانویؒ امجد سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہیں سرمد (مشہور صوفی ایرانی شاعر پیدائش ۱۶۱۸ء وفات ۱۶۵۸ء) کہنے لگے تھے، اس سلسلہ میں انہوں نے اپنا نذرانۂ عقیدت اس طرح پیش کیا:-

مدّاح رسولِ پاک احمد ہیں آپ — اور شاہ رباعیات امجد ہیں آپ
توحید میں جمع ہوگئی ہے تثلیث — حسّان ہیں، خیّام ہیں، سرمد ہیں آپ

ڈاکٹر سیّد محی الدّین قادری زورؔ، حضرت امجد کی شخصیت اور فن پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"حضرت امجد کے کلام سے نہ صرف اُردو شاعری فارسی کی ہم پلّہ بن گئی بلکہ حیدرآباد کی عزّت و آبرو میں ایک ایسا اضافہ ہوا، جس پر یہاں کے رہنے بسنے والے ہمیشہ ناز کرتے رہیں گے، گذشتہ دو صدیوں میں وہی ایک ایسے منفرد شاعرِ دکن پیدا ہوئے تھے، جن کا احترام پوری اُردو دنیا

میں کیا گیا، اور جن کی ہندوستان گیر شہرت ہمارے لئے
سرمایۂ افتخار ثابت ہوئی۔" (یادگارِ امجد ص۷۵)

حضرت امجد کی زندگی کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ پندرہ سولہ برس کی عمر میں انہوں نے شاعری شروع کر دی تھی، شاعری میں ابتداءً حبیب لکھنوی اور ترک علی شاہ ترکی سے اصلاح لی اور پھر اپنی طبیعت ہی کو اپنا رہنما بنایا، ایک مدت تک غزل اور نظم کہتے رہے، اس کے بعد رباعیات کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنالیا، اور حقائقِ عالم، فلسفۂ حیات، اخلاقیات، اصلاحیات، خصوصاً مضامین تصوف کو رباعی کے پیرائے میں بیان کرتے رہے، یہ ایک اہم بات ہے کہ امجد کی شاعری کا اصل سرچشمہ قرآن و حدیث ہے، یہ بھی علم میں رہے کہ ان کی رباعیوں کا پہلا مجموعہ ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا تھا، ابتداء کی زیادہ تر غزلیں اور کچھ رباعیاں ۱۹۰۸ء کی طغیانی رود موسی کی نذر بھی ہوگئیں تھیں۔

اس موقع پر اس کا اظہار بے جا نہیں ہوگا کہ رباعی خاص بحر ہے، اور اس کے خاص اوزان ہیں، اسی بحر اور انہیں اوزان میں رباعی کہی جاتی ہے، مثنوی اور غزل کی طرح "رباعی" کا نام بھی عربی سے نکلا ہے، جس کے لغوی معنی چار چار کے ہیں، مگر یہ تینوں چیزیں سرزمینِ ایران سے تعلق رکھتی ہیں، اُن میں رباعی سب سے زیادہ مشکل چیز ہے، چار مصرعوں میں ایک مکمل مضمون اس انداز سے بیان کرنا کہ سامعین پر اس کا خاص اثر ہو، یقیناً ایک بڑا فن اور ہنر ہے، اس سلسلہ میں اصحابِ فن نے لکھا ہے کہ چوتھا مصرع خاص کر پہلے مصرعوں سے زیادہ شاندار اور اہم ہوتا ہے اسی مصرع پر شاعر کے خیال کی تان ٹوٹتی ہے، یہ مصرع ایسا ہونا چاہئے

کہ سننے والے کے دماغ میں اس کی گونج دیر تک باقی رہے۔

فارسی زبان میں بہت سے رباعی گو شاعر اپنا کمالِ فن دکھا چکے ہیں، سلطان ابوسعید ابوالخیر، عمر خیام، سحابی نجفی اور سرمد سب سے زیادہ مشہور ہیں، جہاں تک تعلق اردو زبان کا ہے تو اس میں رباعیات بہت سے شعراء نے لکھی ہیں، مگر "رباعی گو" کی حیثیت سے کوئی شاعر مشہور نہیں ہوا، انیس و دبیر اور شاد عظیم آبادی کی بعض رباعیاں بلاشبہ دل چسپ ہیں مگر امجد کی رباعیوں کو اردو دنیا میں جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی، شاید اس مرتبہ تک کسی دوسرے شاعر کی رباعیاں نہیں پہنچ سکیں۔

بعض اہلِ فن کا خیال ہے کہ امجد کی رباعیوں میں وہی رنگ ہے جو سرمد کی رباعیوں میں ہے، اس لئے اکثر لوگ انہیں ان کی زندگی میں "زندہ سرمد" کہا کرتے تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے پڑھنے کا انداز بھی عجیب مستانہ تھا، جس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ جو خیالات بیان کر رہے ہیں، وہ ان کے دل کی آواز ہیں، سچ ہے:

؎ یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

کسی شاعر کے کلام کے مطالعہ سے پہلے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ اس کی نجی زندگی کے حالات پر ایک نظر ڈال لی جائے، کیونکہ اکثر اوقات میں اشعار، خیالات اور حالات کے پابند ہوتے ہیں اور دونوں کے درمیان گہرا معنوی ربط ہوتا ہے ——— جب اس حیثیت سے حضرت امجد کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے گا تو معلوم ہوگا ——— کہ وہ اپنی ابتدائی زندگی میں جامعہ نظامیہ حیدرآباد کے طالب علم رہے، عربی کی درمیانی کتابوں تک یہاں تعلیم حاصل کی، حیدرآباد میں جس علم اور فن

کے ماہر اُن کی طالب علمی کے زمانہ میں مشہور تھے، ان سے بھی کافی علمی فوائد ان کو حاصل ہوئے، بالخصوص بہار کے مشہور منطقی مولانا عبدالوہاب بہاری سے منطق کی متعدد کتابیں پڑھیں، استاد الملک آغا شوشتری کے حلقۂ درس میں شریک رہنے کے لئے روزانہ آٹھ میل پیدل چل کر اپنے فارسی ذوق کی تکمیل کی ــــــــــ اس زمانہ کی مشہور درس گاہ "دارالعلوم" سے منشی فاضل کا امتحان کامیاب کر کے فارغ التحصیل ہوئے، سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں شیخ میراں صاحب کی دختر سے پہلی شادی ہوئی، جس سے ایک لڑکی اعظم النساء پیدا ہوئی، اس کے دو سال بعد کسی خانگی وجہ سے ماں سے بگڑ کر بنگلور چلے گئے، جہاں ایک معمولی ملازمت بھی اختیار کرلی، بنگلور میں تین چار ماہ گذار کر ماں کی وجہ سے پھر حیدرآباد آگئے اور اپنی مادر علمی "دارالعلوم" کے شعبۂ تدریس سے وابستہ ہوگئے۔

۱۹۰۸ء میں جب رود موسی میں زبردست طغیانی آئی تو گھربار کے ساتھ ماں، بیوی اور لڑکی موجوں کی نذر ہوگئیں، سارا کنبہ آنکھوں کے سامنے ڈوب گیا، اس ناگہانی حادثہ اور عظیم المیہ سے متاثر ہوکر بجائے اضطراب امجد نے کہا تھا:

سیلاب میں جسم زار گویا خس تھا — عرفات محیط غم کس و ناکس تھا
اتنے دریا میں بھی نہ ڈوبا امجد — عزت والے کو ایک چلو بس تھا

اس کے بعد وہ درگاہ شاہ خاموش صاحب کے سجادہ کے گھر رہنے لگے، پھر ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ وہ مدرسہ دارالعلوم صدر محاسبی کے دفتر منتقل ہوگئے، سیلاب رود موسیٰ کی تباہی کے کئی سال بعد مشہور عالم مولانا سید نادرالدینؒ کی عالمہ فاضلہ دختر جمال النساء بیگم (جنہیں امجد صاحب

نے سلمیٰ کا لقب دیا) سے عقد ہوا، یہ عقد ان کے لئے نہایت موزوں اور روحانی ترقی کا ذریعہ ثابت ہوا" ــــــــــ مولانا گیلانی نے لکھا ہے :

" سچ پوچھئے تو شاعر امجد کو حکیم امجد بن جانے کا موقع شاعری کی تاریخ میں حکیم سنائی کے بعد جو ملا تو اس میں ان کی جبلّی اور اکتسابی نکات فائقہ کے ساتھ ساتھ بہت کچھ دخل مرحومہ سلمیٰ کی رفاقت کو بھی تھا۔" (یادگار امجد ص ۳۲)

حضرت امجد کی زندگی کے کئی سال جمال النساء بیگم سلمیٰ کے ساتھ ہنسی خوشی بسر ہوئے، دونوں مل کر حج کے لئے گئے، واپسی حج کے کچھ عرصہ بعد بیوی کا انتقال ہوگیا، ان کے لئے انتقال کا یہ واقعہ موسیٰ ندی کے سیلاب ہی کی طرح اندوہناک اور پُرالم ثابت ہوا، عرصہ تک امجد نہایت رنجیدہ رہے، آخر دوستوں نے تیسری شادی کردی، مگر امجد صاحب کی نفاست پسند طبیعت نے اس بیوی کے ساتھ زندگی بسر کرنا گوارا نہ کیا، ان کو روز اوّل ہی طلاق دیدی گئی، اور ایک عرصہ کے بعد چوتھا عقد کیا، یہ بیوی آخر وقت تک ان کی شریکِ حیات رہی، حضرت امجد صاحب کے شاگرد اور معتقدِ خاص جناب نصیرالدّین ہاشمی نے ایک جگہ حضرت امجد کی اس نجی اور خانگی زندگی کو سامنے رکھتے ہوئے یہ تبصرہ کیا ہے کہ اگر ان کی زندگی کا تجزیہ کیا جائے تو ہمیں تین امور نہایت امتیازی طور پر نظر آتے ہیں ــــــــــ اوّلاً تنگدستی اور غربت ہے، دوسری چیز غم والم یاس وحسرت ہے اور تیسری چیز تصوّف ہے، جس سے درگاہ شاہ خاموش صاحب کے قیام کے زمانہ میں، سجادہ نشیں سیّد شاہ صابر حسینیؒ کی صحبت اور رفیقۂ حیات جمال النّساء سلمیٰ کی رفاقت اور اس موضوع پر ان سے مسلسل بات چیت اور تبادلۂ خیال کے سبب مناسبت بلکہ گہری وابستگی پیدا ہوگئی تھی، ہاشمی صاحب نے

اس کے بعد لکھا ہے کہ رباعیات کے شہنشاہ کی شاعری پر غور کیا جائے تو یہی تینوں اُمور ان کی شاعری میں نمایاں نظر آتے ہیں، اس کے سوا سب سے بڑا عنصر انسانیت کی آواز ہے جو امجد کے کلام میں صحیح طور پر سنائی دیتی ہے۔ (یادگار امجد، ص ۲۵-۲۶)

پروفیسر وحید الدین سلیم نے ایک جگہ حضرت امجد کی شاعرانہ خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے بہت صحیح لکھا ہے کہ :-

"امجد شعر گوئی کے وقت خیال کو پیشِ نظر رکھتے ہیں، یہ اُن شاعروں میں نہیں ہیں جو لفظوں اور محاوروں کے کھلونے تیار کرتے رہتے ہیں، ان کے کلام میں جا بجا وہی بجلی کوندتی نظر آتی ہے جو اہلِ بصیرت کے لئے ہوش رُبا ہے، وہ شعر اسی وقت کہتے ہیں جب کوئی خیال ان کو اپنے اظہار پر مجبور کرتا ہے، پھر وہ اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ اس خیال کو کس لباس میں ظاہر کریں، خود خیال ہی اپنے لئے لباس تیار کرلیتا ہے اور اس کو پہن کر آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہوتا ہے، قدرتی شاعر کی یہی پہچان ہے، ان کی منتخب رُباعیاں یقیناً زندہ رہیں گی، اور اُردو ادب کا اہم عنصر خیال کی جائیں گی۔" (افاداتِ سلیم ص ۱۱۳)

اَب تک جو کچھ عرض کیا گیا، اس سے مقصود یہ ہے کہ حضرت امجد کی شخصیت اور فن دونوں کا اجمالی اور عمومی تعارف کرا دیا جائے، جہاں تک تعلق ان کی رباعیات میں اصلاحی پہلو کی تلاش کا ہے تو یہ ایک واقعہ ہے کہ ان کی پوری شاعری اصلاحی اور تعمیری خطوط اور بنیادوں پر ہی ہے، ان کا کوئی شعر اور کوئی رباعی ایسی نہیں جس میں خفتہ ذہن و دماغ کو بیدار نہ کیا گیا ہو، اور دل

کی زمین نرم کر کے اس میں نصیحت کا بیج نہ بو یا گیا ہو۔

ان کی تصانیف میں ریاضِ امجد، رُباعیاتِ امجد، خرقۂ امجد، نذرِ امجد، حجِ امجد، جمالِ امجد، حکایاتِ امجد، گلستانِ امجد، پیامِ امجد، حُسنِ بلالؓ، ایوبؑ کی کہانی، اور میاں بیوی کی کہانی شامل ہیں، ان میں سے جس تصنیف کا مطالعہ کیا جائے ہر ایک میں عبرت و موعظت کے صدہا موتی اور اصلاح و تربیت کے سیکڑوں خاکے آپ کو ملیں گے، اس مختصر مضمون میں نمونے کے طور پر ہی ان کی بعض رباعیات پیش کی جا سکتی ہیں، اس حصّہ کا آغاز، اُن کی ان رُباعیات سے کیا جا سکتا ہے جن کا تعلق اُن کی اپنی ذات سے ہے اور "تعارف اور تحدیثِ نعمت" کے طور پر اُن کی زبان سے یہ ادا ہوئی ہیں، فرماتے ہیں :-

سیّد احمد حسین ہوں امجد ہوں حسّانُ الہند ثانیِ سرمد ہوں
کیا پوچھتے ہو حسب و نسب کو میرے میں بندۂ لم یلد و لم یولد ہوں

اسی طرح ایک دوسری رباعی ہے :

سیّد احمد حسین ہوں امجد ہوں میں امجد ہوں میں جوابِ سرمد ہوں میں
گوندھی ہوئی ہے نور سے مٹّی میری خاک قدمِ پاک محمدؐ ہوں میں

ایک اور رُباعی میں فرماتے ہیں :

ہر نقطہ و حروف کام کر جاتا ہے دامن، گلِ معرفت سے بھر جاتا ہے
امجد کا کلام کوئی خمخانہ تو نہیں کیوں دِل میں ہر ایک کے اُتر جاتا ہے

امجد کا جو کلام پڑھے، اُن کے لئے ان کا پیام ہے :

اک خستہ جگر کے رُوح کو شاد کرو ویرانۂ دل کو اس کے آباد کرو
امجد کے پیام کا یہی مقصد ہے امجد کو دُعائے خیر سے یاد کرو

اِن تعارفی رُباعیات کے بعد بعض اصلاحی رباعیّات ذیل میں پیش

کی جاتی ہیں، جن میں زندگی کے مختلف پہلو مختلف انداز سے سامنے آئے ہیں، آج کا دَور جو بظاہر الحاد و دہریّت، بے دینی اور خدا بیزاری کا ہے، اس کو پیشِ نظر رکھ کر خدا کی عظمت و قدرت کا تذکرہ حضرت امجد اس طرح کرتے ہیں:

میری کوشش چل نہیں سکتی　　تیری مشیّت ٹل نہیں سکتی
میرے بنائے کچھ نہیں بنتا　　لَآ اِلٰـہَ اِلَّآ اَنْتَ

غیر اللہ کے خاشاک کو جلانا اور ایک ہی اللہ سے اپنی تمام ضرورتوں، حاجتوں اور اُمیدوں کو وابستہ کرنا، یہ مؤمن کی زندگی کی سب سے بڑی پہچان ہے۔ قرآنِ حکیم کی متعدّد آیتوں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بے شمار ارشادات میں اس طرف توجّہ دلائی گئی ہے، حضرت امجد اس مفہوم کو اس طرح ادا کرتے ہیں:۔

ہر چیز مسبّبِ سبب سے مانگو　　منّت سے خوشامد سے ادب سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو　　بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

ایک دوسری رباعی میں ارشاد فرماتے ہیں:

ہر دم اس کی عنایت تازہ ہے　　اس کی رحمت بغیر اندازہ ہے
جتنا ممکن ہے کھٹکھٹائے جاؤ　　یہ دستِ دعا خدا کا دروازہ ہے

ایک اور رباعی ہے:

سُنتا ہوں سب کی سُنتا ہے وہ داستانِ غم　　کیونکر بلند اَب نہ کروں میں دعا کو ہاتھ
مولا کے ساتھ ساتھ رہو تم جہاں رہو　　امجدؔ بھی ساتھ ساتھ ہے اپنے خدا کے ساتھ

ایک حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ جو شخص دنیا میں ساری دنیا پر غالب رہنا چاہتا ہے، اس کو چاہیئے کہ خدا پر کامل بھروسہ رکھے، اس حقیقت کی تلقین وہ اپنی اس رباعی میں کرتے ہیں:

راز اپنا اگر خدا پہ ہویدا ہو جائے　　انسان فرشتوں سے بھی اونچا ہو جائے
امجدؔ وہ شخص کیا نہیں کر سکتا　　جس کو اللہ پر بھروسہ ہو جائے

قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ "اللہ، اللہ والوں کو دوست رکھتا ہے" حدیث میں بھی ارشاد ہوا ہے "جو شخص اللہ کا ہو جاتا ہے، اللہ اس کا ہو جاتا ہے"، اب دیکھئے حضرت امجدؔ کیا فرماتے ہیں:

کیا پھل ملتا ہے، بیج بو کر دیکھو　　پانے کی اگر ہوس ہے کھو کر دیکھو
کیا عرض کروں کہ اس میں کیا لذت ہے　　اک مرتبہ تم کسی کے ہو کر دیکھو،

آج عام انسانوں، مسلمانوں اور خاص طور پر ان کی نئی نسلوں میں علمی و تعلیمی شعور پیدا کرنے کی وقت کی اہم ترین ضرورت ہے، اس سلسلہ میں حضرت امجدؔ نے لکھا ہے کہ:

"ایک روز ہمارے دروازے کے سامنے سے کمہاروں کے کندھوں پر پالکی میں کوئی امیر سوار جا رہے تھے، پالکی پکڑے ہوئے ایک آدمی بھی ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا، والدہ نے ہم کو بلا کر دکھایا اور کہا دیکھو اور اچھی طرح سمجھو، ایک آدمی سوار ہے، ایک پیدل پاؤں پالکی کے ساتھ دوڑ رہا ہے، بتاؤ ان دونوں میں سے تم کو کس کی زندگی پسند ہے؟ ہم نے کہا پالکی سوار کی، والدہ نے کہا، ایسی زندگی تو بغیر علم کے کسی کو نصیب نہیں ہو سکتی، اگر نہ پڑھو گے تو تم کو بھی اسی آدمی کی طرح پالکی کے ساتھ دوڑنا پڑے گا۔"

اس کے بعد وہ فرماتے ہیں "وقت کی بات، گفتگو کا اثر، اس بیش بہا مثال سے ہم سہم گئے اور آئندہ کھیلنے اور وقت ضائع کرنے سے

توبہ کر کے پڑھنے لکھنے کا عہد کر لیا۔

دل پہ لگی جا کے ہتھوڑے کی طرح　　کہنے کو ظاہر میں وہ ایک بات تھی
کر دیا دم بھر میں اِدھر سے اُدھر　　بات تھی یا کوئی کرامات تھی

یہ تو بات علم کی ہوئی مگر سب جانتے ہیں کہ علم کے ساتھ عمل بھی ضروری ہے، ایک موقع پر مشہور بزرگ حضرت شیخ احمد رفاعیؒ نے اہلِ علم سے خطاب کرتے ہوئے نہایت عُمدہ بات ارشاد فرمائی: "ایسا نہ ہو کہ تم علم کی چاشنی تو لے لو اور عمل کی تلخی کو چھوڑ دو"۔ ——— اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر نافع علم سے خدا کی پناہ مانگی ہے، ایک صاحبِ دل بزرگ فرماتے ہیں کہ: علم بڑا غیور ہے، وہ پہلے عمل کے دروازے پر دستک دیتا ہے، جب جواب نہیں ملتا ہے تو واپس چلا جاتا ہے؛

حضرت امجدؔ فرماتے ہیں:

راہ خدا سے ہٹ نہیں سکتا کبھی قدم　　انسان کے دماغ میں جب تک خلل نہ ہو
اس علم پر ہے علم کا اطلاق ہی غلط　　جس علم کا نتیجہ لازم عمل نہ ہو

حضرت امجدؔ کے کلام سے اصلاحی باتوں اور پیغام کا انتخاب بڑی طوالت کا کام ہے، اس لئے اب تمہیدی سطروں کے بغیر مختصر عنوانات کے تحت ان کی رباعیات درج کی جاتی ہیں، اہلِ فکر و نظر تھوڑی سی توجہ سے حضرت امجدؔ کے معنی و مُراد اور مفہوم و مطلب کو پالیں گے۔

عُمدہ باتوں کا حصُول:

پھول کانٹوں کو ہٹا کر چن لو　　خلشِ خار سے ڈرنا کیا ہے
کہنے والے کو نہ دیکھو کہ ہے کون　　تم یہ دیکھو کہ وہ کہتا کیا ہے

تقدیر پر یقین

کھیتی میرے فلسفہ کی پکتی ہی نہیں — تدبیر سے تقدیر چمکتی ہی نہیں
کھاتی ہے ہمیشہ منہ کی لیکن پھر بھی — "یہ کیا" "وہ کیوں" سے عقل تھکتی ہی نہیں

صبر:

کچھ وقت سے ایک بیج شجر ہوتا ہے — کچھ روز میں ایک قطرہ گہر ہوتا ہے
اے بندۂ ناصبور تیرا ہر کام — کچھ دیر میں ہوتا ہے مگر ہوتا ہے

بے صبر کی جان ہمیشہ گھبراتی ہے — تسکین کسی طرح نہیں پاتی ہے
آسان ہوتی ہے صبر سے ہر مشکل — ہر قفل میں یہ کلید ٹھیک آتی ہے

سختی اور آسانی:

دل کی ہر ایک خلش نکل جاتی ہے — آتی ہے اگر بلا تو ٹل جاتی ہے
سختی سے حوادث کے نہ گھبرا امجدؔ — یہ برف کوئی دم میں پگھل جاتی ہے

ظلم کا انجام:

اے قلبِ شکستہ کے ملنے والو! — آرے کی طرح سروں پر چلنے والو
پہلے تم اپنے پاؤں کی خیر مناؤ — اے شیشے کے ٹکڑوں کو کچلنے والو

وار اپنا پلٹ پڑا ہمیں پر — رونا پڑا غیر کو ستا کر
جلتی رہی شمع عمر ساری — دم بھر پروانے کو جلا کر

بے محل ہنسی اور نکتہ چینی

اسی لغویت میں میں خود پھنس رہا ہوں
مگر غیر کے فعل پر ہنس رہا ہوں
بھرا ہوں معائب میں خود سر سے پا تک
پر آوازے ہر ایک پر کس رہا ہوں

خودی اور خدا

گمراہ ہوئے تو رہ نما یاد آیا
جب آگئی پیری تو عصا یاد آیا
فرعون بھی وقتِ غرق لایا ایمان
جب چل نہ سکی خودی، خدا یاد آیا

حسد:

موت آنے سے پہلے ہی مَرا جاتا ہے
گویا حاسد بھی صوفی صافی ہے
آتش میں حسد کے جلنے والوں کیلئے
حکم مُوْتُوْا بِغَیْظِکُمْ کافی ہے،

خاکساری

ہر اک کو سُرور آہ و زاری سے ملا
اور آنکھوں کو نور اشکباری سے ملا
سجدے میں ہر ایک زمیں پہ سر رکھتا ہے
یہ رتبہ زمیں کو خاکساری سے ملا

سخت بات

کہو وہ بات جس میں ہو کرامات
سخن ہی حاصلِ دنیا و دیں ہے
نہ کیجئے سخت بات امجدؔ کسی سے
زباں میں دیکھئے ہڈی نہیں ہے

گالی:

ہیں ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ساری
جس نے عالم کو غیر سمجھا چُوکا

منھ کیا کیا خراب گالی دے کر　　تم نے میلا چبا کے منھ پر تھوکا

اتحاد کا سبق :

کعبہ میں نماز کا طریقہ دیکھا　　کثرت میں بھی توحید کا نقشہ دیکھا
ہرچند کہ مختلف ہے ہر ایک کی سمت　　لیکن ہر ایک کو روبقبلہ دیکھا

مساوات :

مسلم ہو تو مسلم کو برادر سمجھو　　ہر ذرّے کو خورشید کا مظہر سمجھو
کیوں ہوتی ہیں مستوی صفیں وقت نماز　　یعنی ہر ایک کو تم برابر سمجھو

وحدت :

اَب آنکھوں میں بینائی کو جوہر آیا　　سب ایک ہی ہیں آج مجھ کو باور آیا
دیکھو تو ذرا وجود کی وحدت کو　　وار اس پر کیا تھا، زخم مجھ پر آیا

دوست :

میں یہ نہیں کہتا کہ خدا پیدا کر　　دکھ سکھ کا شریک آشنا پیدا کر
جس سے نظر آئے تجھ کو اپنی صورت　　امجد، ایک ایسا آئینہ پیدا کر

ازدواجی زندگی

دو دل ایک ہوں تو نخل پھلتا ہے　　دل گود میں حسن و عشق کی پلتا ہے
امجد! بجلی کی روشنی کی مانند　　دو تار سے زیست کا دیا جلتا ہے

حقیقی تحفظ :

جو چیز جہاں کی ہے رکھ چھوڑو　　کچھ کل کیلئے بھی ارمغاں رکھ چھوڑو
فانی ہاتھوں میں کیا رہے گا باقی　　اپنا سب کچھ خدا کے ہاں رکھ چھوڑو

زکوٰۃ :

دیدیجئے خوش دلی سے ہر ایک کا حق — برباد نہ کیجئے کھیت اک جو کے لئے
اک جزو زکوٰۃ ہے محافظ کل کا — ہے ڈھائی روپے کا سنتری تو کیلئے

غرور

جن ہے یا بھوت، یا کوئی دیوتا ہے — اکسیر ہے، کیمیا ہے یا عنقا ہے
اک عمر سے سن رہا ہوں "میں" کی آواز — معلوم نہیں ہوا کہ "میں" کیا ہے

ہے نام کے ساتھ ساتھ بدنامی بھی — ہے کام کے ہم رکاب ناکامی بھی
عرفان کا دعویٰ ہے جہالت کی دلیل — اظہار میں پختگی کے ہے خامی بھی

کوشش :

فطرت کا تقاضا ہے کہ کوشش میں رہے — دلچسپی عقل ہے کہ کاوش میں رہے
جب تودۂ خاک پھر رہا ہے دن رات — خاکی انسان کیوں نہ گردش میں رہے

ہزاروں بار دنیا میں بہار آئے مگر پھر بھی — ہمارا غنچۂ خاطر نہیں کھلتا نہیں کھلتا
ہزار اپنی طرف سے کوششیں کرتے رہو لیکن — مقدّر سے زیادہ وقت سے پہلے نہیں ملتا

کامیابی :

کچھ کئے جاؤ لے کے نام خدا — کچھ نہ کرنا بڑی خرابی ہے
کامیابی کچھ اور چیز نہیں — کام کرنا ہی کامیابی ہے

روانی عمر :

کیا وقت گذر رہا ہے نادانی میں — بیٹھے ہیں پختہ عالم فانی میں
جس عمر پہ ہے گھمنڈ اتنا ہم کو — ہے دھوپ میں برف یا نمک پانی میں

زندہ درگور :

کل تک جو سلیمان تھے وہ مور ہیں آج
جو صاحبِ زور تھے وہ بے زور ہیں آج
مُردے تو ہوا کرتے ہیں درگور امجدؔ
لیکن زندہ بھی، زندہ درگور ہیں آج

فانی اور باقی

واجب ہی کو ہے دوام باقی فانی
قیوم کو ہے قیام، باقی فانی
کہنے کو زمین و آسماں سب کچھ ہے
باقی ہے اسی کا نام، باقی فانی

اپنی بات پر یقین

اس خانۂ رنگی میں کوئی ہے کہ نہیں
بات اپنی ہی اپنے دلنشیں ہے کہ نہیں
جس بات کا کر رہے ہیں دعویٰ حضرت
خود آپ کو بھی اس کا یقین ہے کہ نہیں

خدا کی مخلوق کے ساتھ برتاؤ

ہر شخص کے دل کو خوش رکھو عید ہے یہ
ہر چیز کو اچھا کہو تمہید ہے یہ
مخلوق خدا ہے سب خدا کی مخلوق
سب کو تم ایک سمجھو توحید ہے یہ

اپنا کام :

خود اپنا وجود آپ پر بھاری ہے
ہر کام میں نوکر کی مددگاری ہے
مشکل ہے امیر کو جگہ سے ہلنا
دولت مندی بھی ایک بیماری ہے

مفت خوری :

کام کرنے میں کوئی عیب نہیں
کام کرنا بھی کوئی چوری ہے؟
اہلِ غیرت کی شرع و ملّت میں
مفت خوری حرام خوری ہے

عزّت و ذلّت :

یہ آبرو تمہاری چشمہ حیات کا ہے — اس کو کرو نہ گندہ خواہش کی گندگی سے
اک نان کیلئے کیوں دیتے ہو جان اجمد — عزّت کی موت اچھی ذلّت کی زندگی سے

ذلّت کی جگہ نہیں ہے آنا اچھّا — بےغیرت کا جہاں سے جانا اچھّا
ملتا ہے جو کھانا گالیاں کھا کھا کر — ایسے کھانے سے زہر کھانا اچھا

ہُنر :

دنیا کا مقولہ ہے کہ زر اچھّا ہے — ہم کہتے ہیں کہ زر سے تو ہُنر اچھّا ہے
وہ صاحبِ مال ہے تو یہ اہلِ کمال — شاہ کشور سے پیشہ ور اچھّا ہے

طمعِ دَولت کا اثر :

برا اچھّا، جواں بوڑھا، نظر ہی کچھ نہیں آتا — روپے کی ٹھیکری میں کیا نقش عیب پوشی ہے
فقط دولت کی خاطر کرتے ہیں اولاد کو قُربا — کبھی دختر کشی تھی اور اب دختر فروشی ہے

مزاج کے فرق کا اثر :

ایک موتی کھرل میں پستا ہے — ایک سر تاج تاج ہوتا ہے
لے رہا ہے اثر مفید و مضر — جس کا جیسا مزاج ہوتا ہے

پدرم سلطان بود

اَب بھی ہے زباں پر پدرم سلطان بود — فاقوں میں بھی شان کجلا ہی نہ گئی
اَب پھرتے ہیں بَن کے شاہ جی دنیا میں — کیا خوب، تباہی میں بھی شاہی نہ گئی

چھوٹے نام ونشاں سے خوش ہوتے ہیں
مغرور شکوہ وشان سے خوش ہوتے ہیں
اجداد پہ فخر کرتے ہو کیا امجد
کتے ہیں جو استخواں سے خوش ہوتے ہیں

عبرت :

ابھی خاک مجھ پر نہ ڈالو عزیزو
امیدیں بہت قلب صد چاک میں ہیں
نہ نکلے کبھی ہم تو اس خاکداں سے
کبھی خاک پر تھے، کبھی خاک میں ہیں

بڑی دَولت

ہر چیز کا کھلونا بھی بڑی دولت ہے
آرام سے سونا بھی بڑی دولت ہے
افلاس نے سخت موت آساں کردی
دولت کا نہ ہونا بھی بڑی دولت ہے

زوال :

ہر شے کے کمال کو زوال آتا ہے
یہ دَور فلک، رنگ نیا لاتا ہے
خاکی ہستی کی سَربلندی کب تک
تنکا اڑ کر زمیں پہ گر جاتا ہے

حلال وحرام کی تمیز

افیوں ہو یا مٹھائی ہو منھ میں رکھ لی
چیز اپنی ہو یا پرائی ہو منھ میں رکھ لی
چھوٹے بچوں سے کم نہیں ہم اَب بھی
جو چیز ملی اٹھائی منھ میں رکھ لی

حَرام لقمہ :

لے لے کے خدا کا نام چلاتے ہیں
پھر بھی اثرِ دعا نہیں پاتے ہیں
کماتے ہیں حرام لقمہ پڑھتے ہیں نماز
کرتے نہیں پرہیز دوا کھاتے ہیں

دو عملی

دل میں کچھ ہے زبان پر کچھ ہے　　دیکھتے کچھ ہیں دھیان میں کچھ ہے
وزن کیا ایسی بات کا امجدؔ　　یاں ہے کچھ اور مکان میں کچھ ہے

تاثیر:

ہم توڑ کے تارے آسماں سے لائے　　مضمون بلند لامکاں سے لائے
ہر شعر بہ اعتبار فن خوب کہا　　لیکن کوئی تاثیر کہاں سے لائے

حکیم الشعراء حضرت امجد حیدرآبادی کی رباعیات میں سے چند کا انتخاب اصلاحی نقطۂ نظر سے کیا گیا ہے، حیدرآباد میں آج بھی ادبی محفلیں آباد ہیں، اور متعدد ادبی انجمنیں اور ادارے سرگرم ہیں لیکن ضرورت ہے کہ فنِ شاعری میں امجد کے مذاق اور مزاج کو اپنایا جائے، قوم، ملّت، مُلک، سماج اور معاشرے کی اصلاح اسی طرح کے اشعار سے ممکن ہے، گل و بلبل اور شاہد و ساقی کے تذکرہ سے نفسانی خواہشات کو تسکین تو مل سکتی ہے، محفل اور مشاعرہ میں ایسے اشعار کے ذریعہ خوب داد و تحسین بھی حاصل ہو سکتی ہے مگر اس سے ذہن و فکر اور اخلاق اور سیرت کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔

بشیر النساء بیگم بشیرؔ نے اپنے بعض اشعار کے ذریعہ حضرت امجدؔ کو جو خراجِ تحسین پیش کیا ہے، وہ نہ صرف بہت خوب ہے بلکہ حیدرآبادی اور مسلم شعراء کے لئے ایک درس اور پیغام بھی ہے۔

ہے دکن کی سرزمیں کا نام ہیروں کی زمیں　　جس کی ہے تنویر کوہِ نور سے روشن جبیں
کیسے کیسے کوہِ نور اُبھرے یہاں ہر دور میں　　نت نئے جوہر عیاں ہوتے رہے ہر دور میں

جوہرِ امجد بھی چمکا ہے دکن کی خاک سے　　قلب پر جن کے اترتا تھا کلام افلاک سے
سرمدی ہے راگ جن کا جاودانی ساز ہے　　جن کی فیضانی نوا میں زندگی کا راز ہے
شعرِ امجد در حقیقت مظہرِ الہام ہے　　جس میں سوز و درد ہے، تاثیر ہے پیغام ہے

بشیر النساء بیگم بشیر کی اس معنی خیز اور حقیقت افروز نظم کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون کو موضوع کی مناسبت سے حضرت امجد ہی کی ایک رباعی پر ختم کیا جائے۔

لو ختم ہوا آج کلامِ امجد　　امجد کی جگہ رہ گیا نامِ امجد
اب آپ اس پر عمل کریں یا نہ کریں　　پہنچا دیا امجد نے پیامِ امجد

نظیرؔ کی بے نظیر شاعری

اردو شاعری میں نظیرؔ اکبر آبادی کو اونچا اور بلند و بالا مقام حاصل ہے۔ انہوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے، ان کی کلیات میں غزل، نظم، قصیدہ، مثنوی، رباعی، مسدس، ترجیع بند، مستزاد سبھی کچھ ہے، نظم میں خصوصیت کے ساتھ نئی راہ دکھائی ہے، نظم میں ایجادی اور اختراعی حیثیت سے ان کی یہی وہ دکھائی ہوئی راہ ہے جس پر بعد میں حالی اور شبلی پر وقار انداز میں مضبوط قدموں کے ساتھ چلے ہیں۔

پہلے لوگ یہ سمجھتے رہے کہ نظیرؔ عوامی شاعر ہیں، عوام کی ہر مجلس میں پہنچ کر، ان کے ہر بھیس میں آکر، انہیں جیسا رنگ و روپ اختیار کر کے شاعری کرتے ہیں، وہ بچوں میں بچے، جوانوں میں جوان، بوڑھوں میں بوڑھے ہیں اسی لئے شروع میں اصحاب فن اور اہل کمال ان کی شاعری کی طرف زیادہ متوجہ نہیں ہوئے، مگر بعد میں غلط فہمی کا ازالہ ہوا اور پتہ چلا کہ عوام کے ہی نہیں، خواص کے بھی شاعر ہیں، بات دراصل یہ ہے کہ کوئی آدمی اگر اپنی فلسفیانہ باتوں کو فلسفیانہ انداز میں بیان کرتا ہے تو لوگ اسے فلسفی سمجھتے ہیں، مگر ایک شخص فلسفیانہ باتوں کو عام فہم اسلوب میں پیش کرتا ہے، تو لوگ اسے فلسفی نہیں سمجھتے ہیں نظیرؔ کے بارے میں رائے قائم کرتے ہوئے لوگوں کو اسی عام سوچ کی وجہ

سے دھوکا لگا ہے، تاہم حقیقت یہ ہے کہ کسی فلسفیانہ بات کو فلسفیانہ انداز میں پیش کرنا بھی کمال ہے مگر اس سے بڑا کمال یہ ہے کہ فلسفیانہ بات کو عام فہم اسلوب میں پیش کیا جائے، اس لحاظ سے یہ بڑا کمال اردو کے بڑے فلسفی شاعر نظیر کو حاصل تھا، نظیر کے بارے میں غور... کی نظر اس نکتہ کو پوری طرح کھول دے گی۔

نظیر کی شاعری کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان کی شاعری میں نت نئے الفاظ کا ذخیرہ ہے، جدید تعبیرات ہیں، نادر تشبیہات ہیں، معنی خیز استعارات ہیں، سادگی اور بے تکلفی ہے، رعنائی اور دل کشی ہے، طنز کا تیکھا پن ہے، ظرافت کی چاشنی ہے، آبشار کا ترنم ہے، دریا کی روانی ہے، سمندر کا تموج ہے، پھول کی مہک ہے، پنکھڑیوں کی نزاکت ہے، شبنم کی لطافت ہے، شاخ کی لچک ہے، کوئل کی کوک ہے، بلبل کی نغمہ سرائی ہے، انسانیت کا غم ہے، دکھے دل کی آہ ہے، بنسوڑوں کی واہ ہے، واعظوں کا وعظ ہے، حکیموں کی حکمت ہے، یعنی وہ سب کچھ ہے، جو متنوع فکر، حساس دل، اخاذ ذہن، بیدار دماغ، تیز نگاہ، جوہر شناس، ہمدرد و غمگسار، باخبر شاعر کی شاعری میں ہونا چاہیئے۔

نظیر اکبر آبادی کا نام ولی محمد ہے، دہلی میں پیدا ہوئے، احمد شاہ ابدالی کے وقت آگرہ چلے آئے اور محلہ تاج گنج میں سکونت اختیار کی اور یہیں آخری آرام گاہ بھی ہے۔ پیدائش کا سنہ ۱۷۲۵ء ہے اور وفات کا ۱۸۲۵ء۔ اس طرح عمر سو سال پائی، طبیعت کے چلبلے پن اور جوانی کی نیرنگیوں کے باوجود مذہب تصوف کا غلبہ رہا، صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے، آخر عمر تک بغیر عینک کے قرآن پڑھتے رہے، نظیر کے تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ جب ان کے سامنے قرآن حکیم کی آیت "فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَلْيَبْكُوا كَثِيرًا" آتی تو ہنسنے کے موقع پر بھی مسکرا دیتے تھے، تاکہ اس آیت کی خلاف ورزی نہ ہو، اسی طرح قرآن میں "وَاغْضُضْ مِنْ

.... صَوْتِكَ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ" ارشاد فرمایا گیا، جس میں ہدایت ہے کہ" اپنی آواز کو پست رکھو، بلاشبہ بُری سے بُری آواز گدھے کی آواز ہے۔" چنانچہ اس ہدایتِ ربانی کے پیش نظر انہوں نے اپنی آواز بھی پست کر دی تھی، ان کی زندگی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خوش نویسی میں ماہر تھے معلمی پیشہ تھا، تاہم کوئی ایسا پیشہ نہیں، جس کو انہوں نے اپنایا نہ ہو۔ طبیعت اور مزاج کی یہی وہ ہمہ رنگی ہے، جس سے ان کی شاعری کی شمع ہر رنگ میں جلتی نظر آتی ہے، سیر تماشوں، موسموں، پرندوں، جانوروں، انسان کی مختلف حیثیتوں، مناظرِ قدرت، مظاہرِ کائنات، ہر ایک کو انہوں نے موضوع بنایا ہے اور پرکیف اور دل آویز نظمیں لکھی ہیں۔ نظیر اپنے مسلک کے لحاظ سے شیعہ امامیہ تھے، وہ ایک ملنسار، با اخلاق اور وسیع المشرب انسان تھے، ہر مذہب و ملّت کے لوگوں کے لئے ان کے دل میں بے پناہ پیار تھا اسلئے ہندوؤں مسلمانوں کے مذہبی تہواروں، میلوں، ٹھیلوں پر بھی ان کی نظمیں موجود ہیں، بیان کیا جاتا ہے کہ نظیر نے دو لاکھ سے زیادہ اشعار کہے ہیں، ان میں سے بیشتر ضائع ہو گئے اس وقت جو ان کا مجموعۂ کلام دستیاب ہے، وہ کم و بیش چھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ نیاز فتحپوری کی طبیعت کا عام رنگ بے نیازی کا ہے، مگر نظیر کے حق میں نیاز کی رائے نہایت نیاز مندانہ ہے، وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

" نظیر کی کلّیات ایک ایسا نایاب ذخیرہ ہے کہ زندگی کا کوئی پہلو، معیشت و معاشرت کا کوئی انداز اور احساسات و تاثرات کا کوئی منظر ایسا نہیں ہے جو اس میں موجود نہ ہو۔ امیر و غریب، شاہ و گدا، زاہد و رند، ہندو و مسلمان، گبر و ترسا، علاحدہ علاحدہ سب کی دلچسپی کا سامان اس میں موجود ہے، اور عالم محسوسات کی شاید ہی کوئی چیز ایسی ہو جس کا ذکر کسی

نہ کسی نہج سے نظیر نے نہ کیا ہو، مشاغلِ زندگی، ضروریاتِ انسانی، مظاہرِ تمدن میں مقطع اور ہنسوڑ کی قسم کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جسے نظیر نے چھوڑ دیا ہو، اور جس پر پورے اہتمام شاعرانہ کے ساتھ قلم نہ اٹھایا ہو، دیکھا جائے تو نظیر اپنی خصوصیات کے لحاظ سے ہندوستان کا عجیب و غریب شاعر تھا، جس میں کبیر کے اخلاق اور خسرو کی ذہانت کا نہایت دل کش امتزاج پایا جاتا تھا لیکن افسوس ہے کہ وہ بہت قبل از وقت پیدا ہوا، اس زمانے کا شاعر تھا اور اسی زمانے میں اسے ہونا چاہیئے تھا،

نظیر کی زندگی اور شاعری کے اس اجمالی تذکرے کے بعد آیئے دیکھیں کہ نظیر آدمی کو کس کس رنگ میں اور کس کس پہلو سے دیکھتے ہیں، کیا ہدایات دیتے ہیں، نصیحتیں کیا فرماتے ہیں، توقعات کیا قائم کرتے ہیں، کیوں کہ آدمی ان کی نظر میں خدائی فرمان کے بموجب مخلوقات میں سب سے زیادہ اشرف ہے۔ خالق نے اسے اعزاز و تکریم کا تمغہ عطا فرمایا ہے، قرآنی نظریہ کے حامل نظیر یہ بھی سمجھتے ہیں کہ آدمی بہترین ساخت پر پیدا کیا گیا ہے، اسے فکر و فہم اور علم و عقل کی وہ بلند پایہ قابلیتیں بخشی گئی ہیں جو کسی دوسری مخلوق کو نہیں بخشی گئی ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اس کائنات میں آدمی کی حیثیت مخدوم کی ہے ذرّہ سے لے کر آفتاب تک ہر چیز اس کی خدمت پر مامور ہے، مگر یہ مامور ہے اللہ کی عبادت پر۔ عبادت ہی میں آدمی کی عظمت کا راز پوشیدہ ہے، ہر زمانہ، ہر حالت، ہر صورت میں آدمی کو اپنی حیثیت اور ذمہ داری کو سمجھنا چاہیئے، اپنی تندرستی اور آبرو کا خیال رکھنا چاہیئے، اور آدمی کو اپنے رب کا بندہ بن کر رب کی بارگاہ میں ہمیشہ اپنے ہاتھوں کو پھیلائے رکھنا چاہیئے، انہوں نے اپنی ایک طویل نظم "آدمی نامہ" میں یہ پیغام دیا ہے کہ آدمی آدمی ہے، اس

حیثیت سے اس کے درمیان کسی طرح کا امتیاز ٹھیک نہیں ہے۔

آدمی کا پہلا دور بچپن ہے، اس سلسلہ میں ان کی نظم "در تعریفِ طفلی" یا "طفلی نامہ" کے نام سے بہت خوب ہے، چھ بند میں سے دو بند ملاحظہ فرمائیے، جس میں بچپن کی زندگی کی معصومیت اور بے نیازی، مست و مگن ہوکر کھیلتی نظر آتی ہے۔

جو ان کو دو سو کھالیں، پھیکا ہو یا سلونا ہیں بادشاہ سے بہتر، جب مل گیا کھلونا
جس جا پہ نیند آئی پھر واں ہے ان کو سونا پروا نہ کچھ پلنگ کی، نے چاہیے بچھونا
بھونپو کوئی بجالے، پھرکی کوئی نچالے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

یہ بالے پن کا یارو عالم عجب بنا ہے یہ عمر وہ ہے اس میں جو ہے سو بادشاہ ہے
اور سچ اگر یہ پوچھو تو یہ بادشاہ بھی کیا ہے اب تو نظیر میری سب کو یہی دعا ہے،
جیتے رہیں سبھوں کے آس و مراد والے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

دوسرا دور جوانی کا آتا ہے، لوگ کہتے ہیں کہ جوانی دیوانی ہوتی ہے، یہ سنبھلنے کا زمانہ بھی ہوتا ہے اور بگڑنے کا دور بھی، اس خطرناک مرحلہ پر جس نے اپنے آپ کو بچالیا، اس کی کشتی ساحلِ مراد سے ہمکنار ہوگئی، وگرنہ بھنور میں پھنستی چلی جائے گی، نظیر جوانی کا تذکرہ باندازِ رنگ ترنگ کرتے ہیں، مگر مقصود ان جوانوں کو گرانا نہیں سنبھالنا ہے، پندرہ بند میں سے ایک بند پیش ہے ؎

کیا عیش کے رکھتی ہے سب آہنگ جوانی کرتی ہے بہاروں کے تئیں دنگ جوانی
مرآن پلاتی ہے مئے و بھنگ جوانی کرتی ہے کہیں صلح، کہیں جنگ جوانی

اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

آدمی کی زندگی کا تیسرا دور بڑھاپا ہے، جس میں قویٰ کمزور ہو جاتے ہیں، موت اور قبر دبے پاؤں ہر لمحہ قریب ہوتی جاتی ہے، اس موضوع پر نظیر نے بہت طویل نظم کہی ہے اور ذیلی طور پر یہ پیغام دیا ہے کہ اس مرحلہ میں لغویات کو چھوڑ کر، دنیا کے جھمیلوں سے نکلتے ہوئے فکرِ آخرت پر بھرپور توجہ دی جائے، یہ وقت عیش و عشرت اور عشق و مستی کا نہیں رہتا ہے بلکہ دوسری زندگی کا جو لامتناہی سلسلہ شروع ہونے والا ہے، اس کو بنانے اور سنوارنے کا ہوتا ہے، یہاں چند اشعار دیئے جا رہے ہیں۔

کیا قہر ہے یارو جسے آجائے بڑھاپا — اور عیش جوانی کے تئیں کھائے بڑھاپا
عشرت کو ملا خاک میں غم لائے بڑھاپا — ہر کام کو ہر بات کو ترسائے بڑھاپا
کرتے تھے جوانی میں تو سب آپ سے آچاہ — اور حسن دکھاتے تھے وہ سب آن کے دل خواہ
یہ قہر بڑھاپے نے کیا آہ نظیر آہ — اب کوئی نہیں پوچھتا اللہ ہی اللہ

نظیر کی نظر میں یہ ہے آدمی کا بچپن، اس کی جوانی اور اس کا بڑھاپا نظیر یہ بھی کہتے ہیں کہ زندگی کا کوئی بھی دور اور کوئی بھی زمانہ ہو اور حالت کیسی بھی ہو، آدمی کو ہمیشہ اپنی حیثیت پر نظر رکھنی چاہیئے۔ "جو اپنی ذات کو پالیتا ہے، وہ اپنے رب کو پالیتا ہے" یہ دراصل حدیث نبویؐ "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ" کا ترجمہ ہے، اپنی ایک نظم میں انہوں نے اس عربی متن کو سرنامہ بنایا ہے اور اس سے پہلے "آئینہ" لکھا ہے، پوری نظم بڑی ہی معنی خیز ہے، صرف دو بند کا مطالعہ فرمائیے: ؎

لے آئینے کو ہاتھ میں اور بار بار دیکھ — صورت میں اپنی قدرتِ پروردگار دیکھ

خالِ سیاہ اور خطِ مشکبار دیکھ　　زلفِ دراز و طرۂ عنبر نثار دیکھ
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

باغ و چمن کے غنچہ و گل میں نہ ہو اسیر　　قُمری کی سن صفیر، نہ بلبل کی سن صفیر
اپنے تئیں تو دیکھ کہ کیا ہے ارے نظیرؔ　　ہیں حرف "مَن عرف" کے یہی معنی اے نظیرؔ
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

نظیرؔ آدمی کو تلقین کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں دی ہیں، ان پر شکر بجالانا چاہیئے ——— اللہ اپنے شکر گذار بندوں پر اپنی نعمتوں کا دروازہ اور بھی کھول دیتا ہے، وہ کہتے ہیں ؎

یہ نعمتیں عیاں ہیں جو عالم کے واسطے　　رہیں گی یہ سب میاں اسی آدم کے واسطے
کچھ تن کے واسطے ہیں، کچھ شکم کے واسطے　　ہیں بیش بیش کے لئے، کم کم کے واسطے
سب خوبیاں بنی ہیں یہ آدم کے واسطے
اور آدم بنا ہے آہ فقط غم کے واسطے

میوے ہیں جتنے خشک تر اس باغ میں لگے　　بادام، پستے، اخ چھوہارے دکھو پرے
خربوزے آم جامن و لیمون چکوترے　　نارنگی و انار بھی کیلے و سنترے
سب خوبیاں بنی ہیں یہ آدم کے واسطے
اور آدم بنا ہے آہ فقط غم کے واسطے

یہ تو نعمت کے بارے میں نظیرؔ کا نقطۂ نظر ہے، دولت کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ اس کی محبت کو دل میں جگہ نہیں دینی چاہیئے، اس کی محبت نے ہمیشہ دنیا میں فتنہ برپا کیا ہے، قارون کے خزانہ نے آخر کار اسے کچھ فائدہ

نہیں پہونچایا، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ دولت کی محبت سے بخل پیدا ہوتا ہے، اور بخیل آدمی اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے سے کتراتا ہے اور وہ نہیں جانتا کہ صفتِ بخالت اسے اللہ سے دور کر رہی ہے، جب کہ سخاوت کی صفت آدمی کو اللہ سے قریب کرتی ہے اور مخلوقِ خدا میں بھی وہ مقبول و محبوب ہوتا ہے، وہ فرماتے ہیں :

زر کی جو محبت تجھے پڑ جاوے گی بابا　　دکھ اس میں تری روح بہت پاوے گی بابا
ہر کھانے کو ہر پینے کو ترساوے گی بابا　　دولت جو ترے یاں نہ کام آوے گی بابا
پھر کیا تجھے اللہ سے ملواوے گی بابا

جوں جوں وہ ترے مال سے عشرت میں پڑے گا تو قبر میں رہ رہ کر کفِ افسوس ملے گا
جو چاہے کوئی بولے تو پھر بس نہ چلے گا　　بے بس تو پڑا قبر میں حسرت سے جلے گا
دن رات تری چھاتی کو کٹواوے گی بابا

کہتا ہے نظیر اب جو یہ باتیں تجھے ہر آن　　گر مرد ہے عاقل تو اسے جھوٹ مت جان
ٹک غور سے کر گنج پہ قارون کے ذرا دھیان　　جیسا ہی اسے اس نے کیا خوب پریشان
ویسا ہی مزا تجھ کو بھی دکھلاوے گی بابا

نظیر بخالت دولت اور اسراف سے منع کرتے ہیں، اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مفلسی کوئی اچھی چیز نہیں، اس سے ایک آدمی مختلف قسم کی نفسیاتی بیماری اور سماجی برائی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس لئے اس کو اپنے سے قریب نہیں آنے دے، محنت و مزدوری اور جد و جہد کے ذریعہ اپنے معاشی موقف کو مضبوط کرے، وہ اپنی ایک نظم میں تفصیل کے ساتھ مفلسی کی خرابیوں کو بیان کرتے ہیں، اس نظم کے دو بند یہ ہیں :

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی　　کس کس طرح سے اس کو ستاتی ہے مفلسی

پیاسا تمام روز بٹھاتی ہے مفلسی بھوکا تمام رات سلاتی ہے مفلسی
یہ دکھ وہ جانے جس پہ کہ آتی ہے مفلسی

دنیا میں لے کے شاہ سے اے یار تا فقیر خالق نہ مفلسی میں کسی کو کرے اسیر
اشراف کو بناتی ہے اک آن میں حقیر کیا کیا میں مفلسی کی خرابی کہوں نظیر
وہ جانے جس کے دل کو جلاتی ہے مفلسی

اس دنیا میں آدمی، آدمی سے بغض و عداوت رکھتا ہے، نفرت و کدورت سے اپنے دماغ کو پکاتا ہے، حسد اور جلن سے اپنے سینہ کو جلاتا ہے، تھوڑی تھوڑی سی بات سے منہ پھیر لیتا ہے، ملنا جلنا کم یا ختم کر دیتا ہے، کبھی گھنٹوں دل آویز مسکراہٹوں اور قہقہوں کی گونج کے درمیان گفتگو ہوتی تھی، اب یک لخت یہ سلسلہ رک گیا ہے اور ہنسنا، بولنا چھوڑ دیا گیا ہے، یہ سب "حسنِ ذات" (وسیع تر معنی) میں گم ہو جانے کا کرشمہ ہوتا ہے، نظیر اس پسِ منظر کو نظر میں رکھتے ہوئے شگفتہ اسلوب، بے تکلف اور پیار بھرے انداز میں کچھ اس طرح گویا ہوتے ہیں کہ دل بھر آتا ہے اور اپنی ذات کے خول سے نکل کر خواہ مخواہ آدمی، آدمی سے ہنسنا بولنا چاہتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

اپنے غم خواروں سے کوئی آن ہنس لے بول لے دردمندوں کا نکال ارمان ہنس لے بول لے
پھر کہاں یہ دل بری یہ شان ہنس لے بول لے دم غنیمت ہے ارے نادان ہنس لے بول لے
مان لے کہنا مرا اے جان ہنس لے بول لے
حُسن یہ دو دن کا ہے مہمان ہنس لے بول لے

اب نظیر آگے ترے رہتا ہے حاضر صبح و شام پیار سے ہنس بول پیارے پی مئے الفت کا جام
پھر کہاں یہ دلبری یہ عیش کی باتیں مدام کچھ نہ ہوئے گا رہے گا آخرش اللہ کا نام
مان لے کہنا مرا اے جان ہنس لے بول لے
حُسن یہ دو دن کا ہے مہمان ہنس لے بول لے

آدمی سے متعلق نظیر اکبر آبادی کی ایک نظم ہے، جس کا عنوان ہے "آدمی نامہ" یہ سترہ بند پر مشتمل ہے، نظم نہایت دلچسپ اور معنی خیز ہے، اور نظیر کی مشہور نظموں میں اس کا شمار ہوتا ہے، زبان سادہ، شستہ اور رواں ہے، پوری نظم میں تصنع، تکلف اور آورد کا کہیں سے بھی احساس نہیں ہوتا، نظیر کی یہ نظم دراصل تمدنی نوعیت کی ہے، جس میں وہ آدمی کو مختلف حیثیتوں سے دیکھتے ہیں۔ اور آدمی ہونے کے ناطے اس کے مقام و مرتبہ کو بلند و بالا بتاتے ہیں، بقول ذوق دہلوی:

آدمیت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ
پست ہمت یہ نہ ہوئے پست قامت ہو تو ہو

نظیر کی اس فکر انگیز اور سبق آموز نظم کے چند بند پہلے ملاحظہ فرمائیے:

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی — اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی — نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

بیٹھے ہیں آدمی ہی دوکانیں لگا لگا — اور آدمی ہی پھرتے ہیں رکھ سر پہ خونچا
کہتا ہے کوئی لو، کوئی کہتا ہے لاؤ لا — کس کس طرح سے بیچے ہیں چیزیں بنا بنا
اور مول لے رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی لعل و جواہر ہیں بے بہا — اور آدمی ہی خاک سے بدتر ہے ہو گیا
کالا بھی آدمی ہے کہ الٹا ہے جوں توا — گورا بھی آدمی ہے کہ ٹکڑا ہے چاند کا
بدشکل بدنما ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

نظیر نے آدمی نامہ میں آدمی کی مختلف تصویریں کھینچتے ہوئے یہ بھی بتایا ہے کہ آدمی اچھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی، مطیع و فرماں بردار بھی ہوتا ہے اور

سرکش و نافرمان بھی، ہادی و رہنما بھی ہوتا ہے اور شیطان و مکّار بھی، یہ سب آدمی کی قسمیں ہیں، سماج میں ان سب کی اپنی ایک "حیثیتِ عرفی" ہے، تاہم وہ آدمی خلق اور خالق کی نگاہ میں پسندیدہ ہے، جو اچھا اور بہتر ہے۔ وہ کہتے ہیں:

فرعون نے کیا تھا جو دعویٰ خدائی کا　　شداد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا
نمرود بھی خدا ہی کہلاتا تھا برملا　　یہ بات ہے سمجھنے کی آگے کہوں میں کیا
یاں تک جو ہو چکا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی نار ہے اور آدمی ہی نور　　یاں آدمی ہی پاس ہے اور آدمی ہی دور
کل آدمی کا حسن و قبح میں ہے یاں ظہور　　شیطان بھی آدمی ہے جو کرتا ہے مکر و زور
اور ہادی رہنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

"آدمی نامہ" جیسی سنجیدہ نظم میں نظیر کی طبیعت کے چلبلے پن نے کہیں کہیں ظرافت کا چٹپٹا پن بھی دکھایا ہے، مثلاً یہ کہ "اور آدمی ہی ان کی چُراتے ہیں جوتیاں" مکمل بند اس طرح ہے:

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں　　بنتے ہیں آدمی ہی امام و خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نماز یاں　　اور آدمی ہی ان کی چُراتے ہیں جوتیاں
جو ان کو تاڑتا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

"آدمی نامہ" میں ظرافت کے ساتھ یہ طنز بھی ہے کہ آدمی مرنے کے بعد اسے نہلانے دھلانے اور کفن پہنانے کے ساتھ مردے کا کاروبار بھی وہی کرتا ہے:

مرنے میں آدمی ہی کفن کرتے ہیں تیار　　نہلا دھلا اٹھاتے ہیں کاندھے پہ کر سوار
کلمہ بھی پڑھتے جاتے ہیں روتے ہیں زار زار　　سب آدمی ہی کرتے ہیں مُردے کا کاروبار

اور وہ جو مر گیا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

نظیر آدمی کو مفلسی سے ڈراتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اسے اپنے قریب نہیں آنے دو، اس کی قربت کا مطلب ذہن و دماغ کی اداسی، فکر و خیال کی ژولیدگی اور جسم و جان کی بربادی ہے، اس کے مقابلہ میں معاشی طور پر آسودگی اور خوش حالی، آدمی کے لئے فرحت بخش ہے، یہ فرحت بخش مرحلہ جب زندگی میں آئے تو آدمی کو چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتا رہے۔ بخالت سے دور رہتے ہوئے داد و دہش کا عادی بنے، ان کی ان باتوں کا اندازہ ان کی بعض نظموں (مفلسی، خدا کی دی ہوئی نعمتیں، سخاوت و عشرت، مذمت بخل، جس کا بیان پہلے آچکا ہے) کے مطالعہ سے ہوتا ہے، اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ روپے پیسے کی محبت کو دل میں جگہ تو نہیں دینی چاہیئے لیکن اس حقیقت سے بھی صرف نظر نہیں کرنا چاہیئے کہ دنیا میں روپے پیسے کی ضرورت ہر قدم پر پیش آتی ہے، یہ اگر نہ ہو تو آدمی پریشانیوں کے جال میں پھنستا چلا جاتا ہے، سوسائٹی میں بھی اسے مقام اور اعتبار حاصل نہیں ہوتا، اس لئے آدمی اپنے دین کا لحاظ اور اپنی آبرو کا خیال رکھتے ہوئے روپے پیسے کمانے کی فکر سے خالی نہ رہے۔ وہ اپنی ایک نظم "پیسے کمانے کے بیان میں" کہتے ہیں:

پیسے ہی کا امیر کے دل میں خیال ہے　　پیسے ہی کا فقیر بھی کرتا سوال ہے
پیسا ہی فوج، پیسا ہی جاہ و جلال ہے　　پیسے ہی کا یہ تمام دنگ و دوال ہے
پیسا ہی رنگ و روپ ہے، پیسا ہی مال ہے
پیسا نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے

ایک آدمی کو اس دنیا میں اپنی جدوجہد جاری رکھنی چاہیئے، اس کے

بعد جو کچھ ملے اس پر صبر و قناعت سے کام لینا چاہیئے، صبر و قناعت سب سے بڑی دولت ہے، کسی حال میں اس دولت کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیئے۔ وہ لوگ جو حریص اور لالچی ہوتے ہیں انہیں کسی طور پر بھی سکون نہیں ملتا، وہ ہمیشہ ادھیڑ بُن میں مبتلا رہتے ہیں، ننانوے کے پھیر سے کبھی قدم نکلتا نہیں اور کبھی سیر ہوتا نہیں، نظیرؔ اپنی ایک نظم میں آدمی کو تلقین کرتے ہیں کہ اسے حرص و ہوس کے سراب سے نکل کر صبر و قناعت کی حقیقت کی طرف آنا چاہیئے:

ے صبر و قناعت ساتھ میاں سب چھوڑ یہ ہنگی لوبھ بھری
جو لوبھ کرے اس لوبھی کی نہیں کھیتی ہوتی جان ہری
سنتوکھ تو کل ہرنوں نے جب حرص کی کھیتی آن چری
پھر دیکھ تماشے قدرت کے اور لوٹ بہاریں ہری بھری

ایک آدمی کو خدا کے فیصلے پر مطمئن رہنا چاہیئے، اگر ایسا کرتا تو ویسا ہوتا اور یوں کرتا تو ووں ہوتا، اس حسرت و یاس کی راہ سے آدمی کے پاس شیطان آجاتا ہے اور ہمیشہ وہ ایسے ہی خیالات اور وسوسے میں اسے الجھاتا رہتا ہے۔ ایک با خدا آدمی کا شیوہ یہ ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی رضا کو خدا کی رضا میں گم کر دے، نظیرؔ کہتے ہیں:

راضی ہیں ہم اس میں جس میں تیری رضا ہے
یاں یوں بھی واہ واہ ہے اور ووں بھی واہ واہ ہے

آدمی کے لئے آبرو اور تندرستی کی بڑی اہمیت ہے، شیراز کے حکیم و فلسفی شیخ سعدیؔ اپنے خالق و مالک سے چھ چیزیں عطا کرنے کی التجا کرتے ہیں: علم عمل، فراخ دستی، ایمان، امان اور تندرستی۔

اے خالقِ ہر بلند و پستی　　شش چیز عطا بکن ز ہستی
علم و عمل فراخ دستی　　ایمان و امان تندرستی

واقعہ ہے کہ بیماری میں کوئی چیز بھلی نہیں معلوم ہوتی اور تندرستی میں اگر سرد پانی بھی پیو تو شیر و شہد کا مزہ دیتا ہے، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ "تندرستی ہزار نعمت ہے"۔ جہاں تک تعلق "آبرو" کا ہے تو ایک شاعر نے پر اعتماد لب و لہجہ میں خوب کہا ہے :

عشرت مٹے، جلال مٹے، کروفر مٹے　　مال و منال سارا مٹے یا کہ زر مٹے
مٹ جائے سب بلا سے نہ عزت مگر مٹے　　اک آبرو کے جینے پہ انسان مر مٹے

تندرستی اور آبرو سے متعلق نظیر کی دو طویل نظمیں ہیں، ہر دو نظم سے ایک ایک بند ملاحظہ فرمائیے :

ادنیٰ ہو یا غریب، تونگر ہو یا فقیر　　یا بادشاہ شہر کا یا ملک کا وزیر
ہے سب کو تندرستی و حرمت ہی دل پذیر　　جو تو نے اب کہا سو یہی سچ ہے اے نظیرؔ
جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

ہیں جہاں تک خلق میں پیر و جوان خرد و کبیر　　عالم و فاضل گداؤ بادشہ میر و وزیر
کیا تونگر کیا غنی کیا بے نوا اور کیا فقیر　　سب جہاں میں ہیں اسی نکتہ کے قائل اے نظیرؔ
تندرستی کو نپٹ فضلِ الٰہی بوجھئے
آبرو سے جگ میں رہنا بادشاہی بوجھئے

آدمی کے لئے نظیرؔ کا یہ پیغام ہے کہ وہ اپنی زندگی طاعت و عبادت میں گذارے، قرآن کی تلاوت اس کی زندگی کا محبوب عمل ہو، اپنے وقت کو ضائع نہ کرے، دنیا کی زندگی کو سنوارتا رہے، حدیث نبویؐ میں دنیا

کو آخرت کی کھیتی (اَلدُّنیا مَزرَعَۃُ الاٰخِرَۃِ) قرار دیا گیا ہے۔

نماز پڑھ کے ذرا صبح کے چمن کو دیکھ　　بہار باغ عنایات ذوالمنن کو دیکھ
ریاضِ روح کو اور گلستانِ تن کو دیکھ　　نعیم و راحت و آرام و پیرہن کو دیکھ
کہ ہیں خدا کے یہ الطافِ بیکراں میاں

لبوں کو زیب دے قرآں کی تلاوت سے　　خبر جو ہو تجھے افضال کی بشارت سے
خوشی ہو دل کو، ترے خلد کی طہارت سے　　بدن کا حسن بڑھا، طاعت و عبادت سے
اسی میں خوبی ہے تیری بہر مکاں میاں

یہ زندگی ہے غنیمت اسے تو مفت نہ کھو　　خدا کا شکر بجالا ہر اک طرح خوش ہو
یہ دنیا مزرعِ عقبیٰ ہے اس میں نیکی بو　　کہا نظیر نے جو کچھ تو یاد رکھ اس کو
اسی میں تیری سعادت کا ہے نشان میاں

بنجارہ نامہ نظیر کی معروف ترین اور مقبول ترین نظم ہے، اپنی اس نظم میں تمثیلاتی انداز میں موعظت و نصیحت کی ایک دنیا بسائی ہے اور آدمی کو متوجہ کیا ہے کہ زندگی کے کسی مرحلہ اور کسی منزل میں اس سے غافل نہیں ہونا چاہئے کہ اسے دنیا کے سارے جھمیلوں اور دلچسپیوں کو چھوڑ کر سوئے مرقد جانا ہے، اس لئے وہ آدمی کو چوکنا کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ع　سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

نظیر کی نظم "کلجگ" بھی کیا خوب ہے، رنگ واعظانہ، لہجہ قلندرانہ، اور ڈھنگ فقیرانہ ہے، یہ نظم آدمی کو بتاتی ہے کہ حشر میں اچھے بُرے کا تو حساب ہوگا ہی مگر یہ دنیا بھی اچھے کی جزا اور بُرے کی سزا سے خالی نہیں ہے، بقول شاعر:

عدل و انصاف فقط حشر پہ موقوف نہیں
زندگی خود بھی گناہوں کی سزا دیتی ہے،

یہ پوری نظم "مکافاتِ عمل" (عمل کا بدلہ) کے نظریہ اور فلسفہ کو پوری فکرمندی، دردمندی اور قوت و طاقت کے ساتھ پیش کرتی ہے، بیان کرنے والے بیان کرتے ہیں کہ نظیرؔ کی اس نظم کو بُرے سے بُرا اور سخت سے سخت دل ظالم بھی پڑھ لے تو تھرا اٹھے اور بُرے اعمال کا بُرا نتیجہ اس کے سامنے پھرتا نظر آئے۔

دنیا عجب بازار ہے کچھ جنس یاں کی سات لے
نیکی کا بدلہ نیک ہے بد سے بدی کی بات لے
میوہ کھلا میوہ ملے پھل پھول دے پھل پات لے
آرام دے آرام لے دکھ درد دے آفات لے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے، اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

نظیرؔ نے قانونِ مکافاتِ عمل کے بارے میں یہ بھی خوب کہا ہے:

جو اور کسی کا ارمان رکھے تو اس کو بھی ارمان ملے
جو پان کھلا دے پان ملے، جو روٹی دے تو نان ملے
نقصان کرے نقصان ملے، احسان کرے احسان ملے
جو جیسا جس کے ساتھ کرے، پھر ویسا اس کو آن ملے
کچھ دیر نہیں، اندھیر نہیں، انصاف اور عدل پرستی ہے
اس ہاتھ کرو، اس ہاتھ ملے، یاں سودا دست بدستی ہے
جو اور کسی کی جاں بخشے تو حق اس کی بھی جان رکھے

جو اور کسی کی آن رکھے تو حق اس کی بھی آن رکھے
جو یاں کا رہنے والا ہے، یہ دل میں اپنے جان رکھے
یہ ترت پھرت کا نقشہ ہے، اس نقشے کو پہچان رکھے
کچھ دیر نہیں، اندھیر نہیں، انصاف اور عدل پرستی ہے،
اس ہاتھ کرو، اس ہاتھ ملے، یاں سودا دست بدستی ہے

جو اور کا اونچا بول کرے تو اس کا بول بھی بالا ہے
اور دے پٹکے تو اس کو بھی کوئی اور پٹکنے والا ہے
بے ظلم و خطا جس ظالم نے مظلوم کو ذبح کر ڈالا ہے
اس ظالم کے بھی لہو کا پھر بہتا ندی نالا ہے
کچھ دیر نہیں، اندھیر نہیں، انصاف اور عدل پرستی ہے
اس ہاتھ کرو، اس ہاتھ ملے، یاں سودا دست بدستی ہے

نظیر کے مجموعۂ کلام کے مطالعہ سے واضح ہے کہ وہ آخرت کی زندگی کا کامل یقین رکھتے ہیں، وہ دنیا میں بسنے والے انسانوں کو اس عقیدہ کا حامل بنانا چاہتے ہیں تاکہ "حسابِ آخرت" کے خوف سے دنیا کی برائی اور ظلم و ستم میں کمی آئے، معاشرہ اور سوسائٹی میں "فساد" کی بجائے "صلاح" آئے، ان کا یہ بنیادی خیال ان کی مختلف نظموں میں اس طرح رچا بسا ہے، جیسے کہ پھول کی پتیوں میں خوشبو رچی بسی ہو، وہ ایک جگہ کہتے ہیں:

ع جو خاک سے بنا ہے وہ آخر کو خاک ہے

دوسری جگہ کہتے ہیں:

ع جب مر گئے تو آخر پھر عمر خاک پا ہے

اسی سلسلہ کی ایک نظم کا بند ہے:

پڑھ علم گئے اس دنیا میں گر کامل ذی ادراک ہوئے
اور لادکتابیں اونٹوں پر ہر معنی کے درّاک ہوئے
معقول پڑھے منقول پڑھے، ہر منطق میں چالاک ہوئے
یاں جتنے علم کے دریا ہیں ان دریا کے پیراک ہوئے
سب جیتے جی کے جھگڑے ہیں، سچ پوچھو تو کیا خاک ہوئے
جب موت سے آکر کام پڑا، سب قصے قضیے پاک ہوئے

"انتخابِ نظیر" میں ایک نظم قرآنی آیت "کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ" (ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے) کے عنوان سے ہے، اس کا پہلا بند ہے:

دنیا میں اپنا جی کوئی بہلا کے مرگیا — دل تنگیوں سے اور کوئی اکتا کے مرگیا
عاقل تھا وہ تو آپ کو سمجھا کے مرگیا — بے عقل چھاتی پیٹ کے گھبرا کے مرگیا
دکھ پا کے مرگیا، کوئی سکھ پا کے مرگیا
جیتا رہا نہ کوئی ہر ایک آکے مرگیا

نظیر کی ایک بے نظیر نظم "فنا نامہ" ہے، یہ نظم بھی نظیر کی مشہور اور مقبول نظموں میں ہے جس میں ہر آدمی کو نظیر نے تفصیل سے بتایا ہے کہ دنیا کی ہر چیز کو فنا ہے، بقا ہے تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ گرامی کو، اس نظم کا پہلا بند ہے:

دنیا میں کوئی خاص نہ کوئی عام رہے گا — نہ صاحبِ مقدور نہ ناکام رہے گا
زردار، نہ بے زر، نہ بدانجام رہے گا — شادی نہ غم گردشِ ایام رہے گا
نہ عیش، نہ دکھ درد نہ آرام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اِک نام رہے گا

نظم کے اٹھارہویں اور آخری بند میں شاعر نظیرؔ نے شاعری کی بھی تمام قسموں کو فنا کی نذر کرتے ہوئے یہ خوب کہا ہے :

یہ شعر و غزل اَب جو بناتے ہیں زبانی — آگے بھی بہت چھوڑ گئے اپنی نشانی
دیوان بنایا کوئی قِصّہ کہ کہانی — کچھ باقی نظیر اَب نہیں سب چیز ہے فانی

خمسہ نہ غزل فرد نہ ایہام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

نظیرؔ کی نظر میں آدمی کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے خالق مالک سے ہمیشہ مربوط رہے، یہ ارتباط اسے دنیوی اور اخروی اعتبار سے ارتقار کی منزل کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کی مختلف صورتوں میں مؤثر ترین صورت دعا و التجا کی ہے، دعا اور التجا ایک بندہ کے بندہ ہونے کی بڑی شناخت اور پہچان ہے کتاب " انتخابِ نظیرؔ " کا آخری عنوان "مناجاتِ باری تعالیٰ" ہے۔ اس نظم میں نظیرؔ نے شیخ سعدی شیرازیؒ کی مشہور مناجات "کریما بہ بخشائے برحال ما" کے تین اشعار پر اپنے مصرعوں سے گرہ لگائی ہے۔ تین بند پر مشتمل اس مسدس میں نظیرؔ نے آدمی کے مؤمنانہ جذبات کی بھرپور ترجمانی کی ہے، زیرِ نظر مضمون بھی اسی مناجاتی اور دعائیہ نظم پر ختم کیا جا رہا ہے۔ دیکھئے نظیرؔ ایک بندہ کی حیثیت سے بندہ نواز کی بارگاہ میں کس قدر نیاز مندانہ حاضر ہوتے ہیں :

سدا دل سے اے مؤمن پاکباز — وضو کر کے پڑھ صبح و وقتی نماز
بوقت مناجات با صد نیاز — یہ کہہ اپنے ہاتھوں کو کر کے دراز

کریما بہ بخشائے برحال ما
کہ ہستم اسیرِ کمندِ ہوا

الٰہی تو ستار و غفار ہے　　مرا یاں گناہوں سے انبار ہے
نہ حامی کوئی نہ مددگار ہے　　اب اس بے کسی میں تو ہی یار ہے

نہ داریم غیر از تو فریادرس
توئی عاصیاں را خطا بخش وبس

ہوئے جرم تجھ سے صغیر و کبیر　　پڑا ہے تو دامِ گنہ میں اسیر
ذرا خوابِ غفلت سے چونک اے نظیر　　دعا مانگ جلد اور کہہ اے خبیر

نگہدار ما را ز راہِ خطا
خطا درگذار و صوابم نما

اوپر شیخ سعدی کے جو فارسی اشعار آئے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:

"اے کریم آقا! میں ہوا و ہوس کے پھندے میں قید ہوں ہمارے حال پر رحم کرتے ہوئے اس صورتِ حال سے نجات دے اور گناہوں کو بخش دے، تیرے سوا ہمارے گناہوں کو کوئی بخشنے والا نہیں ہے، تو ہی ہے جو ہماری فریاد کو سن سکتا ہے، گناہ کے راستوں سے ہمیں بچا، قصور معاف کر دے اور راہِ راست پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔"

انسان، انسانیّت اور شاعر

انسان اُنس سے ہے اور اُنس کے معنی محبّت کے آتے ہیں، اس لحاظ سے وہی آدمی انسان کہلائے جانے کا مستحق ہے جو محبّت رکھنے والا ہو، دوسروں کی خوشی کو اپنی خوشی اور دوسروں کے غم کو اپنا غم تصوّر کرتا ہو، اپنی ہی خوشی میں مَست رہنا اور اپنے ہی غم کو غم سمجھنا اور دوسروں کی خوشی اور غم سے بے نیاز رہنا، اس سے انسان کی انسانیّت کا تعارف نہیں ہوتا۔

حکیم و دانا سعدی شیرازیؒ نے ایک جگہ نہایت بلیغ انداز میں یہ تصوّر دیا ہے کہ نسلِ انسانی کی بُنیاد حضرت آدمؑ ہیں، تمام آدمی کا سلسلۂ نسب انہیں پر ختم ہوتا ہے، ہر آدمی کی تخلیق (پیدائش) کا انداز بھی یکساں ہے، یہ تاریخی تسلسل اور فطری عمل اشارہ دیتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں ایک آدمی دوسرے آدمی سے مِل کر رہے، میل ملاپ کا یہ ماحول اس قدر طاقتور ہو کہ اگر ایک انسان کو کوئی تکلیف پہنچے تو دوسرا انسان بے قرار ہو جائے، یہ بے قراری اس انداز کی ہو جس انداز کی بے قراری جسم کے دوسرے حصے محسوس کرتے ہیں جب اس کے کسی ایک حصہ کو تکلیف پہنچتی ہے، اگر کوئی

انسان اپنے جیسے کسی انسان کے درد کو نہیں سمجھتا اور مصیبت کے وقت اس کے کام نہیں آتا ہے تو اس انسان کا نام ہی انسان کیوں رکھا جائے۔ یہی وہ جذبۂ انسانیت ہے جن کو نگاہ میں رکھتے ہوئے حالی کے "شاعرِ دل" نے یہ حال بیان کیا ہے :

ہو فرشتہ بھی تو نہیں انسان
درد تھوڑا بہت نہ ہو جس میں

فرشتوں سے بہتر ہے انسان ہونا
مگر اس میں ہوتی ہے محنت زیادہ

بشر پہلو میں دل رکھتا ہے جب تک
اسے دنیا کا غم کھانا پڑے گا

گر، رہا چاہتے ہو عزّت سے
بھائیوں کو نکالو غربت سے

شبلی انسان کے احساسِ ذمّہ داری کو اس طرح جگاتے ہیں :

بے کسوں کو میں ستاؤں کیوں کر
مجھ کو دینا ہے قیامت میں جواب

شاعرِ اقبال کا "شاعر" کے عنوان کے تحت یہ نرالا انداز بھی دیکھئے :

قوم گویا جسم ہے، افراد ہیں اعضائے قوم
منزلِ صنعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم

محفلِ نظمِ حکومت، چہرۂ زیبائے قوم
شاعرِ رنگین نوا ہے، دیدۂ بینائے قوم

مبتلائے درد کوئی عضو ہو، روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ
سمجھا لہو کی بوند اگر تو اسے تو خیر
دل آدمی کا ہے فقط اِک جذبۂ بلند
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر! اے چہرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

اقبالؔ نے مغربی مفکرین کے ساتھ اسلامی مفکرین میں رومیؔ، رازی، ابن سینا، ابن عربی، جمال الدّین افغانی وغیرہ سے استفادہ کیا ہے، لیکن جب انہوں نے ان کے خیالات کا قرآنِ حکیم کی روشنی میں محاکمہ کیا تو انہیں اسلام ایک مکمل نظامِ حیات معلوم ہوا، جس میں انسانی مساوات و اخوّت، انسانی ہمدردی و محبّت، انسانی عظمت و انسانی فلاح کو بُنیادی اہمیّت حاصِل ہے، یہ نظام رُوحانی و مادّی دونوں اعتبار سے انسان کو منتہائے کمال تک لے جانا چاہتا ہے اقبالؔ کے اس طرزِ فکر کو ڈاکٹر عبادت بریلوی اِن الفاظ میں واضح کرتے ہیں :-

"اقبالؔ انسان کو ایک اہم انسانی تحریک سمجھتے ہیں، یہ تحریک ان کے خیال میں انسان دوستی کا سبق دیتی ہے، مسلک کے تفرقہ کو مٹانا چاہتی ہے، طبقاتی تفریق کو ختم کرنا چاہتی ہے، انسان کو صحیح معنوں میں انسان بنانا چاہتی ہے۔ اقبالؔ اس تحریک کے مفکر ہیں، اس کے ترجمان ہیں، اس کے علمبردار ہیں، ان کا پیغامِ انسان

دوستی ان افراد کے لئے بھی ہے جو اس تحریک کے مخالف ہیں، جو انسانی برادری کے اس رشتے میں منسلک ہونا نہیں چاہتے، اقبالؔ انہیں دعوت دیتے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کے جلال و جمال دونوں کی آب و تاب دکھاکر انہیں اپنی جانب کھینچتے ہیں تاکہ انسانیت کی تعمیر صحیح اقدار پر ہوسکے۔ اقبالؔ کی نظریں یہ دیکھتی ہیں کہ انسانیت گھائل ہے، قومی و نسلی اور ملکی تفریق نے اسے زخموں سے چور کر دیا ہے، ان کی تعلیم ان زخموں پر مرہم رکھنے اور اس طرح ان کو مندمل کرنے کی تعلیم ہے۔" (جدید شاعری، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، صفحہ ۱۵۶)

مذکورہ بالا دعوے کی تائید میں اقبالؔ کی مشہور نظم "طلوعِ اسلام" سے اِن اشعار کو پیش کیا جا سکتا ہے:

تو رازِ کن فکاں ہے، اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا
ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کے
اخوّت کا بیاں ہو جا، محبّت کی زباں ہو جا
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل، اُچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اُڑنے سے پہلے پَر فشاں ہو جا

خودی میں ڈوب جا غافل! کہ یہ سرِّ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا
مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبّت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا
ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے
نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے
تدبّر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدّن کی بنا سرمایہ کاری ہے
عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنّم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اقبالؔ قرآن کے تصوّرِ انسان کے قائل ہیں جو انسان کو نیک نہاد تسلیم کرتا ہے اور اس کی شرافت اور فضیلت کا پرچم بلند کرتا ہے، فرشتے جب آدمؑ کو جنت سے رخصت کرتے ہیں تو اُن کی زبان پر انسان کی فضیلت کے نغمے ہیں:

سُنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن
تیری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی
گراں بہا ہے تیرا گریۂ سحر گاہی
اسی سے ہے تیرے نخلِ کُہن کی شادابی

اقبالؔ کے بعد اکبرؔ کی طرف آئیں تو وہ یہ تلقین کرتے ہوئے نظر آتے ہیں :

اونچا نیت کا، اپنی زینہ رکھنا
احباب سے صاف اپنا سینہ رکھنا
غصّہ آنا تو نیچرل ہے اے اکبرؔ
لیکن ہے شدید عیب کینہ رکھنا

بنو گے خسروِ اقلیم، دل شیریں زباں ہوکر
جہانگیری کرے گی یہ ادا نورِ جہاں ہوکر
دلوں کا قرب حاصل کیجئے راحت رساں ہوکر
نفس سینے میں جا پاتی ہے یوں آرامِ جاں ہوکر
بدی طینت کی چھُپ سکتی نہیں شیریں زبانی سے
دل اچھّا ہو تو نبھ جاتی ہے شاید بد زباں ہوکر

اکبرؔ یہ اصول بیان کرتے ہیں :

دل کو پہنچائے جو ایذا وہ نہیں ہے اہلِ دل
ظلم کا باعث جو ہو، درد آشنا کیوں کر ہوا

شاعری کی دُنیا میں میرؔ کو میرِ مجلس کی حیثیت حاصل ہے، دیکھئے کہ آدمِ خاکی کے مرتبہ کو وہ کس بلندی تک پہنچاتے ہیں، شاید دُنیا

کی کسی بھی زبان کی شاعری میں ایسی بلندی تک انسان کے مرتبہ کو نہ پہنچایا گیا ہو:

آدمِ خاکی سے عالم کو جِلا ہے ورنہ
آئینہ تھا یہ ولے قابلِ دیدار نہ تھا

وہ یہ بھی کہتے ہیں:

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

میرؔ کے خیال کا یہ انداز بھی دیکھئے:

ہم نے یہ مانا کہ واعظ ہے مَلک
آدمی ہونا بہت مشکل ہے میاں

میرؔ کہتے ہیں کہ دُنیا عارضی ہے، یہاں کے بکھیڑے (مجہلہ) بھی چند روزہ ہیں، اس حالت میں عقل و دانش کا تقاضا ہے کہ سب کے ساتھ حُسنِ سلوک سے پیش آیا جائے:

چار دن کا یہ مجہلہ ہے سب
سب سے رکھئے سُلوک ہی ناچار

غالبؔ چاہتے ہیں کہ آدمی کو انسانیّت کی منزل ملے:

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

آدمی نامہ، نظیرؔ کی شاعری کا بے نظیر نمونہ ہے، تمام انسانوں کے درمیان مساوات اور برابری کا درس دیتے ہوئے اپنی اس نظم کے ایک بند میں کہتے ہیں:

دُنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مُفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار و بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ظفر کے یہ دو شعر تو ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں :-

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر
رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی بُرائیوں پر جو نظر
تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

ظفر آدمی اس کو نہ جانئے گا
ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی
جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

ذوق یہ آئینہ دکھاتے ہیں :

کِسی بے کس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا
جو آپ ہی مر رہا ہو، اس کو گر مارا تو کیا مارا
بڑے موذی کو مارا نفسِ امّارہ کو گر مارا
نہنگ و اژدہا و شیرِ نر مارا تو کیا مارا

ذوق کے یہ اشعار بھی نگاہ کی راہ سے دل میں اُتارنے کے قابل ہیں :

اگر انسان قانع ہو، غنی ہووے دوعالم سے
ہوا و حرص لیکن اس کی مٹی خوار کرتی ہے
کتنے مفلس ہوگئے، کتنے تونگر ہوگئے
خاک میں جب مل گئے، دونوں برابر ہوگئے
وہ دل کہ جس میں سوزِ محبّت نہ ہووے ذوق
بہتر ہے اس سے سنگ کہ اس میں شرر تو ہے

انیسؔ کہتے ہیں کہ انسان کو دُنیا میں عجز و انکساری کے ساتھ رہنا چاہیئے:

کم مایہ، کمال اپنا جتا دیتا ہے اکثر
جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے اکثر
آفاق میں یوں فیضِ نگیں عام نہ ہوتا
ہوتا نہ فروتن تو کبھی نام نہ ہوتا
خیالِ خاطرِ احباب چاہیئے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

دبیرؔ کی یہ چند رُباعی بھی رازِ حیات کو سمجھانے کے ساتھ اخلاق و انسانیّت کا بہت اونچا درس دیتی ہے:

کم مایہ سبک پیش جہاں ہوتا ہے
میزاں سے بدیہی یہ عیاں ہوتا ہے
خُردوں سے تواضع ہے بزرگی کی دلیل
جُھکتا ہے وہ پلّہ جو گراں ہوتا ہے

ادنیٰ سے جو سر جھکائے، اعلیٰ وہ ہے
جو خلق سے بہرہ ور ہے، دریا وہ ہے
کیا خوب دلیل ہے یہ خوبی کی دبیر
سمجھے جو بُرا آپ کو اچھّا وہ ہے

معدوم کی کیوں دل پہ گرانی کیجئے
موجود پہ کیوں نہ شادمانی کیجئے
نے غم کو بقا، نہ شادمانی کو ثبات
جس طرح ہو بسر، زندگانی کیجئے

آتش کی یہ نصیحت ہے:

خیال تن پرستی چھوڑ فکرِ حق پرستی کر
نشاں رہتا نہیں ہے نام رہ جاتا ہے انساں کا

دبستانِ لکھنؤ سے تعلق رکھنے والے ایک شاعر، اعظم علی اعظم پستی اور بلندی کا فلسفہ بیان کرتے ہیں:

دیکھا تو خاکسار کا رتبہ بلند ہے
دریا ہے پست، ساحلِ دریا بلند ہے

اِن انسانی قدروں کو اجاگر کرنے والے اشعار کے ساتھ میر دوست علی خلیل (لکھنؤ) کا یہ حکیمانہ شعر بھی دیکھئے:

کیا درد سے واقف ہو وہ بے درد کہ جس کے
کانٹا ہی چُبھا ہے نہ کوئی پھانس گڑی ہے

سیماب اکبرآبادی جنگ کو انسان کے لئے تباہ کن قرار دیتے ہیں اور امن و عافیت کے لئے اپنی آرزو کو شعر کا پیراہن اس طرح

عطا کرتے ہیں :

یہ بے تابی یہ بے چینی یہاں کیوں ہو وہاں کیوں ہو
لحاظِ آدمیّت ہو تو انساں رائیگاں کیوں ہو
فنائے امن نے برہم کیا ہے امنِ ہستی کو
نہ ہو ایسا تو دُنیا، مائلِ آہ و فغاں کیوں ہو

پنڈت دتاتریہ کیفی کا یہ فکر انگیز شعر ہے :

یوں اگر دیکھئے کیا کچھ نہیں یہ مشتِ غُبار
اور اگر سوچئے، تو خاک بھی انساں میں نہیں

چکبست ایک مقام پر صرف اس مذہب اور اس شریعت کو قابلِ اعتبار قرار دیتے ہیں جو انسانوں سے محبّت کرنا سکھاتی ہے

پس قابلِ تسلیم اسی کی ہے شریعت
جس دل میں ہے انساں کے لئے دردِ محبّت

وہ یہ بھی کہتے ہیں :

دردِ دل، پاسِ وفا، جذبۂ ایماں ہونا
آدمیّت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

محبّت اور انسانیّت جگرؔ کی شاعری کا مستقل موضوع ہے اور ضرورت ہے کہ کسی الگ عنوان کے تحت اس پر اظہارِ خیال کیا جائے، تاہم یہاں جگرؔ کے صرف تین اشعار درج کر کے زیرِ نظر موضوعاتی مطالعہ کے ایک حصّہ کو ختم کیا جاتا ہے :

رِندی کے لئے ہے نہ عبادت کے لئے ہے
انساں محبّت ہے، محبّت کے لئے ہے

ہے یہی عین دوستی اپنی طرف سے اے جگرؔ
دستِ کرم بڑھائے جا غیر کی دُشمنی نہ دیکھ

جگرؔ انسانی معراج کا یہ کتنا بلند تصوّر دیتے ہیں :

عرش تک ہو نہیں سکتی جو رسائی نہ سہی
یہی انساں کی ہے معراج کہ انساں ہو جائے

بہادر شاہ ظفرؔ اور اُن کی شاعری

انسانؔ اور انسانیتؔ کی تلاش

اِنسان مخدومِ کائنات ہے، ذرہ سے لے کر آفتاب تک ہر چیز اس کی خدمت پر کمربستہ ہے، تسخیرِ کائنات کے فن اور ہنر سے آشنا کیا گیا ہے، وہ کائنات میں خدائی تخلیق کا شاہکار بھی ہے۔ اسے بارگاہِ الٰہی سے شرف و کرامت کا تمغہ بھی ملا ہے، اسی بارگاہ سے وہ مسجودِ ملائک بھی بنایا گیا ۔

؎ کچھ بھی نہیں اور سب کچھ ہوں پر دیکھو چشمِ حقیقت سے
میں ہوں ظفرؔ مسجودِ ملائک، گرچہ خاک کا پتلا ہوں

لیکن اونچی شان کا یہ انسان گراوٹ پر آتا ہے تو اس کے سامنے درندہ صفت حیوان بھی شرما جاتا ہے۔ بقول احسان دانشؔ :

؎ قلبِ انساں نے وہ استبداد کا پکڑا ہے رنگ
دیکھ کر جس کو گرگٹے جاتے ہیں غیرت سے پلنگ

بہترین ساخت پر پیدا کئے جانے والا اونچی شان کا یہ انسان گھٹتا ہے اور گراوٹ پر آتا ہے تو کہاں تک پہنچتا ہے، اس کی منظر کشی ایک دیدہ ور اور بالغ نظر انسان نے خوب کی ہے :۔

"بہترین ساخت پر پیدا کئے جانے کے بعد جب انسان اپنے جسم اور ذہن کی طاقتوں کو بُرائی کے راستے میں استعمال کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے بُرائی ہی کی توفیق دیتا ہے اور گراتے گراتے اسے گراوٹ کی اس انتہا تک پہنچا دیتا ہے کہ کوئی مخلوق گراوٹ میں اس حد کو پہنچی ہوئی نہیں ہوتی۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو انسانی معاشرے کے اندر بکثرت مشاہدے میں آتی ہے۔ حرص، طمع، خود غرضی، شہوت پرستی، نشہ بازی، کمینہ پن، غیض و غضب اور ایسی ہی دوسری خصلتوں میں جو لوگ غرق ہو جاتے ہیں، وہ اخلاقی حیثیت سے فی الواقع سب نیچوں سے نیچ ہو کر رہ جاتے ہیں، مثال کے طور پر صرف اسی ایک بات کو لے لیجئے کہ ایک قوم جب دوسری قوم کی دشمنی میں اندھی ہو جاتی ہے تو کس طرح درندگی میں تمام درندوں کو مات کر دیتی ہے۔ درندہ تو صرف اپنی غذا کے لئے کسی جانور کا شکار کرتا ہے جانوروں کا قتلِ عام نہیں کرتا، مگر انسان خود اپنے ہی ہم جنس انسانوں کا قتلِ عام کرتا ہے۔ درندہ صرف اپنے پنجوں اور دانتوں سے کام لیتا ہے مگر یہ احسنِ تقویم پر پیدا ہونے والا انسان اپنی عقل سے کام لے کر توپ بندوق، ٹینک، ہوائی جہاز، ایٹم بم، ہائیڈروجن بم اور دوسرے بے شمار ہتھیار ایجاد کرتا ہے، تاکہ آن کی آن میں پوری پوری بستیوں کو تباہ کر کے رکھ دے، درندہ صرف زخمی یا ہلاک کرتا ہے مگر انسان اپنے ہی جیسے انسانوں کو اذیت دینے کے ایسے ایسے دردناک طریقے

اختراع کرتا ہے جن کا تصور بھی کبھی کسی درندے کے دماغ میں نہیں آسکتا، پھر یہ اپنی دشمنی اور انتقام کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لئے کمینہ پن کی اس انتہا کو پہنچتا ہے کہ عورتوں کے ننگے جلوس نکالتا ہے۔ ایک ایک عورت کو دس دس بیس بیس آدمی اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں۔ باپوں، بھائیوں اور شوہروں کے سامنے ان کے گھر کی عورتوں کی عصمت لوٹتے ہیں، بچوں کو ان کے ماں باپ کے سامنے قتل کرتے ہیں، ماؤں کو اپنے بچوں کا خون پینے پر مجبور کرتے ہیں، انسانوں کو زندہ جلاتے اور زندہ دفن کرتے ہیں۔ دنیا میں وحشی سے وحشی جانوروں کی بھی کوئی قسم ایسی نہیں ہے جو انسان کی اس وحشت کا کسی درجہ میں بھی مقابلہ کرسکتی ہو۔"

انسان کے یہی وہ غیر انسانی سیاہ کرتوت ہیں، جن کی وجہ سے ایک شاعرِ محبت و انسانیت کو یہ کہنا پڑا:

ہر چند کائناتِ دو عالم میں اے جگرؔ
انساں ہی ایک چیز ہے، انساں مگر کہاں

جگرؔ ہی کے یہ دو شعر ہیں:

جہلِ خرد نے یہ دن دکھائے — گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے
کارِ زمانہ جتنا جتنا — بنتا جائے بگڑتا جائے

جگرؔ کا یہ شعر بھی غضب کا ہے:

کیا قیامت ہے کہ اس دورِ ترقی میں جگرؔ
آدمی سے آدمی کا حق ادا ہوتا نہیں

پھر ملک الشعراء غالبؔ نے یہ کہہ کر تو کمال ہی کر دیا :

؎ بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

معلوم ہوا کہ انسان کا بنیادی، جوہری اور امتیازی وصف "انسانیت" ہے۔ یہ وصف اگر انسان کے اندر ہے تو اس کے پاس کچھ نہ رہتے ہوئے بھی سب کچھ ہے اور اگر یہ نہیں ہے تو اس کے پاس سب کچھ رہتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہے۔ انسان کے اندر انسانیت کس قدر ہے؟ اس کا اظہار اس کے اعمال، اخلاق، اطوار، عادات، معاملات، نشست و برخاست اور شب و روز کے لمحات سے ہوتا رہتا ہے۔ اچھے انسان کی پہچان یہ ہے کہ اپنے جیسے انسان سے وہ اُنس رکھتا ہے، صلح، رواداری، امن و سلامتی اور نفع رسانی کے جذبات سے اس کا سینہ موجزن رہتا ہے، خدمتِ خلق کو عبادت کا درجہ دیتا ہے۔ اس کے نزدیک کسی کی دل داری "حجِ اکبر" سے کم نہیں ہوتی ہے۔ ہر قسم کی اذیت رسانی سے اپنی زبان اور اپنے ہاتھ کو روکے رکھتا ہے، کسی کی دل خراشی نہیں کرتا، ظلم اور ناانصافی کے قریب نہیں جاتا، افواہ طرازی اور الزام تراشی کی خُو اس کے اندر نہیں ہوتی ہے، کسی کی عزت و آبرو سے نہیں کھیلتا، دوسروں کی بہو بیٹی اور بہن کو اپنی بہو بیٹی اور بہن کا درجہ دیتے ہوئے ان کو ہوس کا نشانہ بنانا کیا، ان کی طرف نگاہِ غلط بھی نہیں اٹھاتا، نفاق اور شقاق سے اپنے دل کے آئینہ کو میلا نہیں کرتا، ناحق قتل نہیں کرتا، عورتوں کو کم جہیز لانے پر یا ان سے بعض شکایتوں کے ہونے پر زندہ نہیں جلاتا، یا کچل کچل کر نہیں مارتا۔ کسی کی زمین اور جائیداد پر

ناجائز قبضہ نہیں کرتا، جھوٹے مقدمے میں کسی کو نہیں پھانستا، غیظ و غضب میں آپے سے باہر نہیں ہوجاتا، خود بینی اور بدبینی سے اجتناب کرتا ہے، کبر و غرور اور عجب سے بچتے ہوئے انکسار، تواضع اور ملنساری کی صفت کو اپناتا ہے، حسنِ سلوک میں اہلِ دولت اور اصحابِ ثروت ہی کو نہیں بلکہ غربت زدہ لوگوں اور بچھڑے ہوئے انسانوں کو بھی اہمیت دیتا ہے اور ایسے لوگوں میں رہ بس کر اور ان کی ضرورتوں کی تکمیل کرکے اپنے خدا کو پانے کی کوشش کرتا ہے، آئینِ عدل و مساوات کا پابند ہوتا ہے، خاندان اور قبیلہ کی تقسیم کو "تعارف" (شناخت اور جان پہچان) کا درجہ دیتا ہے، نہ کہ اسے اپنے لئے "تفاخر" (ایک دوسرے پر فخر کرنا) کا ذریعہ سمجھتا ہے۔

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا، اس کی بہترین ترجمانی پنڈت برج نرائن چکبست کے اس شعر سے ہوتی ہے:

؎ دردِ دل، پاس وفا، جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

اردو شاعری یا کلام شعراء کے موضوعاتی مطالعہ میں (جس میں ایک شاعر، ایک موضوع کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے) اسی موضوع یعنی "انسان اور انسانیت" کا انتخاب کیا گیا ہے۔ آج کی دنیا میں یہ موضوع مختلف اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ تازہ رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے واقعات میں تقریباً دگنا اضافہ ہوگیا ہے۔ قومی انسانی حقوق کمیشن کی سالانہ رپورٹ جو حال ہی میں پارلیمنٹ میں پیش کی گئی ہے، اس سے واضح ہے کہ ۹۷ - ۱۹۹۶ء میں کمیشن

کو (۱۹۵۰ء) شکایات انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی وصول ہوئی ہیں، ہمارے نصابِ تعلیم میں "ماحولیات" کو مستقل مضمون کی حیثیت سے شامل کرنے پر غور کیا جارہا ہے، مگر "اخلاقیات" کے لئے کوئی جگہ نہیں نکالی جارہی ہے، اخبارات میں بھی ایسے مضامین کم ہی جگہ پاتے ہیں، البتہ اخلاق سوز حرکتوں اور غیر انسانی وحشت ناک کرتوتوں کی خبریں نمایاں جگہ حاصل کرتی ہیں، الکٹرانک میڈیا بھی خاموش ہے، کبھی کوئی چیز آبھی جاتی ہے تو ایسے ہی جیسے سیاہ بادل کے اوٹ سے بجلی کوند گئی ہو، علماء، مصلحین، دانشور، شعراء، سبھوں کے لئے ضروری ہے کہ اپنے اپنے انداز سے انسان کے "انسانی جذبات" کو پروان چڑھائیں اور ہر سطح کے لوگوں کو انسانی قدروں سے روشناس کرائیں۔ دلِ دردمند اور فکرِ ارجمند رکھنے والے عالم اسلام کے بلند پایہ عالم دین کی "تحریکِ پیام انسانیت" کا قیام اسی پسِ منظر میں عمل میں آیا ہے جسے وقت کی اہم ترین ضرورت سمجھ کر توسیع دینا اور استحکام بخشنا ہر انسانیت پسند کا کام ہے۔

جہاں تک تعلق بہادر شاہ ظفر کا ہے تو واقعہ ہے کہ ایک شاعر کی حیثیت سے انہوں نے اپنی شاعری میں انسان کے مرتبے کو بہت بلند و بالا بتایا ہے۔ ظفر کو انسان، انسانیت، اخلاق اور اخلاقی اقدار سے دلچسپی شاید ان کے متصوفانہ ذہن و فکر کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی، ان کا شغفِ تصوف اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ باضابطہ بیعت بھی کرنے لگے تھے، لال قلعہ میں باقاعدہ تصوف کے درس ہوتے تھے، اور ظفر خود رموز و نکات بیان کرتے تھے، ان کا یہی وہ ذوقِ تصوف

ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنی کم عمری ہی میں مولانا فخر الدین سے بیعت ہو گئے تھے، ان کے بعد ان کے فرزند مولانا قطب الدین اور پوتے نصیر الدین عرف کالے صاحب سے بھی برابر عقیدت و موٴدت جاری رکھے ہوئے تھے۔ ظفر نے بے شمار اشعار ان بزرگوں کی شان میں کہے ہیں اور اپنی بے پایاں محبت کا اظہار کیا ہے:

؎ مریدِ قطب دیں ہوں خاکِ پائے فخر دیں ہوں میں
اگرچہ شاہ ہوں، ان کا غلام کم ترین ہوں میں

بہادر شاہ ظفر (۱۸۶۲ــ ۱۷۷۵ء) کے بارے میں اتنی بات تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ یہ اکبر شاہ ثانی کے بیٹے تھے اور دلی کے آخری تاجدار، ان کا پورا نام ابو المظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ غازی ہے۔ یوں تو ہندوستان کی سلطنت ان کے دادا شاہ عالم کے عہد میں ہی ہاتھ سے نکل چکی تھی مگر برائے نام سہی بادشاہ مانے جاتے تھے، اور لال قلعہ میں شاہانہ سطوت و حشمت کے ساتھ حکومت کرتے اور شعر و سخن کی محفلیں منعقد کرتے تھے۔ شاعری سے فطری لگاؤ نوعمری ہی سے قائم ہو گیا تھا، جس کا سلسلہ آخری دم تک باقی رہا۔

؎ طبیعت ہے جواں پیری میں بھی وہ اے ظفر تیری
سخن فہمی، سخن سنجی، سخن دانی نہیں جاتی

ظفر نے پہلے شاہ نصیر سے اصلاح لی اور بعد میں ذوق کے شاگرد ہوئے۔ زبان اور محاورہ اور سلاست و سادگی، ان کے کلام کی خصوصیات ہیں، غزلیں، مسدّس، مخمّس، مثلّث، سہرا، سلام سب ہی لکھے، مستزاد بھی ہیں، اکثر طویل بحروں میں لکھا کرتے تھے،

کلام ان کا مطبوعہ ہے، جس کی وجہ سے کل کی طرح آج بھی ان کا فیض سخن جاری ہے۔ ؎

زمانے میں جو کہلاتے ہیں شاعر آج کل اچھے
ظفرؔ رتبہ ملا ان کو ترے فیضِ سخن سے ہے

ظفرؔ کی ابتدائی شاعری میں عیش و طرب ہے، رنگینیاں اور قہقہے ہیں، شگفتگی اور خوش مزاجی کی پھواریں ہیں، بعد میں جب ان کے ارمانوں کی دنیا خونچکا ہونے لگی، شدائد اور مصائب کے وہ گھیرے میں آگئے، آسانیاں سختیوں میں بدلنے لگیں تو مایوسی نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا، ان کا یاس انگیز کلام دراصل اسی دور کی یادگار ہے۔ مطالعہ نگار کو ان کی شاعری میں دونوں طرح کے نمونے ملتے ہیں:

○ بہکانے والے آپکے سب یار بن گئے
سمجھانے والے مفت گنہگار بن گئے

○

نہ بھیجا تم نے لکھ کر ایک پرچہ
ہمارے دل کو پرچا یا تو ہوتا

○ الٰہی محتسبِ سنگ دل کے ٹوٹیں ہاتھ
کہ توڑتا ہے یہ جام و سبو تراق پڑاق

○ یار نہیں، غمخوار نہیں، ہمدرد ظفرؔ اب کوئی نہیں
کنجِ غم میں آپ ہی کہئے دل کو مرے بہلائے کون

○ میں نہیں ہوں نغمۂ جانفزا مجھے سن کے کوئی کرے گا کیا،
میں بڑے بروگ کی ہوں صدا، میں بڑے دکھی کی پکار ہوں

○ شب و روز پھول میں جو تُلے، کہو خارِ غم کو وہ کیا سہے
ملے طوق قید میں جب انہیں، کہا گُل کے بدلے یہ ہار ہے

ظفر نے ہندوستان کی جنگِ آزادی میں بڑے رنج اٹھائے اور آخر کار رنگون میں جلاوطن کر دیئے گئے اور وہیں بے کسی کی موت پائی، اپنی زندگی کی بے چارگی کو دیکھتے ہوئے نہایت حسرت و یاس کے ساتھ وفات سے پہلے کہا تھا:

؎ کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لئے
دو گز زمیں بھی مل نہ سکی کوئے یار میں

حاصل یہ کہ ظفر بادشاہ تھے، صوفی تھے، شاعر تھے، صاحبِ زبان تھے، پاکباز تھے، مبتلائے غم تھے، مظلومِ زمانہ تھے، دردمند تھے اور انسانیت نواز تھے۔ آئیے! دیکھیں کہ مغلیہ سلطنت کے آخری بادشاہ ظفر "انسان اور انسانیت" کے موضوع پر کیا کہتے ہیں اور کس انداز سے کہتے ہیں، شاہ ظفر ٹوٹا ہوا دل رکھتے تھے، ٹوٹے ہوئے دل کی صدا یقیناً عام انسانی دل پر دستک کا کام کرے گی اور "از دل خیزد، بر دل ریزد" کا مصداق بنے گی۔

"دیوانِ ظفر" سے ہم نے جو اس موضوع کے لئے اشعار منتخب کئے ہیں، وہ یہ ہیں:

○

اتنا نہ اپنے جامے سے باہر نکل کے چل
دنیا ہے چل چلاؤ کا رستہ سنبھل کے چل

کم ظرف، پُرغرور، ذرا اپنا ظرف دیکھ
مانندِ جوشِ خُم نہ زیادہ اُبل کے چل

فرصت ہے اک صدا کی یہاں سوزِ دل کے ساتھ
اس پر سپندوار نہ اتنا اچھل کے چل

یہ غول وش ہیں، ان کو سمجھ تو نہ رہنما
سایہ سے بچ کے اہلِ فریب و دغل کے چل

اوروں کے بل پہ بل نہ کر اتنا نہ چل نکل
بل ہے تو بل کے بل پہ تو کچھ اپنے بل کے چل

پھر آنکھیں بھی تو دی ہیں کہ رکھ دیکھ کر قدم
کہتا ہے کون تجھ کو نہ چل، چل سنبھل کے چل

○ اس کو انساں مت سمجھ، ہو سرکشی جس میں ظفرؔ
خاکساری کے لئے خاک سے انساں بنا

○ اے ظفرؔ خاک سے انساں کا بنا ہے پُتلا
خاکساری ہی سے دنیا میں ہے انساں کی نمود

○ تمہارے ہاتھ دولت آگئی ہے خاکساری کی
ظفرؔ تم کیوں نہ لے کر ہاتھ میں اکسیر رکھ دو

○ کہاں ہیں وہ اگلی ملاقات والے
عنایات والے، مدارات والے

○ انساں ہے وہی جس میں ہو انساں کی سیرت
ہیں یوں تو ہزاروں ظفرؔ انساں کی صورت

○ ہو نہ انسانیت انساں میں تو پھر انساں ہے کب
اے ظفرؔ گرچہ ہو اظاہر میں وہ انساں کی شکل

○ جوشِ جنگ و جدل پہنے تو کس کے واسطے
ہم تو بیٹھے ہیں ردائے صلح کل اوڑھے ہوئے

○ نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر، رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پہ جو نظر، تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

○ آدمی کو چاہیے آدم شناسی اے ظفرؔ
ہے یہ فرمودہ ہمارے حضرت تیمور کا

○ ظفرؔ کو باز رکھ اعمالِ بد سے
خطا بخشا، کرم گارا، الٰہا

○ بے تمیزی ہے یہاں تک کہ زمانے میں ظفرؔ
نہ وہ تنظیم سی شئی ہے نہ وہ آداب سی چیز

○ بُرائی یا بھلائی گو ہے اپنے واسطے لیکن
کسی کو کیوں کہیں ہم بد کہ بدگوئی سے کیا حاصل

○ اے ظفرؔ چاہیے انساں کو کہے ایسی بات
کہ بُرا بھی نہ کہے کوئی مگر اچھا نہ کہے

○ نہ ہوئے جب تلک انساں کے دل سے میل یک جانب
ظفرؔ لوگوں کو دکھلانے کو یکسوئی سے کیا حاصل

○ جو دِل کو صاف ہو کرنا، تو خاکساری کر
کرے ہے خاک سے دیکھ آئینہ، صفا حاصل

○ میری ملّت ہے محبت، میرا مذہب عشق ہے
خواہ ہوں میں کافروں میں خواہ دینداروں میں ہوں

○ عیب و ہنر نہ پوچھو تم آدمی میں کیا ہے
تم میں بھی کچھ نہ کچھ ہے پیارے ہمیں میں کیا ہے

○ بنایا اے ظفرؔ خالق نے کب انساں سے بہتر
مَلک کو، دیو کو، جن کو، پری کو، حُور و غلماں کو

○ آدمی کہتے ہیں جن کو کم ہیں دنیا میں وہ لوگ
یوں تو سب اولادِ آدم سے یہ بستی ہے بھری

○ خوبیٔ جوہر سے ہے انساں کی قدر و منزلت
اور اس میں خوب جوہر کچھ نہیں تو کچھ نہیں

○ ڈھونڈو تو زمانے میں نہیں مہر و محبت
کس طرح کام آیا ہے ظفرؔ ہائے زمانہ

○ ظفرؔ ایسی نہیں ہے کوئی محفل اس زمانے میں
جہاں کچھ حرف گیری اور سخن چینی نہیں ہوتی

○ کوچۂ حرص میں لے جائے نہ انساں کو خدا
کہ وہاں تو سگِ دنیا ہیں بھنبھوڑتے کھاتے

○ ظفرؔ ہے خاک کا پتلا یہ انساں
پر اس میں بولتا کیا جانے کیا ہے

○ کیا اور اس سے ہوگا زمانے کا انقلاب
جو بات عیب کی تھی ہنر ہو گئی تو ہے،

ظفرؔ رہا وہ بشر خوب اول و آخر
جو خاک پیچھے ہوا خاکسار پہلے ہوا

بلا سے کوئی گر بھلا یا بُرا ہو، ہمیں کیا غرض اور تمہیں کام کیا ہے
ظفرؔ اَب کسی کی بُرائی بھلائی، نہ تم ہم سے پوچھو نہ ہم تم سے پوچھیں

صحبتِ منافقانہ ہے ہر جا نفاق سے
کچھ اتفاق ہے تو کہیں اتفاق سے

انسان اور انسانیت کا یہ باب ظفرؔ کے ایک شعر پر ختم کیا جا رہا ہے کاش یہ شعر نقشِ ہر در و دیوار ہو جاتا، ہر آدمی کی نگاہ کی راہ سے دل میں اتر جاتا، ذہن اس کے منشأ و مفہوم کو سمجھ سکتا، دماغ اس کے اثرات کو قبول کرتا ہوا اعضا و جوارح کو اس شعر کے سانچے میں ڈھل جانے کا پابند کرتا تو شاید آج کی سسکتی بلکتی، چیختی، چلّاتی، کراہتی دنیا کو کچھ قرار آتا، سکون آتا، وحشت ختم ہوتی، کلفت دور ہوتی اور اقبالؔ کے "پیرِ رومی" کو دن کے وقت چراغ لے کر انسان سے بھری دنیا میں "انسان" کو تلاش کرنے کی نوبت نہیں آتی۔

ظفرؔ آدمی اس کو نہ جانئے گا، ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

اکبر الٰہ آبادی کے خطوط خواجہ حسن نظامی کے نام

حکیمانہ اور ظریفانہ اشعار کا انتخاب

جن ادیبوں اور شاعروں نے اردو ادب کو فروغ دیا ہے، اعتبار بخشا ہے، حسن کو نکھارا ہے، گیسو کو سنوارا ہے، دل کشی اور رعنائی پیدا کی ہے، بلبل ہزار داستاں کا مقام و مرتبہ عطا کیا ہے، ان میں الٰہ آباد کے اکبر اور دہلی کے خواجہ حسن نظامی شامل ہیں، ممکن نہیں کہ کسی دور، کسی زمانہ میں اردو ادب ان کے نام کو بھلا دے، اور ان کے ذکر کے بغیر اپنی تاریخ مکمل کرلے، بلاشبہ اردو شعر و نثر کی دنیا میں اکبر کی شاعری اور حسن نظامی کی نثر نگاری، اپنی ایک شناخت اور پہچان رکھتی ہے، ایسی شناخت اور پہچان کہ بجا طور پر شاعر کا یہ شعر صادق آتا ہے:

اہلِ وفا ہر راہ گزر میں نقشِ قدم چھوڑ آئے ہیں اپنے
بعدِ فنا بھی ذکر ہمارا، ہوتا رہے گا عالم عالم

مولانا سید اکبر حسین اکبر الٰہ آبادی (۱۹۲۱-۱۸۴۶ء) اور حضرت خواجہ حسن نظامی (۱۹۵۵-۱۸۷۸ء) نہ صرف ہم عصر ہیں، بلکہ بہت حد تک ہم فکر، ہم خیال، ہم مسلک اور ہم مشرب بھی، فکر و خیال اور مسلک و مشرب کی اسی یگانگت نے ان دونوں کی روحوں کو آپس میں ملا دیا تھا

باہمی احترام کے ساتھ دوستانہ تعلقات، ایک دوسرے کے پاس آنا جانا، ایک خاندان کے افراد کی طرح رہنا سہنا، یہ سب اسی یگانگت کا نتیجہ تھا، یہ بھی باہمی خلوص و محبت ہی کا اثر تھا کہ پابندی سے ایک دوسرے کو خطوط لکھتے رہے، جن میں نہایت بے تکلفی کے ساتھ شخصی حالات کا ذکر بھی ہوتا تھا، قومی، ملکی اور ملی حالات بھی زیر بحث آتے رہے، اردو ادب میں ان خطوط کی حیثیت "ادبی سرمایے" بلکہ "شہ پارے" کی ہے، خطوط میں جا بجا ترشے ترشائے ایسے ادبی جملے آگئے ہیں کہ انہیں پڑھتے ہوئے دل جھوم اٹھتا ہے، اور روح وجد میں آتی ہے۔

اکبر الہ آبادی نے خواجہ حسن نظامی کے نام جو خطوط لکھے ہیں، ان خطوط کو یکجا کر کے خواجہ صاحب نے "خطوطِ اکبر بنام خواجہ حسن نظامی" کے عنوان سے اپنی زندگی ہی میں (اکبر الہ آبادی کے انتقال کے بعد) شائع کر دیا تھا، راقم الحروف کے سامنے اس وقت اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ہے، جس کا سنہ طباعت شعبان ۱۳۷۲ھ مطابق اپریل ۱۹۵۳ء ہے (۱۹۴) صفحات پر مشتمل اس کتاب میں جملہ (۲۰۱) خطوط ہیں، پہلا خط ۱۷ جنوری ۱۹۱۱ء میں لکھا گیا تھا، اور آخری خط کے نیچے جو تاریخ درج ہے، وہ ہے ۱۶ جون ۱۹۲۱ء، خطوط نہایت دلچسپ اور معلومات افزا ہیں، خطوط میں اکبر صاحب کی طبیعت لہراتی اور مچلتی ہوئی نظر آتی ہے، شعری ذوق بھی پورے بہار پر ہے، موقع اور حالات کے لحاظ سے جن اشعار کو انہوں نے اپنے ان خطوط میں نقل کیا ہے، ان میں ان کا اپنا حکیمانہ اور ظریفانہ رنگ نمایاں ہے، اشعار کی مجموعی

تعداد سو سے زیادہ ہے، لیکن یہاں ان اشعار کا انتخاب ہی پیش کیا جا رہا ہے، بعض اشعار ایسے ہیں کہ میرے علم کی حد تک "کلیاتِ اکبر" میں شامل نہیں ہو سکے ہیں، تاہم ان اشعار کے مطالعہ سے پہلے اکبر کے بارے میں ایک معاصر فاضل اور صاحبِ قلم (ڈاکٹر شمس تبریز خاں لکھنؤ یونیورسٹی) کی یہ رائے بلکہ مبصرانہ تجزیہ ضرور سامنے رکھ لیجئے، وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"اکبر کی عظمت کو سمجھنے کے لئے مذہب کی حقیقی روح سے واقفیت، مشرقی تہذیب کے محاسن کا شعور اور مغربی تہذیب کی کمزوریوں کا علم ضروری ہے، اکبر کی اہمیت ان کے احساس و شعور کی تیزی، نظر کی گہرائی اور مشاہدہ کی گیرائی، بیدار مغزی و روشن ضمیری، اپنے زمانہ کی ہمہ جہت تبدیلیوں کا احساس اور حالات و حوادث پر ردِّ عمل اور روحِ عصر سے واقفیت اور اس کی ترجمانی میں مضمر ہے، ان کے معاصرین میں داغؔ اور امیرؔ کے یہاں تو کسی تبدیلی کا پتہ ہی نہیں چلتا، البتہ حالی و شبلی اور شاد کے یہاں نئے حالات کی آہٹ محسوس ہوتی ہے، لیکن اکبر نے جس طرح حالات کی ایک ایک کروٹ پر نظر رکھی، اور نئی تبدیلیوں کے بارے میں جس شدت اور فن کارانہ مہارت کے ساتھ اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا، اس سے ان کی عظمت و انفرادیت کا تعین ہوتا ہے۔"

آیئے! اکبر کی اس شاعرانہ عظمت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے "خطوطِ اکبر

بنام خواجہ حسن نظامی" کا مطالعہ کریں، اور مطالعہ کے دوران ان اشعار کو چنتے ہوئے چلیں، جن سے فکر و نظر کو جلا ملتی ہے، ایمان و یقین کو تازگی حاصل ہوتی ہے، قومی اور ملی غیرت تاریخ کا حصہ بنتی ہے اور شاعر کا بظاہر ظریفانہ انداز باطنی اعتبار سے دل کو سوز و گداز عطا کرتا ہے ——— اب آپ ذیل میں جو کچھ پڑھیں گے، اس میں اشعار تو اکبر الٰہ آبادی کے ہیں ہی، اس کے ساتھ ہر شعر سے پہلے زیرِ نظر خطوط کی مختصر سی عبارت نقل کی گئی ہے، یہ عبارت بہ زبانِ اکبر تعارف اور تمہید کا کام کرے گی، جس سے شعر کی حقیقت اور معنویت بھی اجاگر ہو کر سامنے آئے گی، اکبر الٰہ آبادی لکھتے ہیں:

نیرنگ صاحب کو بھی مبارکباد دوں گا، خطاب لسان العصر تو انہی کا عطا کیا ہوا ہے، اللہ ان کو فرید عصر کرے، آپ کے بھی بڑے مراتب ہیں کہ آپ طاعت گزاروں کے عاشق و طالب ہیں، میں نے ایک مقطع کہا تھا، دعا فرمایئے کہ اسی پر استقامت ہو، مقطع یہ ہے:

ناز ہے اپنی طبیعت پہ ہمیں اے اکبرؔ
ہیں مصیبت میں اور اللہ سے خوش رہتے ہیں

نواب صاحب کے موٹر سے گرنے کا افسوس ہوا، اور اپنا شعر یاد آیا ؎

عزم کر تقلید مغرب کا ہنر کے زور سے
لطف کیا ہے لد لئے موٹر پہ زر کے زور سے

انتشار طبع کی باتیں ہیں، لیکن دفعِ غم کے لئے بھی یہ حالت کس قدر مانع ہے ؎

دل ہی کو غم نہیں کہ ہوا مبتلائے غم
غم بھی بلا میں ہے کہ ہوا مبتلائے دل

واحدی صاحب کو میں نے ایک مطلع لکھ بھیجا ہے ؎

سخن میں یوں تو بہت موقعِ تکلف ہے
خودی خدا سے جھکے بس یہی تصوف ہے

میں خود ہنگامۂ مصائب میں مبتلا ہوں، کیا حالت اس زخمی کی ہوگی، جس کے زخم مہلک ہیں، اور ہنوز کچھ قوتِ رفتار باقی ہے، وہ گوشہ عافیت ڈھونڈ رہا ہے کہ مرنے کے لئے بستر لگائے، لیکن گوشہ نہیں ملتا، اور قوتِ رفتار جواب دیتی جاتی ہے ؎

مطالب ہیں بہت وقتِ دعا کچھ کہہ نہیں سکتا
الٰہی فضل کر اس کے سوا کچھ کہہ نہیں سکتا

کل دوپہر میں نے چند شعر کہے، کہے کیا بے اختیار ذہن میں داخل ہوکر زبان پر آ گئے ؎

صبح کو کہتا ہوں دیکھوں کس طرح کٹتا ہے دن
شام اسے ایسا بھلا دیتی ہے گویا کچھ نہ تھا
عمر یوں ہی کٹ گئی آخر ہوا معلوم یہ
عرصۂ ہستی بجز امروز و فردا کچھ نہ تھا

میں نے حال ہی میں ایک غزل کہی ہے، دو شعر یہ ہیں ؎

صورتِ فانی سے آخر کیوں یہ پہچانے گئے
مجھ کو حیرت ہے کہ یہ بت کیوں خدا مانے گئے

اک زمانے میں یہ خواہش تھی کہ جانیں ہم کو لوگ
اب یہ رونا ہے کہ ہم کیوں اس قدر جانے گئے

میرا ایک نیا مطلع ہے، کچھ واقعہ کچھ ظرافت سے

قید میں زیست کی بنیاد دلی جاتی ہے
پھر بھی شکر ہے کہ روٹی تو ملی جاتی ہے

چند اشعار پیشِ خدمت ہیں سے

خدا کا ذکر ہے طاقت ہماری
مصلیٰ ہے ہمارا تختِ شاہی

ہماری فوج ہے اخلاقِ حسنہ
ہمارا حصن ہے ترکِ مناہی

بلند اپنی نظر ہے فضلِ حق سے
کرے گی کیا کسی کی کم نگاہی

جو یہ سچ ہے کہ جو چاہو وہی ہو
تو چاہوں گا وہی ہوتا ہے جو کچھ

عشرت سلمہٗ کو میرے یہ اشعار بہت پسند آئے ہیں سے

گو سعی ردائے شوق نے کی، بو اس کی نہ نکلی محفل سے
مجنوں نے اڑائی خاک بہت، لیلیٰ نے نہ جھانکا محمل سے

دنیا کے تغیر کا نہیں حس، شیدائے جمالِ باری کو!
پروانے کو مطلب شمع سے ہے کیا کام ہے رنگِ محفل سے

ایذا کا مجھے حس ہی نہ ہوا، فریاد و فغاں میں کیا کرتا
جس وقت تہہِ خنجر تھا گلا، آنکھ اپنی ملی تھی قاتل سے

خدا کے ساتھ رہنا چاہیئے، پھر جو رنگ چاہو اختیار کرو، لیکن حالت یہ ہے ؎

مسلمان تو وہ ہے جو ہے مسلمان علمِ باری میں
کروڑوں یوں تو ہے لکھے ہوئے مردم شماری میں

آج کل زبانی باتیں ہیں، وہ اخلاق کہاں ؟ ؎

زبانی ہی باتیں ہیں، لفظوں میں گم ہو!
اجی بھائی صاحب جو سب ہیں وہ تم ہو!

استقامت تو اللہ کی بڑی نعمت ہے، جس کو نصیب ہو، ہمارا حال تو یہ ہے ؎

دل جو صدمے بہت اٹھاتا تھا
ایک رنگ آتا ایک جاتا تھا

اپنی بیاض میں یہ ایک شعر پاتا ہوں ؎

ٹھیک ہے مصرع کا مضمون قافیہ گو سخت ہے
اہلِ دل نالاں ہو جس سے وہ بڑا کم بخت ہے

زندگی تو وقت ہی پر ختم ہوگی، لیکن یہ خیالِ حوادث اور آلام کا مقابلہ کرنے کے لئے نہایت موثر ہے، آج ہی صبح میں نے ایک مطلع کہا تھا ؎

فلسفہ غم کا جسے معلوم ہے
ہو مبارک وہ اگر معصوم ہے

آج صبح میں نے یہ دو شعر اپنے حسبِ حال موزوں کئے تھے ؎

نہیں ہے جنبش کی ان میں قوت جو گفتگو کو کھڑے ہوئے ہیں
بندھے ہوئے ان کے ہاتھ دیکھیں، ہیں پاؤں ان کے گڑے ہوئے ہیں
معاف رکھیں ہمیں خدارا، انہی کو ہو لیڈری مبارک
ہم ایک گوشے میں اپنے اچھے دبے دبائے پڑے ہوئے ہیں!
نہ ادھر توجہ کی ضرورت نہ تفصیل کا دماغ ہے
اس بزم میں کیا آثار ملے ہنگامِ سحر سامانوں میں ہے!!
اک داغ تھا شمع مردے کا کچھ پرتھے پڑے پروانوں کے
ہستی کی یہ لہریں دامِ نظر دم بھر میں نشان ان کا نہ اثر
گرداب فنا میں غرق ہیں سب دریا میں رواں افسانوں کے
معلوم نہیں میں نے یہ اشعار کبھی آپ کو لکھے یا نہیں ہے

اک ہی کام سب کو کرنا ہے
یعنی جینا اور مرنا ہے
اب رہی بحث رنج و راحت کی
یہ فقط وقت کا گزرنا ہے

سب سے بدتر بتوں سے ہے امید
سب سے بہتر خدا سے ڈرنا ہے

مجھے اپنا یہ مطلع اکثر یاد آتا ہے، اور اس کے معنی پر غور کرتا ہوں:

اگرچہ تلخ ملا جامِ عمرِ فانی کا
مگر محل نہیں ساقی سے بدگمانی کا

دیکھیے الفاظ سے کچھ معنی پیدا ہوتے ہیں یا نہیں ہے

زبان سے دل میں صوفی ہی خدا کا نام لایا ہے
یہی مسلک ہے جس میں فلسفۂ اسلام لایا ہے

پہلا مصرع میں نے بدل دیا ہے ؎

تصوف ہی زباں سے دل میں حق کا نام لایا ہے
یہی مسلک ہے جس میں فلسفہ اسلام لایا ہے

البتہ موت کا طالب اس سبب سے نہیں ہوتا ہے کہ طلب ممنوع ہے، اور وہ خود آرہی ہے، میں کیا بلاؤں ؎

بڑھا جاتا ہے ضعف اپنا زور آہستہ آہستہ
لئے جاتی ہے پیری سوئے گور آہستہ آہستہ

یہ سوچا کرتا ہوں کہ خط میں یہ لکھوں وہ لکھوں، سوچ ہی میں رہ جاتا ہوں ؎

حالِ دل میں سنا نہیں سکتا
لفظ معنی کو پا نہیں سکتا

پرسوں ایک قطع موزوں ہوگیا، سامعین نے بہت پسند کیا، شاید آپ کو بھی چوتھے مصرع پر لطف آئے ؎

جو پائے راز حسن ازل سے کہے کوئی
سن صوت سرمدی کو کلام مبیں کو دیکھ

ارشاد ہے کہ شرک نہ کر اور نماز پڑھ
معنی یہ ہیں کسی کو نہ دیکھ اور ہمیں کو دیکھ

اسرار خودی کی توضیح میں میں نے واحدی صاحب کو ایک مطلع لکھ بھیجا تھا، وہ چار لفظ ہیں، لیکن توضیح تو ہوگئی ؎

عشق میں کیوں بے خودی مقصود ہے
حسن بے حد ہے خودی محدود ہے
منکشف ہو جائیں اسرارِ خودی
بے خودی کا بھی یہی دستور ہے

کل میں نے جس غزل کے دو شعر آپ کو لکھے ہیں، اس کے دو شعر اور لکھتا ہوں، دوسرا شعر آپ پر صادق آسکتا ہے، اگر مصداق بننا چاہیں

دل نفس کا تابع، غفلت میں دنیا کی حقیقت کیا جانے
اٹھے ہیں فریب امیدوں کے طوفاں ہے بپا ارمانوں کے

تھی عقل زبان پر اے اکبرؔ اور عشق پہ رکھی ہم نے نظر
ممتاز رہے ہشیاروں میں، سرخیل رہے دیوانوں کے

تاہم یہ لکھنا چاہیے کہ اپنی باہمی اصلاح مقدم ہے ؎

جو گایوں سینگوں میں ہو زور کچھ!
تو شیروں کو روکیں بہم بن کے دوست

مگر اونٹ کا قول تو ہے یہی!

تواضع زگردن فرازاں نکوست

شعر کہہ تو لیتا ہوں، لیکن صاف کرنا، اِدھر اُدھر بھیجنا، اس دردِ سر کا تحمل مشکل ہوتا ہے ؎

خاک کے ساتھ کھیلتی ہے روح
میں کی مٹی خراب ہوتی ہے

کیا کہوں کیا گزرتی ہے، اس مطلع سے تسکین ہوتی ہے ؎

گو ہم نفس اپنے اٹھ گئے سب، دمساز ہماری آہ تو ہے
کوئی جو ہمارا رہ نہ گیا، ایمان تو ہے، اللہ تو ہے۔

الحمدللہ کہ آپ نے صفائی حاصل کرلی، آزاد ہوگئے، آپ کو اس کی شدید ضرورت تھی، میں بدستور رہا ہے

دنیا سے تعلق کیا رکھوں، کیوں زحمت اٹھاؤں اس کے لئے
دل کہتا ہے اور سچ کہتا ہے، کے دن کے لئے اور کس کے لئے

میری تو یہ حالت ہے ہے

چل بسے اسبابِ غفلت، چشمِ عبرت رو چکی
میری ہستی تھی ہی کیا، اور تھی جو کچھ وہ ہو چکی

کچھ نہ پوچھئے کیا گزری ہے، یہ شعر بے کسی زبان پر لائی ہے ہے

گھر کو چھوڑے ہوئے مدت ہوئی صیاد مجھے
کس چمن میں تھا نشیمن یہ نہیں یاد مجھے

شریعت اور طریقت کے بارے میں چند شعر پیش ہیں ہے

شریعت میں تاکید ضبطِ نصوص
طریقت میں ذوقِ عمل باخلوص

طریقت قدم ہے شریعت ہے راہ
شریعت زبان ہے، طریقت نگاہ

خیالاتِ شاعرانہ گو ہیں درست
مگر قولِ سعدی نہایت ہے چست۔

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

محال است سعدی کہ راہِ صفا
تواں رفت جز بر پئے مصطفٰے

بہرحال آپ کا دل و دماغ مولا کی لو سے روشن ہے، اِنشاءاللہ عاقبت بخیر ہے ؎

بوئے گل تو، تو چلی اپنی سبکباری سے
میں گرانبار اٹھوں گا بڑی دشواری سے

یہ اشعار پرچہ مشرق میں چھپے تھے، ایڈیٹر نے ان کو نہایت عمدہ سمجھا ؎

عورتوں کی بھی تعلیم ضروری بے شک
ایک ہی نکتہ یہاں کہنا ہے بس حکمت کو
دو اسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم
قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

عبدالباری صاحب نے صحیح فرمایا کہ ہمارا ہادی قرآن پاک ہے، مجھ کو اپنا ایک شعر یاد آتا ہے ؎

جو پوچھا دل سے اس جینے کا کیا مقصود آخر ہے
شکم بولا کہ اس کی بحث کیا، خادم تو حاضر ہے

ڈیر خواجہ صاحب! نماز میں جی نہ لگنے کا مضمون خوب ہے، جزاک اللہ، میرا ایک شعر سن لیجئے ؎

یہ تو سچ ہے جی لگا کر چاہئے پڑھنا نماز
یہ بھی سن لو جی لگا کر سانس لینا چاہئے

کلیات حصہ دوم اٹھائیے، صفحہ ۸۳ میں چوتھا شعر ملاحظہ فرمائیے:

نظم اکبر کو سمجھ لو یادگارِ انقلاب۔
یہ اسے معلوم ہے ٹلتی نہیں آئی ہوئی

حصہ دوم میں صفحہ ۱۶۷ میں چودھواں شعر یہ ہے ؎

اکبر دبے نہیں کسی سلطان کی فوج سے
لیکن شہید ہو گئے بیگم کی فوج سے!

اچھا ہوا خواجہ بانو درویش خانے میں آگئیں، درویش خانے کی خدا مجھ کو بھی زیارت نصیب کرے ؎

اک نعمت ہے اک جنت ہے فارغ ہو جو دل اندیشوں سے
کس طرح یہ نعمت حاصل ہو، کر اس کی طلب درویشوں سے

آپ موت و زندگی کے روحانی شریک ہیں، آپ سے انس ہے، ورنہ آخر کار با خداوند اسے

خدا ہی سے بالآخر کام پڑ جاتا ہے اے اکبرؔ
نہیں ہوتا کسی کا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔

تکلیف میں مبتلا رہتا ہوں، درد سر کے درد الگ رہے، خیر ؎

یہ عمر کب تک دغا کرے گی، زمانہ کب تک جفا کرے گا
مجھے قیامت کی ہیں امیدیں، جو کچھ کرے گا خدا کرے گا

مجھ کو اپنا ایک شعر یاد آیا، میں نے ایک دوسری دلیل قربِ قیامت کی پیش کی ہے۔

ایک اور شعر بھی اس کے ساتھ ہے ؎

ہوش میں لائی ہیں اب مایوسیاں
نشہ امید فردا ہو چکا

عشق سے کہہ دو قیامت ہے قریب
حسن کا سنتے ہیں پردا ہو چکا

لوگ پوچھتے ہیں، ان ہنگاموں کا کیا نتیجہ ہے ؎

یہ دھوتی سے باہر وہ پتلون سے
غرض کس کو ہے آج قانون سے

میرا ایک شعر ہے ؎

مغرب کی خود پسندی کام اپنا کر رہی ہے
معنی اجڑ رہے ہیں، صورت سنور رہی ہے

ایک اور شعر سنئے ؎

مقصود اگر یہ ہو اکبرؔ، محفوظ رہو آرام کرو
موقع کے مطابق بات کہو طاقت کے مطابق کام کرو

عزیزؔ لکھنوی مجھ سے ملنے آئے تھے، میرے اس نئے شعر کی بہت داد دی ؎

انہی الفاظ سے اب ذہنِ خفتہ کو جگانا ہے
شریعت سر جھکانا ہے طریقت دل لگانا ہے

(خطوطِ اکبر بنام خواجہ حسن نظامی صفحہ ۶ تا ۱۸۴)

اوپر کی سطروں میں آپ نے "خطوطِ اکبر بنام خواجہ حسن نظامی" سے اکبرؔ الہ آبادی کے منتخب اشعار پڑھے، اس کتاب میں اکبرؔ کے آخری شعر کے بارے میں خواجہ حسن نظامی کا یہ بیان بھی ہے:

"انگریز حکومت میرے اور ان کے خلاف تھی، اور مجھے کئی سال تک ان سے ملنے اور الہ آباد جانے کی ممانعت رہی، لیکن خدا کا شکر

ہے کہ میں ان کی وفات کے وقت وہاں پہونچ گیا تھا، اور میرا ہاتھ پکڑے پکڑے ان کی وفات ہوئی تھی، حضرتِ اکبر کا سانس ختم ہوتے ہی ان کے فرزند سید عشرت حسین صاحب نے مجھ سے کہا کہ ابھی ابّا نے اپنی نوٹ بک میں کچھ لکھا تھا، میں نے فوراً وہ نوٹ بک دیکھی، تو یہ شعر لکھا ہوا تھا ؎

گاندھی میں سب بھلائی لیکن وہ محض بے بس
صاحب میں سب برائی لیکن وہ خوب چوکس

دنیا تو چاہتی ہے ہنگامۂ لڑو جن
اور یاں ہے جیب خالی جو مِل گیا سو بھوجن

اکبرؔ سے متعلق شعر و سخن کی اِس محفل کو اکبرؔ ہی کے اس شعر پر ختم کرنے کو جی چاہتا ہے ؎

میں بھی ہوں اک سخنور، آ سُن کلامِ اکبر
ان موتیوں سے آکر دامن کو اپنے بھر لے

جگر کی شاعری — پیغام عزم و حوصلہ

یہ موج و تلاطم، یہ طوفاں یہ دھارے
اگر حوصلہ ہو، تو یہ بھی سہارے

جگر آئے اور چلے گئے، گئے ہوئے (۴۰) سال کا عرصہ بیت چکا، مگر سچّی بات یہ ہے کہ :-

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں، وہ پھر رہے ہیں، یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں

وہی لطافت، وہی نزاکت، وہی تبسّم، وہی ترنّم
میں نقشِ حرماں بنا ہوا تھا، وہ نقشِ حیرت بنا رہے ہیں

خرام رنگیں، نظام رنگیں، کلام رنگیں، پیام رنگیں
قدم قدم پر، روش روش پر نئے نئے گل کھلا رہے ہیں

عالمِ کیف و مستی میں کہے ہوئے یہ اشعار کسی دوسرے کے ہیں لیکن جگر کی شخصیت اور اُن کی شاعری کے پسِ منظر میں یہ "منظر نامہ" خود اُن کا بن گیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جگر نے جس سج دھج سے شاعری کی تھی، اس کی چمک دمک پھیکی نہیں پڑی، ان کی بہار بردوش شاعری خزاں آشنا ہو نہیں سکتی، ہر دور ہر زمانہ میں جگر کا کیف و سرور

چھلکے گا، ان کی سرمستی اور سرشاری اُبلے گی، ان کا انداز مستانہ اور طرزِ یگانہ سوتی بستی کو جگاتا رہے گا، ان کا سوز و ساز، لحن، دُھن، نغمہ، سُر سبھی مرغِ دل کو بسمل بناتا رہے گا، الفاظ، تصوّرات، خیالات اور بیان کی رنگینی و رعنائی، وارفتگی اور روانی اپنا جادو جگاتی رہے گی، ان کا منفرد لب و لہجہ اور رنگِ تغزّل اپنی شناخت اور پہچان باقی رکھے گا، ان کے کلام میں سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ جو لطافت اور حلاوت ہے اور اس میں انسانیّت اور محبّت کا جو پیغام ہے اس کی معنویّت اور آب و تاب کم نہ ہوگی، پھر یہ کہ جگرؔ کی حقیقت بیانی نے ان کے اشعار میں اثر آفرینی کی جو کیفیّت پیدا کی ہے وہ کاریگرانِ شعر و سخن کے لئے ایک دعوت ہے :

کاریگرانِ شعر سے پوچھے کوئی جگر
سب کچھ تو ہے مگر یہ کمی کیوں اثر میں ہے

جگرؔ کا یہ شعر "اپنا تعارف آپ" کے زمرے میں ہے :

مرے شعر میں ہیں نزاکتیں، میری نظم میں ہیں لطافتیں
مری فکر میں کہیں اے جگرؔ ادبِ کثیف کی جا نہیں

جگرؔ اپنی شاعری کو تکلف اور تصنع سے بری قرار دیتے ہوئے اپنی زندگی کو اپنی شاعری سے اور اپنی شاعری کو اپنی زندگی سے جُدا نہیں کرتے اور ان کے شعر میں جو حقیقت ہے، اسی کو اپنی زندگی بتاتے ہیں :

تکلف سے تصنع سے بَری ہے شاعری اپنی
حقیقت شعر میں جو ہے، وہی ہے زندگی اپنی

جگرؔ کی نظر تیز اور دل حسّاس تھا، اس لئے انہیں اپنے اشعار کے بارے میں کہنا پڑا :-

مرے اشعار میں جو آگ بھری ہے اے کاش
تجھ کو راس آئے، ترے عزم جواں تک پہنچے

جگرؔ کے نزدیک شاعر کا قلب اور اس کی آنکھ دوسرے لوگوں کے قلب اور آنکھ سے الگ ہوتی ہے :

اللہ اللہ ہستیٔ شاعر
قلب غنچے کا، آنکھ شبنم کی

وہ یہ بھی کہتے ہیں ؎

زمانہ گرم رفتارِ ترقی ہوتا جاتا ہے،
مگر اک چشمِ شاعر ہے کہ پُرنم ہوتی جاتی ہے

ان کا ایک تأثر یہ بھی ہے ؎

صرف نقّالی ہے مغرب کی جگرؔ
شعر میں جب مشرقیّت ہی نہیں

یہ ہیں جگرؔ، ان کی شاعری اور عام شاعر اور شاعری کے بارے میں ان کے احساسات و تأثرات۔ ہم جب اس دائرے سے آگے بڑھتے ہیں اور جگرؔ کی شاعری کے تشکیلی عناصر اور اجزائے ترکیبی کا جائزہ لیتے ہیں تو جگرؔ کے یہاں "خمریات" کا بڑا ذخیرہ ملتا ہے، تاہم انہوں نے ۱۹۴۰ء کے آس پاس ترکِ مئے نوشی کر لی تھی۔ ان کی شاعری میں خمریات کے ساتھ حُسن و عشق کا تصور بھی ہے، تصوّف کی دل آویزی بھی ہے، قومی اور وطنی جذبات کا اظہار بھی ہے، نقد و نظر

بھی ہے، اپنے دَور اور اپنے زمانہ پر تبصرہ بھی ہے، جگرؔ اپنے شعری جلووں میں جا بجا ایک معلّمِ اخلاق حکیم اور واعظ کی حیثیت سے بھی اُبھر کر سامنے آتے ہیں، جگرؔ نے اپنے جن اشعار میں مختلف انداز سے عزم و حوصلہ کا جس اونچے، سر اور اعلیٰ تخیل کے ساتھ درس دیا ہے وہ دراصل ان کی شاعری کے اسی اخلاقی پہلو کو اُجاگر کرتا ہے۔

ذرا سوچیئے! یہ دُنیا جس میں ہم اور آپ رہتے بستے ہیں، اس میں قدم قدم پر عزم و حوصلہ کی آزمائش ہے، کیونکہ یہ دنیا پھول ہی کی نہیں کانٹوں کی بھی ہے، راحت کے ساتھ مصیبت بھی لگی ہوئی ہے، خوشی کے پہلو بہ پہلو غم بھی ہے، گھر میں شہنائی بھی بجتی ہے اور ماتم بھی ہوتا ہے، فراخی بھی ہے اور تنگی بھی، امارت بھی ہے اور غربت بھی، کامیابی بھی ہے اور ناکامی بھی، صحت بھی ہے اور بیماری بھی، فتح بھی ہے اور شکست بھی، چڑھاؤ بھی ہے اور اتار بھی، مرحلہ آسان بھی ہے اور دشوار گذار بھی، تمناؤں کی بستی آباد بھی ہوتی ہے اور برباد بھی، آرزوؤں کا غنچہ کھِلتا بھی ہے اور مُرجھا بھی جاتا ہے، پھولوں کے ہار بھی ہیں اور گالیوں کی بوچھاڑ بھی، دوستوں کا خلوص بھی ہے اور منافقوں کی منافقانہ روش بھی، عنایتِ تازہ بھی ہے اور دشنام طرازی بھی، زندگی کی ان دوطرفہ حقیقتوں پر جگر کی نظر خوب ہے۔ دیکھئے غزل گو شاعر کا یہ فلسفیانہ انداز اور فکری اعتدال ؎

ہوشیار او شکوہ سنجِ زندگی
زندگی انعام ہی انعام ہے

ہوشیار او کامیاب زندگی
زندگی ناکامیوں کا نام ہے

جگرؔ کا یہ قطعہ بھی اسی معنی و مفہوم کو ادا کرتا ہے ؎

کارگاہِ حیات میں اے دوست
یہ حقیقت مجھے نظر آئی،
ہر اُجالے میں تیرگی دیکھی
ہر اندھیرے میں روشنی پائی

اس میں کوئی شک نہیں کہ جدید شاعری انسانی جذبات کو بیدار اور آمادۂ عزم و عمل کرتی ہے، آزاد اور حالی نے اس سلسلہ میں بہت کچھ کہا ہے اور خوب کہا ہے۔ اقبال نے کچھ اور قدم آگے بڑھایا، دیگر نظم گو شعراء نے بھی ایک پر ایک نظمیں لکھی ہیں، لیکن غزل گو شعراء میں جگرؔ کو اس باب میں یدِطولیٰ حاصل ہے، وہ انسان کو انداز بدل بدل کر عزم و حوصلہ عطا کرتے ہیں، مشکلات پر قابو پانے کی تلقین کرتے ہیں اور سلجھی ہوئی گتھی کو پھر سے اُلجھا کر اس پر قابو پانے کا نام ہمّت و جرأت بتاتے ہیں۔

؎ میری ہمّت دیکھنا میری طبیعت دیکھنا
جو سُلجھ جاتی ہے گتھّی پھر سے اُلجھاتا ہوں میں

جگرؔ بزدلی اور کم ہمتی کی بجائے پامردی، یاس کی جگہ آس، اور مشکلاتِ زندگی کے باعث فرار کی جگہ استقلال و اُولوالعزمی کا درس دیتے ہیں۔ جگرؔ کے یہ دم خم دیکھئے ؎

ہم کو مٹا سکے یہ زمانے میں دَم نہیں
ہم سے زمانہ خود ہے زمانے سے ہم نہیں
اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہلِ دل
ہم وہ نہیں کہ جس کو زمانہ بنا گیا

بحر، دریا، موج، طوفاں اور ساحل کے استعارے میں جگرؔ کی بلند حوصلگی دیکھئے ؎

جو طوفانوں میں پلتے جا رہے ہیں
وہی دُنیا بدلتے جا رہے ہیں

دریا کی زندگی پر صدقے ہزار جانیں
مجھ کو نہیں گوارا ساحل کی موت مرنا

مجھے آغوشِ طوفاں ہی جگرؔ آغوشِ مادر ہے
وہ کوئی اور ہوں گے امنِ ساحل دیکھنے والے

ہر طرف بے فائدہ کیوں سعیِ پیہم کیجئے
تشنگی سے اپنی پیدا بحرِ اعظم کیجئے

پروردۂ طوفاں کو کشتی کی نہیں حاجت
موجوں کے تلاطم میں ساحل نظر آتا ہے

جگرؔ ہاتھ میں "شمع" اور "چراغ" تھامے ہوئے عزم و حوصلہ کی روشنی اس طرح بکھیرتے ہیں ؎

جسے ہوائے زمانہ کبھی بجھا نہ سکے
قدم قدم پہ وہ اِک شمعِ راہ پیدا کر

خود اپنی آگ میں جلتی ہے شمع جلنے دو
پرائی آگ میں جلنا ہے کارِ مردانہ

جذبۂ شوق نے دم لینے کا موقع نہ دیا
شمع منھ دیکھتی ہی رہ گئی پروانے کا

چراغِ دیر و کعبہ اللہ اللہ
ہوا کی زد پہ جلتے جا رہے ہیں

گرمیٔ سوزِ عشق کو جلا تو بوالہوس
صبح کو بھی نہ بجھ سکے یہ وہ چراغِ شام ہے

رہ روِ راہِ طلب کو خضر کی حاجت نہیں
ذرّہ ذرّہ ہے چراغِ رہ گذر میرے لئے

آگے قدم بڑھائیں جنہیں سوجھتا نہیں
روشن چراغِ راہ کئے جا رہا ہوں میں

جگر عزم و حوصلہ کو کس کس طرح بڑھاوا دیتے ہیں، باریک بیں نگاہ ڈالتے ہوئے دیکھتے جائیے :

لاکھ ستارے ہر طرف، ظلمتِ شب جہاں جہاں
ایک طلوعِ آفتاب، دشت و چمن سحر سحر

توحید کی طاقت کو بنا اپنا معاون
ہر واہمۂ قلّت و کثرت سے گذر جا

خس و خاشاکِ توہّم کو جلا کر رکھ دے
یعنی آتش کدۂ سوزِ یقیں پیدا کر

یہی زمیں تیرا مسکن، یہی تیرا مدفن
اسی زمیں سے تو مہر و ماہ پیدا کر
اُٹھو! اُٹھو! کہ زندگی ہی زندگی پہ بار ہے
بڑھو! بڑھو! کہ چار سو پکار ہی پکار ہے
زمیں کو روندتے ہوئے، صفوں کو چیرتے ہوئے
بڑھے چلو! بڑھے چلو! یہ وقت کی پکار ہے
پھول وہی، چمن وہی، فرق نظر نظر کا ہے
عہدِ بہار میں تھا کیا دورِ خزاں میں کیا نہیں
سعیِ مآلِ فکر و نظر دیکھتا ہوں میں،
منزل رواں دواں ہے جدھر دیکھتا ہوں میں
میری ہستی شوقِ پیہم، میری فطرت اضطراب
کوئی منزل ہو مگر، گذرا چلا جاتا ہوں میں
ابھی کوئی منزل نہیں تیری منزل
ابھی پائے ہمّت بڑھاتا چلا جا
ہمّت جو ہے بلند تو کچھ اس سے کام لے
ساقی کا انتظار نہ کر بڑھ کے جام لے
ہمّتِ قاتل بڑھانا چاہیئے
زیرِ خنجر مسکرانا چاہیئے
واہ رے شوقِ شہادت کوئے قاتل کی طرف
گنگناتا، رقص کرتا، جھومتا جاتا ہوں میں،

جو حق کی خاطر جیتے ہیں، مرنے سے کہیں ڈرتے ہیں جگر
جب وقت شہادت آتا ہے، دل سینوں میں رقصاں ہوتے ہیں

یہ مصرع کاش نقش ہر در و دیوار ہو جائے
جسے جینا ہو مرنے کے لئے تیار ہو جائے

اِک ایسی شان پیدا کر کہ باطل تھر تھرا اُٹھے
نظر تلوار بن جائے، نفس جھنکار ہو جائے

کوئی مصلحت روک دیتی ہے ورنہ
پلٹ دیں زمانے کو جی چاہتا ہے

زندگی ہے نام جُہد و جنگ کا
موت کیا ہے؟ بھول جانا چاہیئے

خلوصِ شوق، جوشِ عمل، نہ درد وطن
یہ زندگی ہے خدایا کہ زندگی کا کفن

تجھے حادثاتِ پیہم سے کیا ملے گا نادان
ترا دل اگر ہو زندہ تو نفس بھی تازیانہ

بے فائدہ الم نہیں، بیکار غم نہیں
توفیق دے خدا تو یہ نعمت بھی کم نہیں

جگرؔ ان حوادث سے گھبرا نہ جانا
یہی تو ہے دلچسپیوں کا زمانہ

طولِ غمِ حیات سے گھبرا نہ اے جگرؔ
ایسی بھی کوئی شام ہے جس کی سحر نہیں

لیتا ہوا اِک درس حیاتِ ابدی کا
ہر تازہ غم و رَنج و مصیبت سے گذر جا
دل غنی ہو تو ہر اِک رنج بھی دل کی راحت
ذہن مفلس ہو تو ہر سود، زیاں ہوتا ہے
پہلے تو حسنِ عمل حسنِ یقیں پیدا کر
پھر اسی خاک سے فردوسِ بریں پیدا کر
پستیٔ خاک پہ کب تک تری بال و پری
پھر مقام اپنا سرِ عرشِ بریں پیدا کر
اے سہاروں کی زندگی والو
کتنے انسان بے سہارے ہیں
جان فدا اس پہ جس نے جگرؔ
زیست بسر کی نہ سہاروں کے ساتھ
زیست ہے زیست جو رگ رگ میں رواں ہے مئے عشق
موت ہے موت اگر رقص نہیں جوش نہیں
رہِ طلب میں نہ کر خوف لغزشِ پا سے
یہاں جو گر کے اُٹھا بس وہی کامیاب اُٹھا
ہر قدم پہ گر گر کر آدمی سنبھلتا ہے
یعنی خضر بھی کوئی ساتھ ساتھ چلتا ہے

جگرؔ مرادآبادی (۱۹۶۰ - ۱۸۹۰ء) نے مختلف رُخ اور انداز سے عزم و حوصلہ کا جو درس دیا ہے، اسے آپ نے پڑھ لیا۔ اَب اس پر نگاہ ڈالئے کہ آج کل ہمارے سماج اور معاشرے

ہیں جو بزدلی اور کم ہمتی چھائی ہوئی ہے، مایوسی اور نا اُمیدی بڑھتی جا رہی ہے، متعدّد وجوہ اور اسباب کے تحت نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں خودکشی کے رجحانات میں جو روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے، مصیبت، بیماری، پریشانی، ناکامی (خواہ محبّت میں ہو یا امتحان میں یا کسی اور وجہ سے) اور افلاس و غربت کے سبب انسان کو اپنی زندگی جو بار محسوس ہوتی ہے، جس سے وہ سبکدوشی چاہتا ہے، چھوٹی بڑی تمنّا اور آرزو بر نہ آنے کی صورت میں وہ دل گرفتہ ہو جاتا ہے، کلیجہ اس کا بیٹھ جاتا ہے، ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ جاتے ہیں، ہمّت پست ہو جاتی ہے اور حالات اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کی سکت وہ اپنے اندر نہیں پاتا ہے، بوقتِ ضرورت مال و جان کی قربانی پیش کرنے سے ہچکچاتا بھی ہے، اس پسِ منظر میں جگر کے مندرجہ بالا حوصلہ مندانہ اور ایمان و یقین سے سرشار اشعار حوصلہ بڑھائیں گے اور زندگی کے ہر سنگین اور کٹھن مرحلہ پر سوجھ بوجھ، عقل و دانائی، فراست و بصیرت اور دور اندیشی اور دور بینی سے کام لیتے ہوئے زندگی کو اپنے لئے مفید اور دوسروں کے لئے سود مند بنانے کی جد و جہد جاری رکھیں گے۔

بقول جگر ؎

وہ ہم سے ملتے نہ ملتے یہ ان کی تھی مرضی
ہمارا کام یہی تھا کہ جستجو کرتے

وہ یہ بھی کہتے ہیں ؎

طوفان کو موج، موج کو طوفاں نہ کر سکے
وہ کون سا ہے کام کہ انساں نہ کر سکے

آئیے! ذرا دیکھئے! عالمِ کیف و مستی میں پہنچ کر جگر کس قلب و جگر کے ساتھ عزم و حوصلہ کی پرواز کو اُونچی کرتے ہیں، نیا انداز، نیا تخیّل، نئی جست ؎

یہ موج و تلاطم، یہ طوفاں یہ دھارے
اگر حوصلہ ہو، تو یہ بھی سہارے

صفی اورنگ آبادی کی شاعری

ایک مطالعہ

حکیم محمد بہاء الدین بہبود علی صفی صدیقی جو شعری دنیا میں صفی اورنگ آبادی کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں، بلاشبہ اردو کے ممتاز اور پرگو شاعر ہیں، صفی کو دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف کوچ کئے ہوئے پچاس سال کا عرصہ ہو چکا، سنہ پیدائش اور سنہ وفات (۱۳۷۳-۱۳۱۰ھ) کے لحاظ سے وہ اس جہانِ رنگ و بو میں ۶۳ سال رہے، ان کی زندگی میں ان کا کوئی دیوان شائع نہیں ہو سکا، وفات (۱۹۵۴ء) کے گیارہ سال بعد ۱۹۶۵ء میں "پراگندہ" کے نام سے پہلا مجموعہ کلام منظرِ عام پر آیا، راقم الحروف کے سامنے اس وقت یہی ۳۴ سالہ قدیم مجموعۂ کلام ہے، (۲۰۰) صفحات پر مشتمل یہ مجموعۂ کلام "ادبستانِ صفی حیدرآباد" کے زیرِ اہتمام شائع ہوا ہے، مرتب ہیں صفی کے لائق شاگرد اور معروف شاعر جناب خواجہ شوق، جن کی پُرشوق تحریر "عرضِ مرتب" کے عنوان سے اس مجموعہ میں موجود ہے، کتاب کے شروع میں مشہور صحافی محبوب حسین جگر مرحوم (جوائنٹ ایڈیٹر روزنامہ سیاست حیدرآباد) کا دل آویز اور چشم کشا "تعارف" ہے، ممتاز شاعر اوج یعقوبی مرحوم نے

"صفی کی شخصیت اور شاعری" پر تبصرہ کچھ اس انداز سے کیا ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے طبیعت موج میں آتی ہے، ناشر کی حیثیت سے نام "نیشنل بک ڈپو حیدرآباد" ہے، صفحہ ۱۵ پر جو "انتساب" ہے، اس کی عبارت یہ ہے: ——— "آندھرا پردیش حیدرآباد سے شائع ہونے والے اردو کے مشہور و مقبول روزنامہ "سیاست" کی ادبی خدمات کے نام"

صفی کے کلام کا جس صفحہ سے آغاز ہوا ہے، اس سے پہلے صفی کی تصویر کے نیچے مجموعۂ کلام کے نام کی مناسبت سے صفی کا یہ شعر درج ہے

یہ پراگندہ ہے، جو کچھ بھی غنیمت ہے صفی
میں غریب آدمی دیوان کہاں سے لاؤں

اس کتاب میں "تعارف" کے عنوان سے جو محبوب حسین جگر مرحوم کا مضمون ہے، اس کا یہ طاقت ور اقتباس صفی کے بارے میں نہایت واضح نقطۂ نظر متعین کرتا ہے۔

اردو کے نقاد اور مؤرخ جب حیدرآباد کے ماضی قریب کے ادبی تذکرہ پر غور کریں گے، انہیں بڑی حیرت ہوگی کہ صفی کتنا منفرد شاعر تھا، حیدرآباد میں داغ، امیر، جلیل اور فانی کے یہاں قیام کے اثرات اور پورے ہندوستان میں شاعری کے فارم و لحن اور آہنگ کے باوجود صفی نے حیدرآباد دکن کے ادب، محاورہ، بول چال، سوچنے کے انداز اور فکری سانچوں کو اپنے شعروں میں شامل کیا۔

صفی کو آپ اس کے کلام کی عظمت کے لحاظ سے ہندوستان کے ممتاز شعراء کی صف میں اہم مقام پر پائیں گے، لیکن فوراً ہی یہ اندازہ بھی

لگ جائے گا کہ صفی حیدرآباد کے رہنے والے ہیں، مضمون اور فن کی آفاقیت کے لحاظ سے صفی اردو زبان کے ممتاز شاعروں کی صف میں ہیں، لیکن دکن کے ادب و زبان کو شعر میں سمونے کا یہ کمال انہی کا حصہ تھا، مقامی ادبی زبان و محاورے استعمال کرنے والا شاعر صرف علاقائی شاعر کہلاتا ہے، صفی اپنی انفرادیت کے باوجود حیدرآبادی کے نہیں، بلکہ اردو زبان کے ایک ممتاز شاعر تھے۔

صفی نے ہمیں اچھا کلام دیا، نوجوانوں کے بہت بڑے حلقہ کو شعر و سخن کے لئے مشورے دیئے، رہنمائی کی، وہ بجائے خود ایک انسٹی ٹیوشن تھے۔ (پراگندہ)

صفی کے بارے میں اوج یعقوبی کا یہ مطالعہ اور مشاہدہ بھی خوب ہے،

"کچھ لوگ ان کی شخصی زندگی کے ساحل پر اترے، اور کچھ ان کی شاعری کے چمن میں سیر کو آئے، مالِ کار صفی کو کسی نے ویران، اور کسی نے شاداب سمجھا، شاعر دو مختلف مکاتبِ خیال کے جائزہ لینے والوں میں بٹ گیا، بہبود علی اور صفی کے درمیان پھیلے ہوئے حالات کے سینے میں جھانکنے کی ——— حالات سے آگے دیکھنے کی جائزہ گیروں نے مخلصانہ کوشش نہیں کی، ورنہ صفی اپنی شخصی زندگی میں بھی اپنی شاعری کی طرح سادہ، مفید اور کارآمد نظر آتے۔ بہبود علی کی حیثیت سے وہ عمر بھر ایک ضرورت مند اور مجروح ترین انسان رہے، اور صفی کے روپ میں آخری سانس تک خوش خیال اور خوش فکر شاعر ——— جہاں بہبود علی کی عملی زندگی کے تلوے افکار و آلام کے کانٹوں سے چھلنی ہو گئے، وہاں شاعر صفی کے توسنِ تخیل کے کھُر بھی بساطِ گل پر کبھی غلط نہیں پڑے۔

صفی نے ترستی ہوئی زندگی اور برستی ہوئی آنکھوں سے
مسکراتی ہوئی غزلیں دیں، جلتے ہوئے چراغ، بجتے ہوئے
لفظ، بولتے ہوئے محاورے اور کھنکتے ہوئے شعر دیئے،
اور محض ادب کی یہ لافانی امانتیں ہم تک پہونچانے کے لئے
انہیں خود سے دور ہوتے جانا پڑا، وہ دور ہوتے گئے،
اور اس قدر دُور ہوگئے کہ اپنی شخصیت کا وہ کنارا خود ان
کی نظروں سے اوجھل ہوگیا، چنانچہ آخر وقت وہ صرف
شاعر رہ گئے تھے"

اوج یعقوبی یہ بھی لکھتے ہیں:

"صفی کی غزلوں کی تکنیک بھی کچھ مخصوص ادبی اور سماجی
روایات کی تابع ہے، بلکہ بعض مقامات پر ان کی اپنی افتاد
طبع خاندانی اصول تعلیم وتربیت اور واقعاتِ زندگی نے سر
اٹھاکر مطالعے کے ابواب میں کئی خوشگوار اضافے کئے، دیگر
اصنافِ سخن کے مقابلے میں صفی میں غزل گوئی کی دسترس سب
سے زیادہ ہے، اس لئے انہوں نے اسی برتن کو مختلف غذاؤں
کے لئے استعمال کیا ہے، ان کی غزل میں نرے غزل پن
سے لے کر فلسفہ، مذہب، اخلاقیات، نفسیاتِ انسانی، اوہام
عقائد، شعور وآگہی، فکر ونظر، اعمال وتجربات سب شامل
ہیں، گویا صفی کی غزل کے آئینہ خانے میں معشوق کی جلوہ
افروزی کے ساتھ ساتھ زندگی بھی اپنے گوناگوں مظاہر
کے ساتھ پرتوِ فگن ہے، مگر ان تمام بوقلمونیوں کے باوجود

ادب کو ادب کی جگہ رکھنے کی شرط اول و آخر کو نباہنا ہی صفیؔ کا
کمالِ سخن ہے،، (پراگندہ صفحہ ۱ تا ۵)

ایک دیدہ ور صحافی اور نامور شاعر نے صفی اور صفی کی شاعری کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، وہ نہایت حقیقت افروز اور معنیٰ خیز ہے، اس پسِ منظر میں صفیؔ کے لئے صفی ہی کا یہ شعر یقیناً لطف دے گا ؎

تماشا گاہِ عالم میں تماشا ایک ہم بھی ہیں!
تم اپنے دل کے مالک ہو جدھر چاہو ادھر دیکھو

جہاں تک تعلق صفی کے شعری مجموعہ "پراگندہ" کے مطالعہ کے بعد میرے احساسات و تاثرات کا ہے، تو اس میں کوئی شک نہیں کہ صفی کی شاعری کا یہ مجموعہ جو اپنے منکسرانہ نام کے لحاظ سے "پراگندہ" ہے مگر اپنی معنویت کے اعتبار سے نہایت "درخشندہ" ہے، صفیؔ کی شاعری کی کائنات کے مشاہدہ سے ظاہر ہے کہ یہ کائنات جن چیزوں سے آباد ہے، ان میں بانکپن لئے ہوئے سادگی ہے، دریا کی روانی ہے سہل ممتنع کی جلوہ طرازیاں ہیں، مضامینِ نو کی فصلِ بہار ہے، خیالات کا تسلسل ہے، ذہنی رنگ ترنگ ہے، جمالیاتی ذوق و شوق ہے، پنکھڑیوں کی نزاکت ہے شبنم کی لطافت ہے نکتہ آفرینیاں ہیں، حکمت کے موتی ہیں، نصیحت کے گلِ تازہ ہیں، محاوروں اور ضرب الامثال کی کثرت ہے، تشبیہات اور استعارے ہیں، دکنی زبان کے چٹخارے ہیں، اپنے عہد کے لوگوں اور عام مزاجِ انسانی پر تبصرہ ہے، آئینہ دکھانے کا عمل ہے، طنز کے تیر و نشتر ہیں، کہیں کہیں ظرافت کی پھوار ہے، دربار سے فرار ہے، سرکار سے گریز ہے، امرار سے دوری ہے،

شہرت طلبی سے بَیر ہے، نہ داد کی تمنا ہے، نہ صلہ کی پرواہ، تواضع کی تعلیم ہے، صبر کی تلقین ہے، اچھے اخلاق کا درس ہے، علم کی اہمیت کا بیان ہے، اساتذہ کا احترام ہے، بڑوں کا اکرام ہے، شاگردوں اور چھوٹوں کے ساتھ مشفقانہ معاملہ ہے، مظلوموں کی دادرسی ہے، بے نوا انسانوں کی حمایت ہے، حوصلے کی کرن ہے، تذکرۂ عزبت ہے مگر دولتِ قناعت لٹاتے ہوئے، سرمایۂ توکل بکھیرتے ہوئے اور سارے جہاں سے بے نیاز، ایک بے نیاز کی چوکھٹ پر نیازمندانہ سر جھکائے ہوئے اور زبان پر یہ ترانہ ؎

تیرے گدا کو دونوں جہاں سے غرض نہیں
صورت فقیر کی ہے تو دل بادشاہ کا

اور یہ بھی کہ ؎

صفی میری خوشی یا ناخوشی کیا!
رکھا جس حال میں اس نے، رہا خوش

صفی کی کائناتِ شاعری کی سیر، یہ بھی واضح کرتی ہے کہ شاعر خودشناسی کی لذت سے آشنا اور خداشناسی کی منزل سے ہم کنار ہے، اسی لئے طبیعت قلندرانہ ہوتے ہوئے بھی مزاج شاہانہ ہے، شاعر کو فکرِ آخرت بھی دامن گیر ہے، اور ہر مومن کی... طرح اس کے سینہ میں یہ دبی خواہش بھی ہے کہ "خدا مغفرت کرے"۔

صفی کی شاعری کے بارے میں یہ ہیں میرے مجموعی احساسات و تاثرات، اب آیئے چلیں ان کے شعری گلستاں کی طرف، یہاں سے میں نے جو پھول چنے ہیں، وہ یقیناً مشامِ جان کو تازہ اور معطر کرنے کا

باعث ہوں گے، سب سے پہلے یہ دیکھیے کہ صفیؔ خود اپنے بارے میں کیا کہتے ہیں ؎

تجھے یہ صاف گوئی اے صفیؔ بدنام کر دے گی
لگائی جائیں گی رائیں ترے اشعار پر کیا کیا

اے صفیؔ ہم پیروِ طرزِ جنابِ داغ ہیں
بندشیں یہ میرزا کی ہیں نہ لہجہ میرؔ کا

حسن سے خالی صفیؔ کی شاعری!
عیب سے خالی خدا کی ذات ہے

ہند میں ہے مرے اشعار کی تعریف صفیؔ
واہ واہ میں تو وطن میں ہوں مقدر باہر

رنگینیٔ خیال میں ہے خونِ دلِ صفیؔ!
میری خزاں ہے اور غزل کی بہار ہے

مناجات

یہ تھا صفیؔ کا اپنا "تعارف"، اس تعارف کے بعد دیکھیے کہ وہ اپنے خالق، مالک، آقا، مولیٰ اور پالنہار کے دربار میں "تعریف" کے جذبہ سے سرشار کس ادب کے ساتھ حاضر ہوتے ہیں، اور حاضری

کے بعد ان کے راز و نیاز کا انداز کیا ہے ؎

تو وہ ہے جو ہر ایک کی بگڑی سنوار دے
میری مراد بھی مرے پروردگار دے

داتا کی شان یہ ہے کہ جاری ہو اس کی دین!
سائل کا شیوہ یہ ہے کہ دامن پسار دے

مطلب سمجھ میں آئے بقائے دوام کا
ایسا سبق یہ زندگی مستعار دے

میں بار بار مانگوں جو درکار ہو مجھے
اور اپنے فضل سے تو مجھے بار بار دے

حسنِ طلب میں مجتہدِ عصر ہے صفیؔ
وہ تجھ سے ایک مانگے تو اس کو ہزار دے

نعتِ نبویؐ

جب وہ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں نعتیہ اشعار کہنا چاہتے ہیں تو سو سو طرح کے مضامین ان کے ذہن و دماغ میں آتے ہیں، نئی نئی تعبیر بھی ان کا استقبال کرتی ہے، نعت کے صرف دو شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

لاکھ مضمون ہیں مداحِ محمدؐ کے لئے
خرچ کے واسطے اندازہ نہ آمد کے لئے

چاند دو ٹکڑے کیا ماہِ عرب نے کیسا
کوئی ہتھیار بظاہر تو نہ تھا زد کے لئے

صفی کی شاعری کے مطالعہ سے واضح ہے کہ ایک ایک موضوع پر کئی کئی شعر ان کے مجموعہ میں ہیں، ظاہر ہے یہاں ان تمام کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا، اس لئے مختلف عنوانات کے تحت ذیل میں اشعار کا انتخاب ہی پیش کیا جا رہا ہے، پھر اشعار چونکہ آسان اور سہل ہیں، اس لحاظ سے تشریح و توضیح کی بھی ضرورت نہیں، عنوانات خود ہی معنی و مفہوم متعین کر دیں گے۔

یادِ الٰہی ــــ مختلف جلوے

تکلیف کا رنج ہو نہ راحت کی خوشی
عسرت کا ملال ہو نہ عشرت کی خوشی
میرے مالک مجھے اپنا کر لے
دوزخ کا ڈر رہے نہ جنت کی خوشی

بندے سے کھینچ، آگے خدا کے ہاتھ ہاتھ
بندے کے دو ہیں اور خدا کے ہزار ہاتھ

یہ تکیہ اور بستر ٹھاٹ ہیں سب اہلِ دنیا کے
جنہیں اس پر ہے تکیہ، ان کو تکیہ ہے نہ بستر ہے

اپنا دلِ بیمار دوا کا نہ دعا کا
احسان کسی کا نہیں احسان خدا کا

نہ ہو جس کو خدا کا خوف وہ بندے سے کیا جھجکے
قسم ہے اس نے قسمیں کھائی تھیں اقرار پر کیا کیا

خدائی چاہتا ہے بندگی کر!
خدا اس کا جو بندہ ہے خدا کا!

اللہ کو پکار اگر کوئی کام ہے
غافل ہزار نام کا یہ ایک نام ہے

خدا جانے صفی منشاء خدا کا
ہمارے کام تو ہم کر رہے ہیں

نہ چھوڑو زندگی بھر اے صفی تم بندگی اس کی!
وہ مالک دس گنا دیتا ہے بدلہ ہر اطاعت کا!

عبادت اور بندگی

عمر بھر میں ایک سجدہ ہی سہی
ہر عبادت میں صداقت چاہیے

اس نے بندہ سمجھ لیا ہے صفیؔ
آگئی کام بندگی میری

شہادت :

زندۂ جاوید ہوتے ہیں صفی
مرنے والا ان پہ مرتا ہی نہیں

توکل :

ہم کو توکّل نے پڑھایا ہے سبق
مل جائے تو روزی ہے نہیں تو روزہ

تقدیر اور مقدر :

اس کو تقدیر کا دھنی کہیے
جسنے سب کھو کے اس کو پایا ہے

وہ جلوہ اور طور، مقدر پہاڑ کے
کیسی شراب کس کو پلا دی پچھاڑ کے

صفی ہر آدمی قسمت کا اچھا ہو نہیں سکتا
مقدر بھی جو ملتا ہے تو ملتا ہے مقدر سے

ایمانداری :

لوگوں سے اٹھتی جاتی ہیں ایمانداریاں دنیا سے اٹھتے جاتے ہیں ایماندار لوگ

اسلام اگر زندگی میں ہو:

اے صفی اس وقت کا اسلام کیا اسلام تھا
سیکڑوں لاکھوں پہ بھاری تھے بہتر آدمی

اگر اچھا بننا ہے:

اچھا بنوں یہ شوق اگر ہے تو اے صفی
کچھ روز اچھے لوگوں کی جوتیاں اٹھا!

حسنِ صورت اور حسنِ سیرت:

واعظ کے نیک و بد کی تو اللہ کو خبر
ظاہر میں آدمی تو بہت شاندار تھا

اچھے کن دیکھ اچھی شکل نہ دیکھ
سنکھیا بھی سفید ہوتی ہے

ظاہر کو نہ دیکھ، دیکھ نادان سنبھل
اٹکل پر قیاس کر نہ اعلیٰ اسفل
حسن صورت پہ جان دینے والے
سونا سونا ہے، اور پیتل، پیتل

جب اس نے وعدہ کیا، میں نے انتظار کیا
زباں پر نہیں، صورت پر اعتبار کیا

علم و فن:

زمانہ علم و ہنر کا ہے سیکھ علم و ہنر
گیا وہ دَور کہ ٹھوکر لگی خزانہ ملا

شاعری کھیل ہو گئی ہے صفی!
اِکّے دُکّے رہے ہیں فن کے لوگ

استاد — مرتبہ، ادب اور خدمت

ایک دن باضابطہ استاد بنتا ہے صفی
سیکھتا ہے جو کسی فن کو کسی استاد سے

صفی استاد کا اور باپ کا رتبہ برابر ہے
مرے کیا حضرتِ کیفی کہ سایہ اٹھ گیا سر سے

ہر ہنر خدمتِ استاد سے آتا ہے صفی
لیکن اس کام میں شاگرد بھی استاد رہے

صفی استاد بننا ہے تو استادانِ عالم کی اٹھاؤ جوتیاں، تازہ کرو حقے بھرو چلمیں

نہ نالوں کا، نہ آہوں کا، نہ یہ فریاد کا رنگ ہے
مری محنت خدا کی دین ہے استاد کا رنگ ہے

دکن کے لوگ:

خلق و تہذیب میں خدا رکھے
ہیں غنیمت بہت دکن کے لوگ

دکنی زبان شعری پیرہن میں:

سرکار غریبوں میں بھی ہوتے ہیں بڑے لوگ
ایسے نہ کیا کیجئے تحقیر کسی کی

چھٹی اُمید تو میں حالِ دل کہنے میں کیوں ڈرتا
مثل مشہور ہے سرکار مرتا کیا نہیں کرتا

کیسی کیسی خواہشیں جینے میں ہیں
سیکڑوں بچھو مرے سینے میں ہیں

چوٹیں جو کھائیں دل پہ محبت میں کیا کہوں
پتھر پڑے ہیں کیا میری قسمت میں کیا کہوں

تاثیر سخن:

تاثیرِ سخن کسب سے حاصل نہیں ہوتی
یہ دَین خدا کی ہے صفی جس کو خدا دے

سادگی:

بناوٹ ہو تو ایسی ہو کہ جس سے سادگی ٹپکے
زیادہ ہو تو اصلی حسن چھپ جاتا ہے زیور سے

توقع اور امید:

ہے زندگی تو پائیں گے گلِ مُراد!
اب کی بہار میں نہیں اب کی بہار پر

اکلِ حلال:

آدمی کے واسطے ہے لذتِ اکلِ حلال
پیٹ بھر لینا تو ہر حیوان کو بھی یاد ہے

غرور:

ہے بشر خاک کا پُتلا مگر اللہ رے غرور
جس کو دیکھو یہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں ہوں

خود غرضی اور خود بینی:

صفی شیوہ ہو خود بینی ہی جس کا نظر آئے گا اس کو دوسرا کیا

صفی تیری قسم کس نے تجھے باور کرایا ہے
بھلا وہ خود غرض خود کام اور اس پر اثر میرا

ہر خود غرض کو دوست سمجھتا رہا صفیؔ
میرے لئے عذاب مرا حسنِ ظن رہا

صفی اس اپنی شُدبُد پر ہی تم کو ناز ہے اتنا
ذرا دنیا میں دیکھو لوگ کیسے کیسے لائق ہیں

کون کرتا ہے وفا، لے ہوش کے ناخن صفی!
ساری دنیا اپنے مطلب کی ہے بھائی آج کل

یہ دنیا خود غرض ہے حلوے مانڈے سے اسے مطلب
مرے کوئی تو مردہ جائے دوزخ میں کہ جنت میں

صرف اپنے لئے جہد و بقا خود غرضی ہے
اسلاف کی توہین نہ کر سب کی بقا دیکھ!

غرض مند

اسے کیا رات دن جو طالبِ دیدار پھرتے ہیں
غرض ہے تو غرض کے واسطے سو بار پھرتے ہیں

غرض اِس طرح اندھا بنا دیتی ہے انساں کو
کہ ہر نا آشنا بھی آشنا معلوم ہوتا ہے

اندازِ گفتگو:

آدمی کی ہو بول چال ایسی
نہ ہو دل پر کسی کے بھاری بات

تبصرہ:

نیک دل اور حق نگاہ صفیؔ
پہلے سو تھے تو اب پچاس نہیں

اعتراض:

ناقدوں کا پیشہ ٹھیرا زندگی بھر اعتراض
ہر کسی کی عیب چینی، ہر کسی پر اعتراض

مشورہ تھا رائے تھی، میری صلاحِ نیک تھی
آپ سمجھے ہیں جسے اے بندہ پرور اعتراض

پہلے اس کو کوئی سمجھے، دوستی کیا چیز ہے
جو سمجھ والے ہیں کرتے ہیں سمجھ کر اعتراض

پھر نہ کہہ ایسا خدا نے کیوں بنایا ہے تجھے ! !
توبہ توبہ کر ارے بندے یہ کس پر اعتراض

آج کل مشہور ہونے کی یہی ترکیب ہے
چھاپتے جائیں سخنور پر سخنور اعتراض

نکتہ چینوں کی جماعت بڑھ رہی ہے خیر ہو
وہ دن آتے ہیں کہ پیسے میں ہوں ستر اعتراض

بس خدا کی ذات ہے بے عیب ہم تم کیا صفی
آج تک ہوتے نہیں آئے ہیں کس پر اعتراض

طرزِ زمانہ :

لگا کر جھوٹ سچ اچھے دلوں میں دشمنی ڈالی
تمہاری انجمن کے لوگ بھی کتنے منافق ہیں

کچھ حضرتِ یوسف ہی پہ موقوف نہیں ہے
مخلوق ستاتی رہی خاصانِ خدا کو

بدنام کرنے والوں کا احسان مند ہوں
اپنی زباں سے کچھ بھی نہ کہنا پڑا مجھے !

بے کسی میں کون کس کا ساتھ دیتا ہے صفی !
ملنے والے ہیں تماشے کے یہ میلے جائیں گے

مخلوق ہاتھ چومتی ہے ان کے اے صفی
حیلہ تراش لیتے ہیں جو ہر گناہ کا

بے نیازاور نیازمندی:

یاد فرما کے وہ تو بھول گئے !
سر جھکائے ہوئے کھڑا ہوں میں

ان کو ایسی کیا پڑی ہے جو ہمارے واسطے
وعدہ کرلیں یاد رکھیں اور آئیں یاد سے

بے وطنی:

ہر عیش اس کے واسطے رنج و محن ہوا
جس وقت بے وطن کو خیالِ وطن ہوا۔

عشق:

عشق میں اچھا برا کب سوجھتا ہے اے صفی
اس بلا نے آلیا جس کو وہ اندھا ہوگیا

آج تک جیتا نہ چھوٹا کوئی دامِ عشق سے
موت ہی انجام ہے اس قیدِ بے زنجیر کا

خودکشی:

خودکشی کیوں جرم میں داخل نہ ہو
کیا امانت میں خیانت چاہیئے!

تلون مزاجی:

نہ اس کی دوستی کچھ ہے، نہ اس کی دشمنی کچھ ہے
کبھی تولہ، کبھی ماشہ، کبھی کچھ ہے، کبھی کچھ ہے

عزم و حوصلہ:

جان پر اپنی کھیلنے والے
سو میں سو کامیاب ہوتے ہیں

لے کام اپنی زندگی مستعار سے
ہے فائدہ کی چیز اٹھا اس سے فائدہ

صبر و شکر:

خوگرِ صبر ہو گئے جو صفی
جیتے جی ہیں وہ لوگ جنت میں

قدر و قیمت:

یوسف اک حُسنِ مکمل اور قیمت کچھ دِرم
ہائے ناقدری کہ کیسا مال کیا سستا گیا

ہمدردی، غمخواری اور انسانیت نوازی

اہلِ دَولت کا حقیقی مرتبہ معلوم ہو
حق اگر پورا ملے مزدور کو مزدور کا

بندوں پہ رحم چاہیے بندے خدا سے ڈر
ہوتا ہے اک آن میں ظالم کا گھر خراب

وہ گھڑی بھر پاس بیٹھے بھی تو بالکل اس طرح
جس طرح مغرور دولتمند اک مفلس کے پاس

نہ ستایا کرو غریبوں کو
کیا خبر کس کے دل سے کیا نکلے

عید اس کی ہے جس کی عید کے ساتھ!
سو غریبوں کی عید ہوتی ہے

کہاں کی رسم، یہ کس ملک کا دستور ہے پیارے
جھڑک دیتے ہیں سائل کو برس پڑتے ہیں سائل پر

اخلاق، تواضع اور ملنساری:

کھنچ کے ملنا بھی کوئی ملنا ہے
ایک ہے وہ جو یوں ملا نہ ملا

کوتاہی کیوں ہے غم کی مدارات میں صفی
ہے فرض میزباں پہ مہمان کا لحاظ

چار لوگوں کے دکھانے کو تو اخلاق سے مِل
اور کچھ بھی نہیں دنیا میں بھرم دیکھتے ہیں

ملنساری بھی سیکھو جب نگاہِ ناز پائی ہے
مِری جاں آدمی اخلاق سے تلوار جوہر سے

جھک کے ملنا بڑی کرامت ہے۔
اس سے دنیا مرید ہوتی ہے

لوگوں سے ہر اک ڈھب سے مِل جُل کے رہو
اب تک نہ رہے ہو تو اب سے مِل جُل کے رہو

دنیا میں اگرچہ نیک و بد سب ہیں صفی
رہنا ہے یہاں تو سب سے مِل جُل کے رہو

دوستی اور آشنائی:

آشنائی میں کچھ مزا نہ ملا
آشنا دردِ آشنا نہ ملا

وہ آدمی نہیں جو نہ ہو آشنا پرست
پھر کوئی بت پرست ہو یا ہو خدا پرست

ہزاروں دولتوں کی ایک دولت
بھروسہ آشنا کو آشنا کا

کس کو پسند ہوئی ہے تکلیف دوست کی
فرشِ آگ کا خلیلؑ کی خاطر چمن ہوا

دوست کو دشمن سمجھنا بے وقوفی ہے صفی!
کیا نہیں پہچان سکتے خوئے دشمن خوئے دوست

اہلِ دل بے وفا نہیں ہوتے
تم نے کیسوں کو آزمایا ہے

خاطرِ احباب:

انسان کبھی خاطرِ احباب نہ توڑے
ایسا جو کرے گا تو پشیمان رہے گا

اپنی طبیعت، اپنا رنگ:

ہم اپنی وضع کیوں بدلیں کسی کے کہنے سننے پر
صفی مختار ہے ہر آدمی اپنی طبیعت کا

ہے تقاضائے احتیاط یہی
سو میں بیٹھو نہ چھوڑو اپنا رنگ

غصہ:

توبہ کرو انسان کو اتنا غصّہ
پانی پیو شیطان پہ لاحول پڑھو

جوانی:

جوانی نہیں بن سنورنے کے دن
جھجکنے کی راتیں ہیں، ڈرنے کے دن

بڑھاپا:

اب چھوڑو صفی سیاہ کاری
داڑھی میں سفید بال آئے

بڑھاپے میں بیکار ہیں شوق ذوق
یہ ہیں اللہ اللہ کرنے کے دن

ظرافت:

ہوتے ہیں بے گناہ صفی سارقانِ شعر
لکھتے ہیں جس قلم سے وہ ہوتا ہے "پارکر"

لیں اطاعت آج اور ہو فردوس کل عطا
یہ "نوکری تو نقد ہے، تنخواہ ادھار ہے"

نکتہ سنجی:

سب حال ان پہ کھل گیا رونے سے اے صفی
آنسو کا قطرہ قطرہ مرا رازدار تھا

صدموں سے چھوٹتے ہی نہیں صاحبانِ فیض
پتھر برستے ہیں شجرِ میوہ دار پر

صفی کو مسکرا کر دیکھ لو غصہ سے کیا حاصل
اسے تم زہر کیوں دیتے ہو جو مرتا ہے شکر سے

چاکِ قمیصِ حضرت یوسفؑ کچھ اور تھا
تہمت نہ جوڑ اپنے بھی دامن کو پھاڑ کے

آلائشِ زمانہ سے دامن بچا صفیؔ
کتا بھی بیٹھتا ہے جگہ اپنی جھاڑ کے

آیا ہے خط میں اک ورقِ سادہ اے صفی
گویا اب اس نے صاف مجھے دے دیا جواب

پوچھتے پوچھتے دلّی کو چلے جاتے ہیں
آپ کو گھر نہیں معلوم صفی کا کیا خوب

بے غرض دنیا میں جینا بھی ہے بدنامی کا گھر
لوگ مجھ کو یہ سمجھتے ہیں کہ میں مغرور ہوں!

ہماری بے کسی پر ہنسنے والو
بُرے دن عمر بھر کس پر رہے ہیں

سخن سنجوں کے دل میں بھی ذرا سا چور ہوتا ہے
یہ بنئے کچھ نہ کچھ پاسنگ رکھتے ہیں ترازو میں

صفی کا ذوق ہر حالت میں اس کا ساتھ دیتا ہے
شکر خورے کا منہ اللہ بھر دیتا ہے شکر سے

جلد بازوں نے دیا ترکِ تعلق کا سبق
کام بننے کے بگڑ جاتے ہیں نادانوں سے

صفی کو طفلِ مکتب جانتے ہیں اس لئے شاعر
کہ ہر اک شعر اس کا بچے بچے کی زباں پر ہے

حکمت :

گھٹا سکتا نہیں کوئی بھی اس کو
خدا جس کو بڑھانا چاہتا ہے

اسی لئے تو بنا ہے یہ اشرف المخلوق
کہ آدمی حق و باطل میں امتیاز کرے

اے صفی وقت کو بُرا نہ کہو
وقت پیغمبروں پہ آیا ہے

جہاں اس کی اماں ہو لاکھ دشمن ہو تو کیا پروا!
وہاں جائے کو مکڑی اور انڈوں کو کبوتر ہے

خاموشی میں زباں کی راحت ہے
عصیاں سے بچو تو جان راحت ہے

قلت اسباب کی ہے راحت دل کی
دل کی راحت جہاں کی راحت ہے

قرض خواہوں سے خلاصی جو ذرا پائی ہے
رات میں کچھ مجھے آرام سے نیند آئی ہے

آدمی اِس ہاتھ دے اس ہاتھ لے
نیک و بد کا دینا ہاتھوں ہاتھ ہے

دل خانۂ خدا ہے نگہداشت اس کی کر
اچھا نہیں رہے گا ہوا یہ اگر خراب

نہ یہ تاثیر ٹوٹنے میں نہ یہ تسخیر جادو میں!
زمانہ اس کے قابو میں ہے جس کا دل ہے قابو میں

ذرا سی بھی کجی ہو نفس میں تو قہر ہی سمجھو
نہیں ہوتا کوئی دو چار گز کا ڈنک بچھو میں!

اللہ اللہ اشرف المخلوقات
رنگ معمار ہے عمارت میں

محبت بے اطاعت ایک دھوکا ہے محبت کا
محبت کا جو دعویٰ ہے تو کوشش کر اطاعت میں

مصیبت نام ہے اہلِ وفا کی آزمائش کا
اسی میں آدمی کا حوصلہ معلوم ہوتا ہے

سمجھ والوں میں دولت ہے کسوٹی اہلِ دولت کی
بہت جلد اس میں ہر کھوٹا کھرا معلوم ہوتا ہے

جہاں پھنس جاتی ہے ہر طرح کے طوفان میں کشتی
وہاں فرقِ خدا و ناخدا معلوم ہوتا ہے

کسی کا رزق رک سکتا نہیں خلاقِ اکبر سے
صفی پتھر کے کیڑے کو غذا ملتی ہے پتھر سے

اطاعت وہ ہے جو حیوان کو انساں بناتی ہے
لیا ہے نامہ بَر کا کام لوگوں نے کبوتر سے!

بصیرت:

بڑی چیز آنکھ ہے، انسان پہلے آنکھ پہچانے
نظر کا تاڑ جانا بھی تو آدھی عیب دانی ہے

خدا نے دی ہیں آنکھیں دیکھنے ہی کو مگر!
ذرا کھوٹا کھرا پرکھو، ذرا عیب و ہنر دیکھو

نصیحت:

نصیحت کرنے والوں کی نصیحت!
مجھے پینا ہے اک کڑوی دَوا کا

آبرو کھو کر کوئی کیوں اہلِ دولت سے ملے
پاؤ ٹکڑا لاکھ نعمت ہے جو عزت سے ملے

نہ چھوڑو سلامت روی اے صفی
زمانے کی رفتار اچھی نہیں!

کہنے میں رکھے زبان انساں
جو کچھ بولے سمجھ کے بولے

جہاں کوئی نہ پوچھے اس جگہ جانے سے کیا حاصل
جہاں عزت نہ ہو تو کیوں کوئی بارِ دگر جائے

فکرِ آخرت:

دنیا کھیتی ہے آخرت کی
جو کچھ بونا ہے جلد بولے

ہمیں عقبیٰ کا دھڑکا اور دنیا بھر کی فکریں ہیں
اُدھر آدھے ہیں گویا گور میں، آدھے اِدھر گھر میں!

کچھ نہ ہو کاتبِ اعمال کا دھڑکا تو ہے۔
ایک انسان بھی دنیا میں سبکدوش نہیں

الٰہی! بند مٹھی کا بھرم رکھ لے قیامت میں
نہ کھلوا دشمنوں کے سامنے گٹھڑی گناہوں کی

بے بھروسہ زندگی:

ابھی سب کچھ ابھی نہیں کچھ بھی اے صفیؔ کیا بتاؤں کیا ہوں میں

زندگی کا کیا بھروسہ اے صفی　　آج گھر میں ہیں تو کل ہیں گور میں

صفی کے شعری گلستاں سے جو پھول چنے گئے، وہ پیش کر دیئے گئے تاہم یہ شعری پھول صفی از خود پیش کرتے یا دوسرے لفظوں میں وہ اپنے ان اصلاحی، تعمیری اور تربیتی اشعار کو خود سناتے تو مزا ہی کچھ اور تھا، صفی نے یہ بات خوب کہی ہے ؎

صفی ہی سے صفی کے شعر سنئے تو مزا آئے
مصنف کی زباں سے خوبی تصنیف کھلتی ہے

صفی اگر زندہ ہوتے اور ان سے ان کے اشعار سنے جاتے تو سننے والے یقیناً ان کی خدمت میں انہیں کا یہ شعر بصد عقیدت و محبت بطورِ نذرانہ پیش کرتے ؎

تیری غزل سے ہوتی ہے تسکینِ دل صفی
اللہ اور تیرے ہنر میں کمال دے

صفی دنیا سے وہاں چلے گئے، جہاں سب کو یکے بعد دیگرے جانا ہے، ایک مومن کی حیثیت سے ان کی نظر آخرت پر تھی، اور چاہتے تھے کہ آخرت بنی اور سنوری رہے، اور خدا ان کی مغفرت فرما دے، اِس مومنانہ خواہش ہی کی وجہ سے اپنی زندگی میں انہوں نے اپنے دوستوں سے یہ نہایت مودبانہ التجا کی ہے، جس کا احترام ان کے ہر دوست اور چاہنے والے کو کرنا چاہیئے ؎

دوستوں سے یہ التجا ہے میری
مغفرت کے لئے دعا کرنا

خمارؔ کی شاعری۔ ایک مطالعہ

دنیا میں جو بھی آتا ہے، جانے ہی کے لئے آتا ہے، خمارؔ بارہ بنکوی بھی آئے اور چلے گئے، مگر ان کا جانا ان لوگوں کے جانے کی طرح نہیں ہے، جو جانے کے بعد بھلا دیئے جاتے ہیں، خمارؔ اردو کے ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے، وہ اردو شعر و ادب کی تاریخ کا ایک حصہ بن چکے ہیں، جب جب یہ تاریخ نگاہوں کے سامنے آئے گی، خمارؔ کا نام بھی روشن حرفوں میں آتا رہے گا، کیونکہ خمارؔ کی شاعری کی حیثیت "چراغِ انجمن" کی نہیں، جو ایک شب کا مہمان ہوتا ہے، بلکہ انہوں نے اپنی شاعری سے ایسے "شمعِ دل" روشن کی ہے، جو کبھی جل کر بجھتی نہیں ہے، دیکھئے کہ وہ کیا کہتے ہیں ؎

یہ چراغِ انجمن تو ہیں بس ایک شب کے مہماں
تو جلا وہ شمع اے دل جو بجھے کبھی نہ جل کے

اسی غزل کا مقطع ہے ؎

کوئی اے خمار ان کو مرے شعر نذر کر دے
جو مخالفین مخلص، نہیں معترف غزل کے

خمار کی طلب دائمی ہے، اور ان کا سفر جاوداں ہے ؎

میری طلب ہے دائمی، میرا سفر ہے جاوداں
منزلِ شوق رہ گئی، مجھ کو خبر نہیں کہاں

اسی غزل کا یہ دوسرا شعر بھی روح کو وجد میں لاتا ہے ؎

تازگی و شگفتگی روح میں چاہئے نہاں
اہلِ جنوں کے واسطے کیسی بہار کیا خزاں

خمار کا یہی وہ انداز، طرزِ بیان، مزاج کی شگفتگی، ذہن کی تازگی اور جواں عزم و حوصلہ ہے، جس نے انہیں زندگی میں بھی زندہ رکھا ہے، اور موت کے بعد بھی وہ تاریخ کے صفحات میں زندہ و تابندہ رہیں گے

بڑھ کے جہادِ عشق میں جان گنوا دے اے خمار
موت کو زندگی بنا، زندگی، زندگی نہیں

زیرِ نظر مضمون کی غرض و غایت خمار کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ نہیں ہے، مگر یہ کہے بغیر آگے بڑھنے کو جی بھی نہیں چاہتا کہ ان کی شاعری میں دریا کی روانی ہے، آبشار کا ترنم ہے، پھول کی مہک ہے، شبنم کی لطافت ہے، ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہے، ساز بھی ہے اور سوز بھی، گدگدی بھی ہے، اور گدازی بھی، بابِ انسانیت پر دستک ہے، درسِ اخوت ہے، زندگی اور موت پر فلسفیانہ نگاہ ہے، سماج پر کہیں میٹھے اور کہیں تیکھے انداز پر تبصرہ ہے، عشق و محبت کی جلوہ طرازیاں ہیں، واعظ و ناصح سے چھیڑ چھاڑ ہے، مسجد و میخانہ کا تذکرہ ہے، عبادت

کی حلاوت ہے، بے ریا سجدہ کی تعریف ہے، اپنے اوپر کبھی نگاہِ ناقدانہ ہے اور کبھی ناصحانہ، عالی حوصلگی کا سبق ہے، یہ نصیحت بھی ہے کہ ہمتِ شوق کو کم نہ کر، اور راہِ بقا میں تیز دَم اپنے قدم بڑھائے جا، کہیں غم کے آنسو ڈھلکتے ہوئے ملتے ہیں، تو کہیں خوشیاں گنگناتی اور رقص کرتی نظر آتی ہیں، اسی لئے مجموعہ کلام کا نام حدیثِ دیگراں بھی ہے "آتشِ تر" بھی ہے "رقصِ مے" بھی اور "شبِ تاب" بھی۔

کوئی بھی شاعر اور کوئی بھی فلسفی ہو، وہ اپنے دَور کے شاعروں اور فلسفیوں سے ضرور متأثر ہوتا ہے، خمارؔ کو دیکھا جائے تو وہ جگرؔ سے بہت زیادہ متأثر نظر آتے ہیں، ان کا یہ تأثر شعری سانچہ میں اس طرح ڈھل کر سامنے آتا ہے ؎

غزل بعدِ جگرؔ اک کشتیِ بے ناخدا سی ہے
اگر طوفان کوئی اے خمارؔ آیا تو کیا ہوگا

خمارؔ کی شاعری میں جگرؔ کا رنگِ تغزل تو ہے ہی، اس کے ساتھ اصغرؔ کا اندازِ بیان بھی ہے، میرؔ کا درد بھی، حالیؔ کی سادگی بھی، اور حفیظؔ جالندھری کی نغمگی بھی، اس کے باوجود وہ اپنے لب ولہجہ کی ایک شناخت اور پہچان رکھتے ہیں، جس سے شاعری میں ان کا امتیاز اور انفرادیت قائم ہوتی ہے، خمارؔ کی شاعری کے بارے میں علی سردار جعفری کا یہ تبصرہ بہت خوب ہے:

"غزل جس کا ہر شعر ہوا کے نرم اور لطیف جھونکے کی طرح آئے، اور گزر جائے، اور دل میں تازگی کی ایک کیفیت پیدا کر جائے، یہ ہے خمارؔ کی شاعری، اس میں

غزل کی کئی سو برس کی روایات کی تہذیب و شائستگی ہے،
اور سہل بیانی کا ایک ایسا جادو ہے، جو فریب میں مبتلا کر دیتا
ہے، یہ یقین کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے کہ ایسا شعر تو ہم
بھی کہہ سکتے ہیں، مگر اقبالؔ اور غالبؔ کے رنگ میں کہنا
آسان ہے، اور اس رنگ میں کہنا مشکل ہے، اس کی وجہ
یہ ہے کہ اس میں فکر اور خیال کی اور تشبیہ و استعارہ کی
تراش خراش ایک سکہ سے ہے ہی نہیں، جس کی نقل کی
جائے، یہ میرؔ اور ان کے ہم عصروں کی روایت ہے، جن
کے یہاں خارجی آرائش برائے نام تھی، یہ شاعری، شاعر
کی اپنی طبیعت کی شگفتگی اور شخصیت کی دل نوازی سے
آراستہ ہے، اور اس شخصیت کی نقل کرنا منہ چڑانے کے
برابر ہے،، (آتشِ تر صفحہ ۸-۷)

اسی سلسلہ میں وہ آگے لکھتے ہیں:

،، خمارؔ کے معنوی اور شعری خاندان کا سلسلہ غالبؔ
اقبالؔ اور جوشؔ سے نہیں ملتا، جگرؔ مرادآبادی کا عکس
زیادہ ہے، مگر یہ صرف عکس ہی ہے، اصلیت خمارؔ اور
ان کی شاعری ہے،، (آتشِ تر صفحہ ۱۱)

خمارؔ کا خود اپنے بارے میں جو خیال ہے، اسے "بوئے گل در برگِ گل"
(پھول کی خوشبو، پھول کی پتیوں میں) کی حیثیت سے پڑھئے:

،، میں نے جملہ اصنافِ سخن کا تجزیہ کرنے کے بعد اپنے
محسوسات و واردات کے اظہار کے لئے کلاسیکی غزل

ہی کو سب سے زیادہ موزوں اور مناسب پایا، چنانچہ
غزل کے خدمت گزاروں میں شامل ہوگیا، وقت نے کئی
کروٹیں بدلیں، مگر میں نے غزل کا دامن نہیں چھوڑا"
(رقصِ مے صفحہ ۷)

وہ اپنی اس تحریر کے آخر میں لکھتے ہیں:

"آخر میں اتنا عرض کروں گا کہ میں نے غزل کے حسن و
جمال میں کوئی اضافہ تو نہیں کیا، مگر اس پرآشوب دَور
میں اس کے خدوخال کی آب و تاب کم نہیں ہونے دی"
(رقصِ مے صفحہ ۸)

کلاسیکی غزل کے بے نظیر شاعر اور شہنشاہِ ترنم خمارؔ اب تو کسی مشاعرہ میں آکر نشاط انگیز سوز کے ساتھ اپنی کوئی غزل نہیں سنائیں گے، مگر آیئے ان کے بعد ان کی کتابوں کے سہارے ان کی "بزمِ شاعری" میں کچھ دیر حاضری دے کر یہ دیکھیں کہ زندہ دل شاعر نے زندہ انسانوں کے لئے مختلف جہتوں اور سمتوں سے اپنے پیارے اور نرالے انداز میں کیا پیغام دیا ہے، اس موقع پر خمارؔ کی اس خوبی کو نہ بھولئے کہ جگرؔ کے نقشِ قدم پر چلنے والے خمار اپنی مئے ناب اور خمار آلود زندگی سے جگر ہی کی طرح تائب ہوکر میخانہ سے مسجد کی طرف آنے کی، اللہ والے بننے کی، اور عیش وطرب سے متاعِ آخرت حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہوگئے تھے، انہیں اپنی بخشش کی فکر بھی دامن گیر تھی، چند اشعار ملاحظہ فرمایئے ؎

حیرت ہے تم کو دیکھ کے مسجد میں اے خمارؔ
کیا بات ہوگئی جو خدا یاد آگیا

قیامت یقیناً قریب آگئی ہے ! خمارؔ اب تو مسجد میں جانے لگے ہیں!
خمارؔ اب تخلص بھی اپنا بدل دو بنے ہو جو میکش سے اللہ والے

اے موت، اے بہشت سکوں آ، خوش آمدید
ہم زندگی میں پہلے پہل مسکرائے ہیں

خمارؔ کی زندگی میں یہ انقلاب کیوں اور کیسے آیا، ضروری نہیں کہ یہاں اس کی تفصیلات بیان کی جائیں، لیکن یہ انقلاب بلکہ "صالح انقلاب" ان کے دلِ زندہ اور صفائیِ ضمیر کی ضرورت علامت ہے، اور ان کی شاعرانہ عظمت کے ساتھ ان کی یہی زندہ دلی اور صفائیِ ضمیر میرے قلم کے لئے محرک بنی کہ وہ کچھ پھول ان کے گلستانِ شاعری سے چنے، آیئے اس کی ابتدا اس شعر سے کرتے ہیں ؎

خوفِ خدا نے پاؤں میں زنجیر ڈال دی
کوئے بتاں میں ٹھوکریں کھانے کے دن گئے

خمارؔ کہتے ہیں کہ عبادت اور بندگی کا کمال یہ ہے کہ جب سجدہ میں جبین (پیشانی) جھکے تو اس کے ساتھ دل بھی جھکنا چاہیئے، اس عابد و زاہد کی حالت قابلِ رحم ہے، جو جبین تو جھکائے، مگر دل نہ جھکا سکے، اس سے ایک رسم تو ادا ہوگی، مگر عبادت کی لذت کو وہ عابد و زاہد پا نہ سکے گا ؎

مجھے تو ان کی عبادت پہ رحم آتا ہے
جبیں کے ساتھ جو سجدے میں دل جھکا نہ سکے

بارگاہِ الٰہی سے فطری طور پر ایک انسان کو جو اختیار اور آزادی دی گئی ہے، اس کا اظہار وہ اپنے مخصوص انداز میں اس طرح کرتے ہیں:

آگے جبینِ شوق تجھے اختیار ہے
یہ دیر ہے، یہ کعبہ ہے، یہ کوئے یار ہے

صوفیانہ رنگ کا یہ شعر بھی خوب ہے ؎

کئے جاتے ہیں سجدے نفعِ جنت کے لئے تو یہ
عبادت بھی معاذاللہ تجارت ہوتی جاتی ہے

سجدہ اور بندگی کا اعلیٰ تصور اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

سر رہے اختیار میں، سجدہ وہ سجدہ ہی نہیں
بندگی اور بقید ہوش، کھیل ہے بندگی نہیں

خمار کہتے ہیں کہ ایک بندہ کا کمال یہ ہے کہ وہ بارگاہِ خداوندی سے ہمیشہ لگا چمٹا رہے، اور دستِ طلب بڑھائے رکھے، یہ وہ بارگاہ ہے جہاں سے انسان خالی ہاتھ نہیں لوٹایا جاتا، ایک مومن اس حقیقت پر یقین رکھتا ہے کہ حریم قدس میں دیر تو ہے اندھیر نہیں ؎

دستِ طلب بڑھائے جا، یوں ہی صدا لگائے جا
اس کے حریم قدس میں دیر ہے، دھاندلی نہیں

کتنی اونچی سطح سے اونچا تخیل، نہایت سادہ زبان اور عام فہم انداز میں دیتے ہیں ؎

مرضیِ دوست میں تجھے دخل دی روا نہیں
دل ہو جو مائلِ دعا، ہاتھ اٹھا کے بھول جا!

خمار رحمتِ پروردگار کا سہارا اس طرح دلاتے ہیں ؎

اے محتسب عذابِ جہنم بجا مگر
اک چیز اور رحمتِ پروردگار ہے

اسی موضوع سے متعلق ان کا دوسرا شعر ہے ؎

خطائیں کرتے کرتے توبہ کر لی ہے خمارؔ اکثر
تڑپ کر رہ گئی ہے رحمتِ پروردگار اکثر

آلِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے الفت کا انداز دیکھئے ؎

خود کو پاتا ہوں بہت آلِ محمد سے قریب
زندگی جب مری فاقوں میں بسر ہوتی ہے

زندگی اور موت کی حقیقت کو یوں سمجھاتے ہیں ؎

جان دی پروانہ وار اس حسن سے عباس نے
جینے والے موت ہی کو زندگی کہنے لگے!

راہِ حق میں مرنے والے روزِ عاشورہ خمارؔ
موت سے کھیلا کئے اور زندگی بڑھتی گئی!

اگر خمارؔ کے مجموعہ کلام میں سے مقصدی اور تعمیری اشعار کا انتخاب مختصر تمہیدی سطروں کے ساتھ بھی پیش کیا جائے تو مضمون خاصا طویل ہو جائے گا، اس لئے چند اہم عنوانات کے تحت ان کے اشعار ذیل میں درج کئے جا رہے ہیں، یہ اشعار بلاشبہ ذہن و فکر کے دریچوں کو وا کرنے والے، حوصلہ و ہمت بڑھانے والے، امنگ سے سینہ کو لبریز کرنے والے، اور زندگی کی حقیقتوں سے پردہ اٹھانے والے ہیں، اشعار پڑھتے جائیے، اور نظر کی راہ سے دل میں اتارتے جائیے:۔

زندگی:

زندگی میں ٹھوکریں بھی کھایئے
شرط مگر یہ ہے سنبھل جایئے!
مانا کہ زندگی فانی ہے لیکن
اگر آجائے جینا جاوداں ہے
دو دن کی زندگی تھی کہ صدیوں کا تھا سفر
ہم کیا بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا گئے

غم اور خوشی:

اللہ کے بندے ہیں وہ بھی، ہوتی ہے ودیعت جن کو خوشی
وہ چشم و چراغِ رحمت ہیں، غم جن کو عطا ہو جاتا ہے
وہ بدنصیب ہیں جنہیں غم ناگوار ہے
غم تو دلیلِ رحمتِ پروردگار ہے
ملنے کو خمارؔ اس دنیا میں ملتے ہیں ہزاروں دوست مگر!
اک مخلص تنہا غم کے سوا ہر دوست جدا ہو جاتا ہے

آدمی اور آدمیت:

پھول کر لیں نباہ کانٹوں سے
آدمی ہی نہ آدمی سے ملے

یوں تو ہم زمانے میں کب کسی سے ڈرتے ہیں
آدمی کے مارے ہیں، آدمی سے ڈرتے ہیں۔

وفا اور محبت :

اس دَورِ ترقی میں سبھی کچھ ہے میسر
اک چیز محبت ہے کہ پائی نہیں جاتی

اِس دَور کے انسان وفا بھول گئے ہیں
بے چارے فرشتے ہیں خطا بھول گئے ہیں

محبت انتظارِ دائمی کا نام ہے اے دل
کوئی آیا تو کیا ہوگا، نہیں آیا تو کیا ہوگا

کانٹے جو بچھائے یہ دنیا گھبرا نہ خمارؔ آبلہ پا
تبلیغِ محبت کرتا جا، ماحول وفا بیزار سہی

فلسفۂ محبت :

بلا کچھ سوچے سمجھے ایک ہو جاتی ہے دو روحیں
محبت اتحادِ ناگہاں معلوم ہوتی ہے

عشق (وسیع معنی و مفہوم میں)

عشق میں جان بھی دے دی میں نے خمارؔ
آج حق زندگی کا ادا ہو گیا

منزلِ عشق سے گزر، بے خود و مست و بے خبر
چوٹ لگے تو اف نہ کر، دل کو دبا کے بھول جا

عشق ہے تشنگی کا نام، توڑ دے گر ملے بھی جام
شدتِ تشنگی نہ دیکھ، لذتِ تشنگی سمجھ

عشق ہے وحدت تمام، شرک ہے عشق میں حرام
اپنی خوشی، خوشی نہ جان، اس کی خوشی، خوشی سمجھ

بنامِ دوست:

درد اٹھے اٹھا کرے، چوٹ لگے لگا کرے
کچھ بھی ہو تو بنامِ دوست ہنس کے ہنسا کے بھول جا

گزرا ہوا زمانہ:

گزرے ہوئے زمانہ کو یاد نہ کر کبھی خمارؔ
اور جو یاد آ ہی جائے اشک بہا کے بھول جا

جھوٹی تسلی:

قید رکھا ہمیں صیاد نے کہہ کہہ کے یہی!
ابھی آزاد کیا، بس ابھی آزاد کیا!

راہنما:

منزل مرا مقصود ہے یاد وری منزل یہ بات میرے راہنما بھول گئے ہیں

آج کل:

زیرِ خنجر ہے اخوت کا گلا
ماما تا دم توڑتی ہے آج کل

مانگ سونی ہے دلہن کی اِن دنوں
ماں کی گود اجڑی ہوئی ہے آج کل

ہو رہی ہیں عصمتیں نذرِ ہوس
روحِ مریم رو رہی ہے آج کل

غرور شکنی:

طوفان کے غرور جو توڑ کے رہی!
اس کشتی شکستہ کو میرا سلام ہے

درسِ مساوات:

وہی آنکھ بے بہا ہے، جو غمِ جہاں میں روئے
وہی جام جامِ جم ہے، جو بغیر فرق چھلکے

ہمدردی و غم گساری:

ڈوبا ہو جب اندھیرے میں ہمسائے کا مکان
اپنے مکاں میں شمع جلانا گناہ ہے

نسبتِ چمن:

نسبت تو چمن سے رکھتے ہیں، اربابِ چمن پر بار سہی
پھولوں کو مبارک رعنائی، ہم خار اگر ہیں خار سہی

ربطِ چمن:

نشیمن کیا، چمن سے ربط ہونا چاہیے دل کو
نشیمن کے اجڑنے سے چمن ویراں نہیں ہوتا

گلستاں:

اگر ہزار نشیمن جلے تو فکر نہ کر!
یہ فکر کر کے گلستاں پہ آنچ آنہ سکے

ربط و تعلق:

ہزار ترکِ تعلق کا اہتمام کیا
مگر جہاں وہ ملے دل نے اپنا کام کیا
بعدِ ترکِ تعلق یہ کیا ہوگیا
ربط پہلے سے بھی کچھ سوا ہوگیا
ترکِ تعلقات کو مدت ہوئی مگر
دل آج تک خمار اسی رہ گزر میں ہے

ترکِ تعلقات بھی عینِ تعلقات ہے
آگ بجھی ہوئی نہ جان آگ دبی ہوئی سمجھ

فریبِ زمانہ:

پھول بھی جو ہنستے ہیں، دل دھڑکنے لگتا ہے
کھائے ہیں فریب اتنے، اب ہنسی سے ڈرتے ہیں

حوادث:

ٹوٹ کر جب تک حوادث آشنا ہوتا نہیں
اور کچھ ہو تو ہو، دل آئینہ ہوتا نہیں

حفاظتِ دل:

حفاظت چاہیئے دل کی، حفاظت چھوڑ گلشن کی
اجڑ جاتا ہے دل، گلشن کبھی ویراں نہیں ہوتا

عقل اور دل:

عقل و دل اپنی اپنی کہیں جب خمارؔ
عقل کی سنیئے دل کا کہا مانیئے

عقل کے کاروبار میں، دل کو بھی رکھ شریکِ کار
دل کے معاملات میں، عقل کو اجنبی سمجھ

شمعِ دل:

شمعیں جو بجھیں بجھنے دے دل بجھنے نہ پائے
یہ شمع ہوئی گل تو اجالے نہ رہیں گے

اہلِ دل:

اہلِ زمانہ جس طرح ہنستے ہیں اہلِ دل پہ آج!
ہنستے تھے ہم بھی ایسے ہی، چند دنوں کی بات ہے

علم اور جہل:

حد سے بڑھے تو علم بھی ہے جہل دوستو
سب کچھ جو جانتے ہیں، وہ کچھ جانتے نہیں

نعتِ نبوی:

قیامت میں ہر شخص حیرت زدہ ہے
مرے اشک ہیں، دامنِ مصطفےٰ ہے
خمارؔ اپنے آقا، کیا منہ دکھائے
گنہگار ہے، سر جھکائے کھڑا ہے

وصلِ الٰہی:

بخش دے یارب اہلِ ہوس کو بہشت
مجھ کو کیا چاہیئے تجھ کو پانے کے بعد

لیجئے! خمارؔ کے گلشنِ شاعری سے کچھ پھول میں نے چنے، وہ آپ کے سامنے رکھ دیئے، اس گلشن کی عظمت کے لحاظ سے اسے رنگ قبول تو حاصل ہونا ہی چاہیئے، تاہم آخر میں اپنی اس خواہش کا اظہار ضرور کرنا چاہوں گا کہ خمارؔ کی شاعری کے جو مجموعے دستیاب ہیں، ان سب کے مطالعہ کے بعد ایک ایسا مجموعہ تیار کرنا چاہیئے، جس میں تکرار نہ ہو، اور ایک مجموعہ ہی میں ان کا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام سلیقے اور ایک خاص ترتیب کے ساتھ عصری کتابت وطباعت سے آراستہ، تمام ظاہری خوبیوں سے مرصع (جب کہ باطنی خوبیاں پہلے ہی سے موجود ہیں) نگاہِ شوق کی تسکین کا جملہ سامان لئے ہوئے جلوہ گر ہو، بعد مرگ خمارؔ کے چاہنے والوں پر خمارؔ کا یہ فرض بھی ہے، اور قرض بھی، خمارؔ اردو شعر وادب کی "بزمِ رفتہ" اور "عظمتِ ماضی" کے ایسے اہم اور معزز ومحترم رکن ہیں، جنہیں بھلانا، شعری اور ادبی بارگاہ میں "گناہ" ہے، بقول خمارؔ ؎

دن آج کے بھی کل نہیں رہنے کے اے خمارؔ
ماضی کی عظمتوں کو بھلانا گناہ ہے

246

چراغِ کلیمؔ

ڈاکٹر کلیم عاجزؔ کی شاعری میں "چراغ" کی تلاش

اردو شاعری کی دنیا میں جن شعراء کو بلند و بالا مقام و مرتبہ ملا ہوا ہے اور پہلی صف کے اساتذہ سخن میں جن کا شمار ہوتا ہے، ان میں ڈاکٹر کلیم عاجزؔ (پیدائش ۱۹۲۶ء، پٹنہ) بھی ہیں، "کلیم" کے لفظ نے ان کے کلام کو اونچا اٹھایا ہے اور لفظ "عاجز" نے انہیں شخصی زندگی میں جھکایا اور "خفا" (پوشیدہ، شہرت سے دور) کا خوگر بنایا ہے، اس لحاظ سے دیکھا جائے تو کلام کی رفعت اور طبیعت کی شہنشاہیت آمیز مسکینیت کا دوسرا نام "کلیم عاجزؔ" ہے،

؎ کیا قیامت ہے کہ اے عاجزؔ ہمیں اس دور میں
طبع شاہانہ ملی، منصب فقیرانہ ملا

انہیں کا دوسرا شعر ہے ؎

سامانِ زندگی جو فقیرانہ ہے تو ہو
تیور ہر ایک حال میں شاہانہ چاہئے

کلیم عاجزؔ کی شاعری کا تعارف

ہم آگے بڑھتے ہوئے اس کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ کلیم عاجزؔ

کی شاعری میں باوقار اور پُراعتماد نیا لب و لہجہ ملتا ہے۔ "طرزِ کہن" اختیار کرنے کے ساتھ "تعمیرِ نو" سے انہوں نے انحراف نہیں کیا ہے، قدیم روایات کے پہلو بہ پہلو جدید اقدار کا بھی انہوں نے پاس و لحاظ رکھا ہے، تاہم ان کی شاعری کی شہرت، عظمت اور مقبولیت کا ایک بڑا راز "اندازِ میرؔ" کو اپنانا ہے، بلاشبہ معنویت، حقیقت اور حکمت سے کلیم کا کلام لبریز ہوتا ہے، ان کی شاعری میں دل اور دماغ دونوں کو بیک وقت متوجہ کرنے کی بھرپور صلاحیت ہے، انہوں نے دردِ دل، غمِ جاناں اور آپ بیتی کے اظہار و بیان میں چند اشارات، تلمیحات اور استعارات و کنایات سے کام لیا ہے، اس نے ان کے کلام کو بامِ عروج پر پہنچایا ہے۔ ان کی شاعری "بوئے گل، در برگِ گل" کی بہترین مثال ہے۔ تاہم "آہنگِ میرؔ" نے انہیں "مجلس شاعری" میں "میر مجلس" کا جو مقام دیا ہے اس سے انکار محال ہے۔

پروفیسر جمیل مظہری کے تأثرات

مشہور شاعر و ادیب پروفیسر جمیل مظہری نے بالکل صحیح لکھا ہے:

"ان جدت طرازیوں کے باوصف کلیم عاجز کے ذوقِ سخن کا ذہنی جھکاؤ میرؔ ہی کے رنگ تغزل کی طرف، ان کی شاعری کے ہر دور میں رہا ہے اور اب تو میرؔ کے رنگِ سخن میں ایسے اشعار کہنے لگے ہیں کہ میرؔ کے دیوان میں کوئی انہیں شامل کر دے تو بڑے بڑے مدعیانِ فکر و نظر کو یقین ہو جائے کہ میرؔ کے شعر ہیں، ان اشعار کی غمناک لہجگی کو آپ کیا کہیں گے؟" ۵

میں روؤں ہوں رونا مجھے بھائے ہے — کسی کا بھلا اس میں کیا جائے ہے
کوئی دیر سے ہاتھ پھیلائے ہے — وہ نامہرباں آئے ہے جائے ہے
دل آئے ہے پھر دل میں درد آئی ہے — یونہی بات میں بات بڑھ جائی ہے
خموشی میں ہر بات بن جائے ہے — جو بولے ہے دیوانہ کہلائے ہے
پتھر کی طرح تیری ہر بات لگے ہے — دل توڑ کے ناصح تجھے کیا ہات لگے ہے
ہم نے جو دیا ہے وہ ہمیں جان رہے ہیں — سرمایۂ غم مفت کہاں ہات لگے ہے
ہاں رہیو الگ صحبتِ اربابِ خرد سے — وہ بزم ہے یہ دن بھی جہاں رات لگے ہے

موسمِ گل کی کچھ باتیں ہیں لیکن تم سے کون کہے
تم تو بس سنتے ہی عاجز دیوانے ہو جاؤ ہو

(وہ جو شاعری کا سبب ہوا، ص: ۴۱، ۴۲)

کنھیالال کپور کی رائے

کنھیالال کپور لکھتے ہیں:

"کلیم عاجز دورِ جدید کے پہلے شاعر ہیں جنہیں میر کا انداز نصیب ہوا ہے، ان کی غزلوں کے تیور نہ صرف میر کی بہترین غزلوں کی یاد دلاتے ہیں بلکہ ہمیں اس سوز و گداز سے بھی روشناس کراتے ہیں جو میر کا خاص حصہ تھا، مثال کے طور پر ان کی یہ غزل ملاحظہ فرمائیے":

بیاں جب کلیم اپنی حالت کرے ہے — غزل کیا پڑھے ہے قیامت کرے ہے
بھلا آدمی تھا، یہ نادان نکلا — سنا ہے کسی سے محبت کرے ہے
کبھی شاعری اس کو کرنی نہ آتی — اُسی بے وفا کی بدولت کرے ہے
چھری پہ چھری کھائے جائے ہے کب سے — اور اب تک جئے ہے کرامت کرے ہے
کرے ہے عداوت بھی وہ اس ادا سے — لگے ہے کہ جیسے محبّت کرے ہے

یہ فتنے جو ہر اِک طرف اٹھ رہے ہیں　　وہی بیٹھا بیٹھا شرارت کرے ہے
قبا ایک دن چاک اس کی بھی ہوگی
جنوں کب کسی کی رعایت کرے ہے

کلیم عاجز کا یہ دعویٰ تعلّی نہیں، حقیقت پر مبنی ہے :

ے　یہ طرز خاص ہے کوئی کہاں سے لائے گا
جو ہم کہیں گے، کسی سے کہا نہ جائے گا

ثبوت کے طور پر ان کے چند اور اشعار پیش کئے جاتے ہیں، جن پر میرؔ کے نشتر کا گماں ہوتا ہے :-

رکھنا ہے کہیں پاؤں تو رکھو ہو کہیں پاؤں　　چلنا ذرا آیا ہے تو اِترائے چلو ہو

ترے غم میں تماشہ بن گئے ہم　　جو دیکھے ہے ہمیں دیکھا کرے ہے

اِک درد ہے جو شام سے اٹھے ہے سحر تک　　اِک سوز ہے جو صبح سے تا شام رہے ہے

لگے ہے پھول سننے میں ہر اک شعر　　سمجھ لینے پہ انگارہ لگے ہے،

گذر رہے ہیں کچھ اس طرح دن مصیبت کے　　کسی کی جیسے شبِ انتظار گذرے ہے

بغیر اس بے وفا سے جی لگائے　　جو سچ پوچھو تو دل کس کا لگے ہے،

کبھی اُس طرف جائیو اے صبا تو　　مرا جس طرف آشیانہ پڑے ہے

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو"

(وہ جو شاعری کا سبب ہوا۔۔۔۔، صفحہ ۵۴ تا ۵۶)

کلیم عاجز اور مزاجِ میر

اندازِ میر کو اپنانے کے سلسلہ میں یہ تو دو خارجی شہادتیں ہیں جن کی توثیق داخلی طور پر خود کلیم عاجز کی اس عبارت سے ہوتی ہے :-

"مجھے میر کے اشعار سے واقفیت بھی نہ تھی، سبب کیا تھا میں نہیں کہہ سکتا، ۱۹۶۶ء میں جب پڑھانے لگا تو میر سے آشنائی پیدا کرنی پڑی اور اختر صاحب نے یہ سمجھ کر کہ مزاج میر سے مشابہ ہے، مجھے ایم۔ اے کے کلاسوں میں میر اور آتش ہی پڑھانے کو دیا، جب پڑھانے لگا اور ذکرِ میر پڑھا تو معلوم ہوا کہ ہاں سنتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا، جب معلوم ہوا تب اپنی شاعری میں ۱۹۶۸ء کے بعد میری زباں پر میر کا نام آنے لگا۔" ؎

تری محفل میں کس کی آنکھ ہے جو نم نہیں پیارے
غزل گوئی ہماری میر سے کم نہیں پیارے،

ہمیں یہ دیکھ کے کہتے ہیں آجکل والے
وہ آگئے روشِ میر کی غزل والے

غزلوں کے پردے میں بیٹھے میر تقی فرماتے ہیں
دل ٹوٹے ہے تب ہونٹوں پر گیت سہانا آئے ہے

دلّی میں بہار آئی عاجزؔ افسوس جنابِ میرؔ نہیں
جب زخم رہا مرہم نہ رہا، مرہم ہے تو زخمِ دل نہ رہا۔

میرؔ کی شاعری میں مجھے ایک ہم آواز ملا، پھر میں نے میرؔ کو پڑھا اور اس کے بعد میرؔ کی عظمت اتنی بڑھ گئی کہ غالبؔ کی عظمت کا خواب ٹوٹ گیا۔"

(جب فصلِ بہاراں آئی تھی، صفحہ : ۷۱)

انہوں نے اپنی اس بات کو اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے :۔

؎ اس قدر سوز کہاں اور کسی ساز میں ہے
کون یہ نغمہ سرا میرؔ کے انداز میں ہے

کلیم عاجزؔ اپنی اس دِل سوز شاعری کا تعارف اس طرح کراتے ہیں : ؎

میری شاعری میں نہ رقصِ جام نہ مے کی رنگ فشانیاں
وہی دکھ بھروں کی حکایتیں وہی دل جلوں کی کہانیاں

یہ جو آہ و نالہ و درد ہیں کسی بے وفا کی نشانیاں
یہی میرے دن کے رفیق ہیں یہی میری رات کی رانیاں

کبھی آنسوؤں کو سُکھا گئیں میرے سوزِ دل کی حرارتیں
کبھی دِل کی ناؤ ڈبو گئیں میرے آنسوؤں کی روانیاں

(وہ جو شاعری کا سبب ہوا ....، صفحہ ۳۱، ۳۰)

شاعری کے دو مجموعے

کلیم عاجزؔ صاحب اور ان کی شاعری کا یہ مختصر تعارف ہے، تفصیل

تو انہوں نے اپنی کتاب "جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی" (صفحات ۳۹۰) اور "ابھی سن لو مجھ سے" (صفحات ۴۲۲) میں ایک صاحب طرز ادیب کی حیثیت سے انوکھے انداز میں خوب سنائی ہے، جس کے سنانے کا یہ موقع نہیں ہے۔ ان کے "شعری نشتر" کے ساتھ "نثری نشتر" سے بھی آپ گھائل ہونا چاہتے ہیں تو ان کے اِن نثری مجموعوں کو پڑھ لیجئے، اس وقت آپ کے لئے یہ فیصلہ کرنا بھی مشکل ہوگا کہ ان کا شعری نشتر گہرا ہے یا نثری نشتر؟

یہاں اس سے اعراض کرتے ہوئے مجھے اس وقت ان تمہیدی سطروں کے بعد جو کہنا ہے وہ یہ کہ گذشتہ دنوں ان کی شاعری کے دو مجموعے زیر مطالعہ آئے، ایک کا نام ہے "جب فصلِ بہاراں آئی تھی" (۳۲۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب کو ڈاکٹر محمد صغیر الدین نے پٹنہ سے شائع کیا ہے۔ صفحہ (۵) سے صفحہ (۱۱۴) تک "ہم جو کہنا چاہتے ہیں کیا کہیں" کے عنوان سے خود کلیم عاجز صاحب کے قلم سے ایک روداد ہے جس میں رودادِ زندگی بھی ہے اور رودادِ کتاب بھی، دوسرے مجموعہ کا نام ہے "وہ جو شاعری کا سبب ہوا..." کلیم صاحب کا یہ مجموعہ ادبی اور شعری دنیا میں کافی مشہور ہے، کمیاب ہو کر نایاب ہو گیا تھا، جناب محمد سلمان صدیقی (مقیم دبئی) نے خصوصی دلچسپی لے کر اس مجموعہ کو اکتوبر ۱۹۹۶ء میں "طوبیٰ پبلیکیشنز حیدرآباد" سے نہایت خوبصورت انداز میں بڑے سائز پر شائع کیا ہے، اس کتاب کے صفحات (۴۰۰) ہیں، شروع میں ناشر کے علاوہ کلیم الدین احمد، جمیل مظہری، کنھیا لال کپور، سید علی عباس کی قیمتی تحریریں ہیں، جن سے صاحبِ کتاب کی شاعرانہ عظمت اجاگر ہوتی ہے۔ اس کتاب کے ٹائیٹل کے پشت پر "اے اہلِ ادب آؤ یہ جاگیر سنبھالو"

کے عنوان سے کلیم صاحب کے بارے میں آنجہانی رگھوپتی سہائے اور فراق گورکھپوری کی تأثراتی تحریر ہے جو بڑی ہی دل آویز اور اثر انگیز ہے، اس کتاب میں کلیم عاجز صاحب نے "ادا کیوں کر کریں گے چند آنسوؤں کا افسانہ" کے عنوان سے صفحہ ۹۷ سے صفحہ ۱۷۸ تک جو اپنی روداد حیات لکھی ہے وہ درد و غم سے بھرپور نہایت کربناک ہے، پہلی کتاب "جب فصلِ بہاراں آئی تھی" اور دوسری کتاب "وہ جو شاعری کا سبب ہوا"، دونوں کے نام ان دو شعروں سے ماخوذ ہیں:۔ ؎

جب فصلِ بہاراں آئی تھی گلشن میں انہیں ایام سے ہم
یاروں میں لٹاتے پھرتے ہیں کچھ پھول غزل کے نام سے ہم

وہ جو شاعری کا سبب ہوا وہ معاملہ بھی عجب ہوا
میں غزل سناؤں ہوں اسلئے کہ زمانہ اس کو بھلا نہ دے

مطالعاتی سفر

ان دونوں کتابوں کے مطالعہ کی راہ سے جب میں گذر رہا تھا تو اس راہ میں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے کلیم عاجز صاحب کے جلائے ہوئے "چراغ" ملتے رہے، چراغ کی اس روشنی میں میرا یہ سفرِ مطالعہ نہ صرف جاری رہا بلکہ نہایت دلچسپ اور یادگار بن گیا، چراغ تو ایک ہی نوعیت کے تھے مگر معنی و مفہوم کی روشنی جو ذہن و دماغ کے بام و در پر پڑ رہی تھی، وہ جداگانہ انداز کی حامل تھی، گویا چراغ کیا ہو، رنگ برنگ کے قمقمے ہوں، جس طرح ایک مسافر دورانِ سفر اپنی نگاہوں سے بہت ساری

چیزوں کو چنتا ہے اور تاثرات کے موتی اپنے دامن میں سمیٹتا ہے، میں بھی اپنے اس مطالعاتی سفر میں "چراغِ کلیم" کی روشنی میں ٹھہر ٹھہر کر حقیقت کے پھول چنتا اور حکمت کے موتی سمیٹتا رہا، اسی دوران یہ خیال آیا کہ ذرا پلٹ کر آئیں اور دیکھیں کہ کتنے چراغ ہیں جنہیں کلیم صاحب نے ان دونوں راہوں (مراد مذکورہ بالا دونوں کتابوں سے ہے) میں جلائے ہیں، کہیں "چراغ" ہی کے نام سے اور کہیں "شمع" کے عنوان سے، تو جملہ تعداد (۸۷) تھی نظر نے اگر چوک کی ہو تو اس سے تعداد کچھ بڑھ بھی سکتی ہے "شاعری کا سبب" اور "فصلِ بہاراں" میں چراغ کی تعداد علی الترتیب (۱۷) اور (۱۸) ہے اور انہیں دونوں کتابوں میں اسی ترتیب سے شمع کی تعداد (۲۹) اور (۲۳) ہے۔

شاعری کا موضوعاتی مطالعہ

شاعری کا لفظی یا موضوعاتی مطالعہ بھی خوب ہوتا ہے، اس لحاظ سے آیئے کلیم عاجز صاحب کے مجموعہ کلام "وہ جو شاعری کا سبب ہوا" اور "جب فصلِ بہاراں آئی تھی" میں "چراغ" اور "شمع" کا لفظی مطالعہ کریں، وہ "چراغ" اور "شمع"، جو سحر ہونے تک ہر رنگ میں جلتی ہے، جسے دوسرے شعراء نے بھی اپنے اشعار میں بکثرت استعمال کیا ہے اور ان دونوں لفظوں کی تلمیح سے غور و فکر اور معنی و مفہوم کی ایک دنیا آباد ہوئی ہے، خیال یہ تھا کہ ہر چراغی یا شمعی شعر سے پہلے چند تمہیدی سطریں لکھی جائیں تاکہ شعر سے جو درس اور پیغام مل رہا ہے اسے سمجھنے میں آسانی ہو، مگر دوسرے ہی لمحے یہ سوچ کر اس ارادہ کو ملتوی کیا کہ اس سے مضمون مزید طویل ہو جائے گا

دوسرے یہ کہ کلیم عاجز صاحب کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ سادہ الفاظ میں سادگی کے ساتھ اونچی حقیقت کو بیان کر دیتے ہیں، وہ اپنے قارئین کو الفاظ کے پیچ و خم میں الجھاتے نہیں ہیں، اس لحاظ سے ان کے اشعار بآسانی عام دسترس میں آسکتے تھے، اس لئے ایک ترتیب سے آپ اشعار پڑھتے چلے جائیں، انشاء اللہ لطف آئے گا، شعری اور ادبی ذوق کو تسکین حاصل ہوگی اور زندگی کے لئے درس اور پیغام ملے گا۔

چراغِ فکر و فن جتنے جلا سکیو، جلا رکھیو

پہلے "چراغ"، پھر "شمع" کی باری آئے گی، دیکھئے کس کس رنگ میں کلیم عاجز صاحب نے "چراغ" اور "شمع" کو روشن کیا ہے ——— "وہ جو شاعری کا سبب ہوا . . ." میں "چراغِ کلیم" یوں روشن ہے :-

○

اپنا تو کام ہے کہ جلاتے چلو چراغ
رستے میں خواہ دوست کہ دشمن کا گھر ملے

○

اندھیرے اور ہوں گے روشنی لوگ اور مانگیں گے
چراغِ فکر و فن جتنے جلا سکیو، جلا رکھیو

○

اے عشق! ہل سکیں گے نہ ہم جیسے سر پھرے
برسوں چراغ لے کے زمانہ اگر پھرے

○

وہ انجمن اب اہلِ ستم کی ہے جلوہ گاہ
روشن جہاں چراغِ وفا کر چکے ہیں ہم

○

بجھے ہوئے ہیں دلِ اہلِ انجمن کے چراغ
بس ایک شمع سرِ انجمن سے کیا ہوگا

○ تپش پتنگوں کو بخش دیں گے لہو چراغوں میں ڈھال دیں گے
ہم ان کی محفل میں رہ گئے ہیں تو ان کی محفل سنبھال دیں گے

○ مرے عزم میں ہے وہ چاندنی مرے شوق میں ہے وہ روشنی
جو نہ چشمِ راہ نما میں ہے، نہ چراغِ راہگذر میں ہے

○ مجھے فخر اپنے ستم پہ ہے کہ عصائے راہ نما بنا
مجھے ناز اپنی وفا پہ ہے کہ چراغِ راہ گذر ہوئی

○

جس پہ گرتے ہیں پروانۂ آرزو وہ چراغ ان کی محفل میں جلتا نہیں

○

چراغِ سرِ رہگذر ہم کو سمجھو نہ منزل نہ ہم انجمن جانتے ہیں

○

اب تو کوئی پوچھنے والا نہیں تھے کبھی چشم و چراغ اس گھر کے ہم

○

جلتا ہے چراغوں میں خوں تیرے شہیدوں کا ہولی کی بچی دولت دیوالی میں کام آئی

○

تم تو مصروفِ چراغاں تھے تمہیں کیا معلوم اس دیوالی میں دیے بجھ گئے کتنے گھر کے

○

شہر میں ہر در و دیوار پہ روشن ہیں چراغ میرا گھر جس میں جلا تھا وہ مہینہ ہے یہی

○

ہم اگرچہ بزم سے دور ہیں ہمیں رنگ ہیں ہمیں نور ہیں
ہم اگر نہ دیں گے لہو انہیں، وہ چراغ کیسے جلائیں گے؟

○ ہے مشورہ دوستوں کو میرا کہ کم نہ ہو گرمیٔ تمنا
چراغ خلوت ہی میں جلاؤ اگر کوئی انجمن نہیں ہے

○ عاجز ہوسِ جشنِ چراغاں نہیں ہم کو،
اک شمع ہی جل جائے سرِ شام بہت ہے

چراغ کی تو ہر اک حال میں ضرورت ہے

یہ سب چراغ "وہ جو شاعری کا سبب ہوا..." کی راہ میں جل رہے تھے، اَب ذرا دیکھئے کہ "جب فصلِ بہاراں آئی تھی" کی رہگذر میں چراغ اپنی روشنی کس طرح بکھیر رہا ہے ——— اس رہ گذر کے سارے "شعری چراغ" پر یکے بعد دیگرے آپ نگاہ ڈالتے جائیے، تاہم پہلے چراغ کے پاس آنے کے بعد اس کی روشنی میں آپ جو کچھ دیکھ سکیں گے اس کی نوعیت اس طرح ہوگی کہ آشیاں میں ہر طرح کی راحت اور آرام ہے، رنج و غم، تردد اور فکر کی کوئی بات نہیں، البتہ یہاں ایک چراغ جل رہا تھا جس کی روشنی سے پورا آشیاں اور باغ روشن تھا، لیکن اسے کیا کیجئے کہ باغ نے خود اپنی ہوا سے اس روشن چراغ کو بجھا دیا، اس کی اس روش نے باغ کو تاریکی میں گم کر دیا، جس سے اس کا خود نقصان ہوا، اور دوسری طرف "چراغ" بھی بُجھ گیا، جس سے یہ درس ملا کہ نادانی میں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہئے جس سے اپنے آپ کو بھی نقصان اٹھانا پڑے اور دوسرے کو بھی ضرر پہنچے، جب کہ دوسرا اس کے فائدے کا کام کر رہا تھا، لیجئے پہلا چراغ یہی روشنی آپ کو دے رہا ہے: ؎

نہیں رنجِ آشیاں میں کوئی رنجِ ماسوا سے یہ چراغ گُل ہوا ہے اسی باغ کی ہوا سے

پہلے چراغ کے پاس اس مختصر قیام کے بعد دوسرے سے آخر تک کے چراغ کو صرف دیکھتے ہوئے گذر جائیے :۔

○ اندھیر کر دیا ہے ہوس نے زمانے میں
روشن کرو چراغ کہ اَب شام ہو گئی

○ کہیں بھی اہلِ وفا چین پا نہیں سکتے
جہاں چراغ رہیں گے جلائے جائیں گے

○ ہم اپنے اشکوں کے اَب قمقمے نہیں دیں گے
تمہیں چراغ جلاؤ تمہاری محفل ہے

○ انہیں دشمنی ہے وفاؤں سے میری عمر گذری وفاؤں میں
میرا دل اِک ایسا چراغ ہے کہ جلا کیا ہے ہواؤں میں

○ خلوت میں روشنی ہے نہ محفل میں روشنی
اہلِ وفا چراغ وفا لے کہاں گئے

○ اسی محفل ہی پر کیا منحصر ہے کوئی محفل ہو
چراغوں میں کیا اپنا لہو ڈھالے نہیں ہیں ہم

○ ہر طاق و بام در کے لئے چاہئے چراغ
اور ہر چراغ ان کو سرِ شام چاہئے

○ لہو دے کر چراغِ درد روشن کر دیا ہم نے
بجھا دیں گر ہوائوں کو بجھا دینا ہی آتا ہے

○ بڑا کام آ گیا جلنا ہمارا چراغِ بزمِ جاناں ہو گئے ہم

○ دل و جگر کے ہیں قندیل آنسوؤں کے چراغ
تری گلی میں بڑا اہتمام ہے پیارے

○ جہاں ہم ہوں گے عاجز محفلِ شعر و غزل ہوگی
چراغ ایسا رہے تو گرمیٔ محفل کا کیا کہنا

○ تجھ سے روشن ہے چراغِ محفلِ دار و رسن
مجھ سے بھی اس دور میں زندہ ہے پروانے کا نام

○ یہ مانا کہ دل ان کا ہے اک چراغ
لہو اب کہاں ہے؟ جلائیں گے کیا؟

○ مرے درد کی حقیقت کوئی میرے دل سے پوچھے
یہ چراغ وہ ہے جس سے میرے گھر میں ہے اُجالا

○ چراغ کی تو ہر اک حال میں ضرورت ہے
کہ چاندنی تو کبھی ہے کبھی نہیں پیارے

شمع کیوں جلتی ہے سرتابقدم کیا جانو

اَب "شمع" کو" وہ جو شاعری کا سبب ہوا..." کی محفل میں ہر رنگ میں جلتے ہوئے دیکھئے :- ۵

○ کبھی جو گوشۂ خلوت میں شمع ہاتھ آئی
لپٹ کے رو لئے یارانِ انجمن کے لئے

○ کھینچی ہے بیکسی نے یہاں ایک آہ سرد
سہمی ہوئی سی شمع و ہاں انجمن میں ہے

○ جلنے دے جل رہا ہے دلِ بے زباں اگر
تو خوش تو ہے کہ شمع تیری انجمن میں ہے

○ کبھی ہم غیر ہوں کی خلوت میں آتی بڑی دھوم ہے شمع کی انجمن میں

○ اِدھر میں سناتا رہا دردِ پنہاں
اُدھر شمع روتی ہے انجمن میں

○ اسی کے دم سے تھوڑی روشنی ہے خانۂ دل میں
بجھاتے کیوں ہو شمعِ آرزو کو جھلملانے دو

○ وہ نامراد مری بے زباں وفا تو نہیں
جو بن کے شمع تری انجمن میں آئی ہے

○ ان کو اَب معلوم ہوتی ہے وفاداروں کی قدر
جل رہی ہے شمع لیکن رقصِ پروانہ نہیں

○ غبارِ کارواں سے کارواں کو ہم نے پہچانا
جہاں تھی شمعِ محفل اڑ رہی ہے خاکِ پروانہ

○ تم جہاں ہو بزم بھی ہے شمع بھی پروانہ بھی
ہم جہاں ہوتے ہیں یہ ساماں بہم ہوتا نہیں

○ رات بھر ہوتی ہیں کیا کیا انجمن آرائیاں
شمع کا کوئی شریکِ صبحِ غم ہوتا نہیں

○ بہت تعریف اُن کی، ان کی محفل کی ہوئی لیکن
نہ شمعِ بزم یاد آئی، نہ پروانوں کا نام آیا

○ رقصِ پروانے کا اے شمع! تماشا ہی سہی
نہ رہے گا یہ تماشا بھی سحر ہونے تک

○ بزم میں ہم تپشِ سوزِ وفا کوئی نہیں
شمع نے ساتھ دیا وہ بھی سحر ہونے تک

○ کس قدر کل تک رہی اہلِ وفا سے بے نیاز
آج کیوں روتی ہے شمعِ انجمن میرے لئے

○ گدازِ شمع یہاں ہے اور نہ سوزِ پروانہ
اس انجمن میں ہمارا ٹھکانا مشکل ہے

○ خلوت میں غریبوں کی اجالا نہیں دیکھا
محفل میں تو اے شمع ترا نام بہت ہے

○ شمع کیوں جلتی ہے سر تا بقدم کیا جانو
ہائے کیا چیز ہے مجبوریٔ غم کیا جانو

○ شمع و پروانہ میں کچھ سرگوشیاں ہونے لگیں
ہم جو محفل سے سنا کر اپنا افسانہ چلے

○ شمع کی طرح کھڑا سوچ رہا ہے شاعر
صبح کی بات سنائے کہ کہے شام کی بات

○ بلبل و گلِ شمع و پروانہ کو ہم پر رشک ہے
درد جو ہم کو ملا سب سے جدا گانہ ملا

○ محفل سے اُٹھ کے رونقِ محفل کہاں گئی
کھُل اے زبانِ شمع! کہ کچھ ماجرا کھُلے

○ اَب وہ کہاں اخلاص کی شمعیں اَب وہ کہاں پروانے لوگ
بیگانی بیگانی محفل، انجانے انجانے لوگ

○ اِک دھوم ہے کہ شمع ہے یوں انجمن ہے یوں
کِس شمع کی یہ بات ہے کِس انجمن کی بات

○ جو شمع سے ہے انجمن یار کی رونق
وہ شمع سرِ انجمنِ یار ہمیں ہیں

○ چھیڑے ہے کوئی تذکرۂ اہلِ وفا جب ؛ منھ پھیر کے کچھ شمع سے پروانہ کہے ہے

○ شمع و پروانہ کا جو انجام ہو
آپ کی محفل تو گرماتی رہی

○ انجمن والوں کو شمع انجمن
درد کا مفہوم سمجھاتی رہی

شمع خاموش بھی رہتے ہوئے خاموش کہاں؟

"جب فصلِ بہاراں آئی تھی" میں شمع کس طرح پگھلتی رہی ہے، یہ منظر بھی دیدنی ہے: ؎

○ وہی شمع جل رہی ہے تیری محفلِ طرب میں
جسے روشنی ملی ہے مری آتشِ وفا سے

○ ذرا دیکھوں تو کب تک شمع میرا ساتھ دیتی ہے
کہ میں بھی انجمن میں سوزِ پنہاں لے کے آیا ہوں

○ کون میرا غم گسارِ رنجِ تنہائی بنے،
شمع و گل تو آپ کی محفل کی رعنائی بنے

○ دنیا کا دستور عجب ہے
شمع جلے اور محفل دیکھے

○ ہمیں جلتے بھی ہیں خاموش پگھلتے بھی ہیں
ہمیں پروانہ ہمیں شمع ہیں اس محفل میں

○ شمع خاموش بھی رہتے ہوئے خاموش کہاں
اس طرح کہہ دیا سب کچھ کہ کہا کچھ بھی نہیں

○

○ کودنے والا پرائی آگ میں کوئی نہیں
شمع تک پروانہ ہی لے جائے پروانے کی بات

○ ہنسیں گے تم پہ تم ہو میرِ محفل
ہمیں کیا شمع و پروانہ کہیں گے

○ شمع ہی پر نہیں محفل کی کہانی موقوف،
ہم سے بھی پوچھو میاں ہم بھی زباں والے ہیں

○ شمع و گُل والا صبا والا عنادِل والا
مجھ کو ہر کام ملا ہے بڑی مشکل والا

○ شمع کو دیکھ کے پروانہ سا ہو جاتا ہوں،
میں ہوں شاید کسی اُجڑی ہوئی محفل والا

○ شمع سر دُھننے لگی میں جو غزل پڑھنے لگا
دُکھے دِل والے کو سمجھے ہے دُکھے دِل والا

○ کلیم اَب محفلِ یاراں سے اتنا ہی تعلق ہے
گئے اور شمع سے کچھ حالِ دل کہکر چلے آئے

○ آنکھ سے آنسو بن کے ڈھلے ہیں بزم میں بن کر شمع جلے ہیں
ہم ہیں واقف رازِ نہاں سے، ہم نہ کہیں تو کون کہے

○ تم نہیں جانو ہو مت جانو شہر کے رہنے والے تو
ہم کو یوں جانیں ہیں جیسے شمع کو محفل جانے ہے

○ ہم تو جلتے ہیں تم بھی جلو دوستو
شمع کے واسطے انجمن چاہیے

○

○ وہ غزل سرائی سے تھک گیا اسے بزم میں نہ بلائیے
کسی اور کلیم کو ڈھونڈھئے کوئی اور شمع جلائیے

○ وہ کسی کی انجمن ہو کوئی شمع انجمن ہو
جسے ہم لہو نہ دیں گے وہ بجھی بجھی رہے گی

○ اے شمع! میرا درد سمجھ میں تب آئے گا
جب تو بھی انجمن سے نکلوائی جائے گی

○ مل جائیں گے ہم شمع بکف راہِ وفا میں
افسانے نہیں ہیں کہ کتابوں میں ملیں گے

○ وہی انصاف کر دیں، ہم نے اہلِ ذوق کے آگے
کہانی شمع کی رکھدی اور اپنی داستاں رکھدی

○ کہی جاتی نہ ہو جو بات کھل کے
اُسے پردوں میں کہئے شمع و گل کے

○ شمع نے کس حسن کس خوبی سے سمجھا دی یہ بات
جو بہت ناداں ہے محفل میں وہی دانا بھی ہے

○

ربّانی چراغ

کلیم عاجز کے جلائے ہوئے چراغ اور روشن کی ہوئی شمع نے جو فضا اور ماحول میں روشنی بکھیری ہے، اس سے آپ نے ضرور استفادہ کیا ہوگا۔ اس سے پہلے کہ ہم اس روشن فضا اور ماحول سے نکلیں، ایک اور "چراغ" کی طرف آئیں، یہ ہے "ربّانی چراغ"، انسانی چراغ کے بعد ربانی چراغ کی روشنی بلاشبہ بصارت و بصیرت

دونوں کے لئے غیر معمولی تقویت کا باعث ہوگی اور "نورٌ علیٰ نور" (نور ہی نور) کا مصداق بھی، نیز اس مضمون کا "خیرِ ختام" (بہترین خاتمہ) بھی یہ ربّانی چراغ سورۂ نور میں روشن ہے، نہایت دِل کش اور خوبصورت انداز میں، روشنی اتنی میٹھی، صاف اور شفاف ہے کہ بس دیکھتے ہی رہ جائیے اور اپنے دل اور دماغ کے نہاں خانے کو روشن کرتے چلے جائیے، اعجازی شان رکھنے والے خدائی کلام (قرآنِ حکیم) میں نور اور چراغ کی کس قدر اونچی، بلیغ اور بے نظیر تمثیل ہے یہ :-

"اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے، اس کے نور کی مثال ایسی ہے کہ گویا ایک طاق ہے جس میں ایک چراغ ہے اور چراغ ایک (شیشے کی) قندیل میں ہے (اور) قندیل (ایسی صاف و شفاف ہے) گویا چمکتا ہوا تارہ، وہ چراغ ایک مبارک درخت (یعنی) زیتون (کے تیل) سے روشن کیا جاتا ہے، جو نہ مشرق کی طرف ہے اور نہ مغرب کی طرف، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تیل خود بخود روشن ہو جائیگا اگرچہ اس کو آگ نہ چھوئے، نور پر نور ہے، اللہ جس کو چاہتا ہے اپنے نور کی طرف ہدایت دیتا ہے، اور لوگوں (کی ہدایت) کے لئے اللہ (اس طرح) مثالیں بیان فرماتا ہے اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے" (النور : ۳۵)

اس آیت کی تفسیر میں ایک مفسّر لکھتے ہیں :-

"اللہ تعالیٰ کی ذات ہی سارے صفات اور کمالات کا سرچشمہ ہے، اس کی صفات میں سے ایک صفت "نور" بھی ہے

اسی طرح اس کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک نام پاک بھی "نور" ہے، آسمان اور زمین، اور جو کچھ ان کے اندر ہے یعنی فرشتے، سورج، چاند، ستارے غرض سب کے سب اسی نور کے پرتو سے جگمگا رہے ہیں اور ایمان والوں کو بھی اسی سے ہدایت اور روشنی ملتی ہے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نورِ الٰہی کے سب سے بڑھ کر عارف تھے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ آپؐ جب رات کی تاریکی میں بیدار ہوتے تو اللہ تعالیٰ کو "اَنْتَ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْض" کہہ کر یاد فرماتے تھے، نیز آپؐ کی دعاؤں میں سے ایک خاص دعا تھی جس میں آپؐ اپنے کان، آنکھ، دل، گوشت، خون اور مال میں اللہ تعالیٰ سے نور طلب کرکے دعا کو اس طرح ختم فرماتے تھے: "اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ نُوْرًا" (اے اللہ! ہمیں سراپا نور بنا دے)

مفسّرین نے اس تمثیل کی کئی طرح توجیہ کی ہے، ایک مناسب اور آسانی سے سمجھ میں آنے والی توجیہ یہ ہے کہ یہ اس نورِ الٰہی کی تمثیل ہے جس سے ایماندار کا دل روشن ہوتا ہے، ایمان اور اسلام کا نورِ الٰہی ہونا ذیل کی آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے:-

أَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ۔	بھلا وہ (سعادتمند) کھول دیا ہو اللہ نے جس کا سینہ اسلام کے لئے تو وہ اپنے رب کی طرف سے دیئے ہوئے نور پر ہے۔
(الزمر: ۲۲)	

تمثیل کی مختصر طور پر تشریح یہ ہے کہ اسلام قبول کرنے اور ایمان

لانے سے آدمی کو نورِ الٰہی کا جو خصوصی حصّہ ملتا ہے اس کی مثال ایسی سمجھو کہ ایماندار کا سینہ ایک طاق ہے، جس میں ستارہ کی طرح چمکدار شیشہ کی قندیل ہے یعنی دل جس میں ہدایت اور ایمان کا چراغ روشن ہے۔

اس چراغ کو معتدل اور مبارک زیتون کے درخت سے تیل مل رہا ہے جو اتنا صاف اور نظیف ہے کہ بغیر آگ بتائے ہی روشن ہوا چاہتا ہے، یعنی ایمان دار آدمی کے سینہ میں قلبِ سلیم تھا جس میں ایمان قبول کرنے کی صلاحیت پوری پوری موجود تھی، جوں ہی وحیِ الٰہی یعنی قرآن مجید کی آگ نے اس کو چھوا، فوراً بھڑک اٹھا جس سے نورٌ علیٰ نور کا عالم ہوگیا"

(ترجمہ وتفسیر قاری عبدالباری، صفحہ: ۶۳۶-۶۳۵)

جہاں روشنی کی کمی ملی وہیں اک چراغ جلا دیا

لیجئے "شمع" اور "چراغ" کی روشنی نے ہمیں کہاں سے کہاں تک پہنچایا اور حکمت و دانائی کے صدہا موتی ہم نے اپنے جیب و دامن میں اس تھوڑے سے وقت میں کس قدر بھر لئے ——— رخصت ہوتے ہوئے ایک خواہش کلیم عاجز صاحب سے یہ کرتے چلیں کہ آپ نے "شمع پر شمع اور چراغ پر چراغ" خوب جلائے اور آپ کی یہ شمعِ فروزاں اور جلتے چراغ نے ہمیں ایک ایسے چراغ تک پہنچایا جو دنیا کی تمام تر شمع اور چراغ سے علیحدہ اور جداگانہ ہے، جسے بلاشبہ "نورٌ علیٰ نور" ہی کہا جاسکتا ہے۔ بس ایک شمع اور ایک چراغ اور جلائیے!۔

خلیق و ملنسار، باتمکنت اور باوقار، شریف النفس اور وضعدار

کلیم عاجز کی طرف سے خُرد انہ خواہش کی تکمیل بزرگانہ انداز میں اِس طرح ہو رہی ہے :۔

شمع :۔

زندگی کام کی بنتی نہیں بے سوزِ جگر
شمع بننے کی تمنّا ہو تو پروانہ بنے

چراغ :۔

کوئی بزم ہو کوئی انجمن یہ شعار اپنا قدیم ہے
جہاں روشنی کی کمی ملی، وہیں اِک چراغ جلا دیا

تہنیت النساء بیگم کی نعتیہ شاعری کا مجموعہ
ایک مطالعہ

راقم الحروف کے پیشِ نظر ایک کتاب ہے، جس کا نام "گلدستۂ نعت" ہے، یہ دراصل اردو کے مشہور اور نامور محقق وادیب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ (۱۹۶۲-۱۹۰۵ء) کی شریکِ حیات محترمہ تہنیت النساء بیگم (۱۹۹۶-۱۹۱۱ء) کی نعتیہ شاعری کا حسین اور دل کش مجموعہ ہے، جسے نہایت اہتمام اور ظاہری اور باطنی خوبیوں کی رعایت کے ساتھ ادارہ ادبیاتِ اردو (ایوانِ اردو پنجہ گٹہ، حیدرآباد) نے ماہِ رواں (ستمبر ۲۰۰۱ء) میں شائع کیا ہے،

اس معروف اور باوقار ادارہ کے بلند حوصلہ معتمد عمومی اور اردو کے ادیب اور شاعر پروفیسر مغنی تبسم نے کتاب کے شروع میں "دیباچہ عمومی" کے عنوان سے اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ محترمہ تہنیت النساء بیگم کا پہلا مجموعۂ نعت "ذکر و فکر" ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا، اس کے ایک سال بعد ۱۹۵۶ء میں ان کا دوسرا نعتیہ مجموعہ "صبر و شکر" طبع ہوا، تین سال بعد ۱۹۵۹ء میں ان کا تیسرا نعتیہ اور منقبتی کلام پر مشتمل مجموعہ "تسلیم و رضا" کے نام سے منظرِ عام پر آیا، گویا تہنیت کے لئے بابِ سعادت وا ہوتا رہا، توفیقِ ایزدی دستگیری کرتی

رہی، اور رحمتِ الٰہی اپنا کرشمہ دکھاتی چلی گئی کہ پانچ سال میں تین نعتیہ مجموعے نام کی ندرت، خیال کی جدّت، کلام کی بلاغت، الفاظ کی حلاوت اور جذبات کی لطافت کو اپنے اندر سموئے ..... نظر کو نور، اور دل کو سُرور بخشنے کے لئے یکے بعد دیگرے جلوہ گر ہوتے رہے۔

اس پسِ منظر میں دیکھا جائے تو زیرِ نظر کتاب کا نام "گلدستۂ نعت" خوب ہی نہیں خوب تر ہے، الہامی اور غیبی طور پر محترمہ تہنیت کا ایک شعر بھی اس نام کی طرف اشارہ کرتا ہے، جسے مرتبِ کتاب نے کتاب کے آغاز میں درج کر کے حسنِ ترتیب اور حسنِ ذوق دونوں کا ثبوت دیا ہے، شعر یہ ہے ؎

کہنا صبا مدینے میں جاکر بہ صد ادب
گلدستہ ایک نعتیہ اب لا رہے ہیں ہم

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم اور ان کی اہلیہ محترمہ تہنیت النسأ بیگم مرحومہ کا ادارہ ادبیاتِ اُردو کے ساتھ تعلق کی جو نوعیت رہی ہے، اس تناظر میں دیکھا جائے تو ادارہ ادبیاتِ اُردو نے اس کتاب کو شایانِ شان طریقہ پر شائع کر کے اپنا فرض اور قرض دونوں کو ادا کیا ہے اور ذمہ دارانِ ادارہ اپنے عمل سے اقبال کے ایک اہم پیام کے پیامی بنے ہیں کہ جس قوم کی تقدیر میں "امروز" ہے، وہ لائقِ ہنگامہ "فردا" ہے اور اس کا بھی ثبوت ملا ہے کہ اخلاف اپنے اسلاف کے نام اور کام کو ضائع اور برباد ہونے سے بچاتے ہیں، اور اسے بہرصورت زندہ اور باقی رکھتے ہیں، اس لحاظ سے ذمہ دارانِ ادارہ مستحق تبریک و تہنیت اور قابلِ مبارکباد ہیں، خدا کرے اُردو کے یہ خدمت گزار کسی تعب

اور تھکن سے آشنا ہوئے بغیر پورے عزم و حوصلے کے ساتھ اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہیں اور۔ ع

ہر نقشِ پا بلند ہو دیوار کی طرح

۳۹۲ صفحات پر پھیلی ہوئی اس کتاب میں جناب شاہ مصباح الدین شکیل کا طویل "پیش لفظ" ہے، جس میں محترمہ تہنیت بیگم مرحومہ کی زندگی کا خاکہ ہے، ان کا منتخب کلام بھی ہے، اس کے ساتھ نعت گو شاعرات کا تاریخی حیثیت سے تذکرہ بھی، اردو کے ممتاز ادیب و شعراء، مشہور اہلِ علم و قلم اور وقت کے معروف جرائد و اخبارات نے محترمہ تہنیت کی نعتیہ شاعری کو جن وقیع اور بلیغ الفاظ اور انداز میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے، ان سب کو بھی ایک سلیقہ کے ساتھ اس کتاب میں جمع کر دیا گیا ہے، اور اس کا اچھا خاصہ حصّہ ہے، اگرچہ کہ عطر، عطار کے تعارف کا چنداں محتاج نہیں ہوتا، اور بسا اوقات تعارف کا عملِ کثیر ذوقِ لطیف پر کثیف بھی ہوتا ہے، مگر گاہ "رسمِ دنیا" کو گوارا بھی کرنا پڑتا ہے۔

یہاں یہ واضح رہے کہ نعتِ نبوی ؐ کی جو طرح عہدِ نبوی ؐ میں حضرت حسان بن ثابت ؓ، حضرت عبداللہ بن رواحہ ؓ اور دیگر حضراتِ صحابہ ؓ نے ڈالی تھی، جن کی تعداد کم و بیش (۲۲) بتائی جاتی ہے، اس کے بعد بھی ہر دور اور ہر زبان میں..... اس کا تسلسل قائم ہے، اردو زبان نے بھی اپنی ابتدائی عمر سے ہی یہ سعادت حاصل کی ہے اور امیر مینائی اور فرقت کاکوروی سے لے کر مولانا ظفر علی خاں، ماہر القادری زائرِ حرم، حمید صدیقی، حفیظ جالندھری، بہزاد لکھنوی وغیرہ تک نے اس

شعری صنف میں ایک اچھی مثال قائم کی ہے، اس مثال کو محترمہ تہنیت النساء بیگم صاحبہ نے اپنی نعتیہ شاعری سے زندہ و تابندہ رکھا ہے اور اردو نعت گو شاعرات کی جو ایک طویل فہرست ملتی ہے، اس میں ان کا نام بلاشبہ ممتاز ہے، چنانچہ اردو نعت گو شاعرات کی نعتوں کے جو مجموعے چھپے ہیں، ان میں ان کی نعتوں کا انتخاب شامل ہے۔ ع

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

اس کتاب میں جملہ دو سو پانچ نعتیں ہیں، آخر میں ۳۶۹ تا ۳۸۳ "گوشہ منقبت" ہے، اس حصہ میں بعض حضرات صحابہؓ اور بزرگانِ دین کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے، عام طور پر منقبتی اشعار پر غلو کا غلبہ ہو ہی جاتا ہے، تاہم ایسے مواقع پر اصحابِ فکر و نظر، دین و دانش کی میزان میں اسے تول کر اپنے لئے راہِ اعتدال تلاش کر ہی لیتے ہیں، اگر اس طرح کے منقبتی اشعار کے لئے الگ سے چھوٹا سا کتابچہ تیار کر لیا جاتا تو بہتر ہوتا۔

امید کہ یہ کتاب حبِ رسول اور عشقِ نبویؐ کے جذبات کو پروان چڑھائے گی، مردوں اور طلباء کے حلقوں کے ساتھ عورتوں اور طالبات کے حلقوں اور نسوانی درسگاہوں میں خصوصیت کے ساتھ شوق کے ہاتھوں لی اور پڑھی جائے گی۔

"گلدستہ نعت" کے مطالعاتی سفر کو ہم آگے بڑھانا چاہتے ہیں، تو سفر کے آغاز ہی میں محترمہ تہنیت کا یہ شعر ہمیں روک دیتا ہے ؎

بہت باتیں ہیں یوں تو تہنیت دنیا میں کرنے کی
ہم اپنے شوق کی اپنی لگن کی بات کرتے ہیں

وہ اپنے شوق اور لگن کا ذکر اس طرح بھی کرتی ہیں ؎

نعت گوئی کے سوا شغل نہیں کوئی پسند
تہنیت شوق سے مصروف اسی کام میں ہے

تہنیت کی یہ خواہش بھی لائقِ تبریک و تہنیت ہے

یہی تہنیت کی خواہش، یہی تہنیت کے ارماں
یوں ہی نعت کے مضامین لکھیں ہم بدل بدل کے

تہنیت یہ بھی کہتی ہیں کہ میرے شعر میں جو مضامین رنگ رنگ ہیں، وہ دراصل آقائے مدینہ ؐ سے نسبت کا فیض ہے

شعر میں جو مضامین رنگ رنگ ہیں
ان کے ہی در کا فیض ہے جو پا رہے ہیں ہم

تہنیت کو ذکرِ نبی کا شغل ایسا محبوب ہے کہ زندگی بھر اسی میں مصروف رہنا چاہتی ہیں

آپؐ کے ذکر سے ایسی ہے محبت مجھ کو
زندگی بھر نہ ملے اس سے فراغت مجھ کو

تہنیت کی یہ توقع کس قدر حسین تر ہے ؎

نبیؐ کی مدح سرائی میں تہنیت کتنے
غلام داخلِ خلدِ بریں ہوئے ہوں گے

ان کا احساس یہ بھی ہے ؎

تہنیت نعتِ نبیؐ باعثِ توقیر بنی
ورنہ ہم اہلِ سخن میں کہیں مشہور نہیں

اسی لئے وہ کہتی ہیں ؎

تہنیت ان کی یاد سے بہتر کوئی سرمایۂ حیات نہیں

اعلیٰ مرتبت نبیؐ کے بارے میں ان کا یہ کتنا اعلیٰ خیال ہے ؎

ذکر دارا و سکندر چھوڑ کر
دین کے سردار کی باتیں کریں

تہنیتؔ دل چاہتا ہے ہر گھڑی
سیدِ ابرار کی باتیں کریں

وہ اپنا حال اس طرح بھی بیان کرتی ہیں ؎

یا نبیؐ بہرِ خدا ہم پہ کرم کی ہو نظر
یاد سے غافل تمہاری کوئی لحظہ ہم نہیں۔

تہنیتؔ کو زندگی کا مزا نبی کی الفت میں ملتا ہے، وہ کہتی ہیں ؎

شعر میں جب نہ ہو تڑپ دل کی
لطف ہم کو ذرا نہیں ملتا۔

تہنیتؔ الفتِ نبیؐ کے بغیر
زندگی کا مزا نہیں ملتا!

کیا ذوق و شوق اور کیا الفت و محبت ہے، ذرا دیکھئے ؎

ذکرِ مدینہ کرتے ہیں ہر دم جو تہنیتؔ۔
خود بھی تڑپ کے اوروں کو تڑپا رہے ہیں ہم

مدینہ سے دوری اور اس کی مجبوری تہنیتؔ کو منظور نہیں، ان کا اضطراب بھی قابلِ دید ہے ؎

بلواؤ تہنیتؔ کو دکھلاؤ پھر مدینہ
اس طرح دور جینا اس کو نہیں گوارا

وہ یہ بھی کہتی ہیں ؎

تہنیت پھر مدینہ یاد آیا
دلِ ناشاد ہوا ہے شاد

کیسا دَرد اور کیسا تعلق خاطر ہے ؎

وابستہ ہو چکے ہیں اسی آستاں سے ہم
واپس خدا کرے کہ نہ آئیں وہاں سے ہم

سمجھیں گے پھر نہ ہم غریب الدّیار ہیں!
پہونچیں گے گر مدینے کو ہندوستاں سے ہم

تہنیت کی یہ نکتہ آفرینی بھی خوب ہے ؎

ہونٹ ہِل جاتے ہیں جب نامِ نبیؐ لیتے ہیں
یہ حلاوت یہ کشش فقط ان کے نام میں ہے

گلدستۂ نعت کے یہ چند اشعار جن سے محترمہ تہنیت النساء بیگم کے اندرونی جذبات اور دل کی کیفیات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اور یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ وہ نبیؐ اور دیارِ نبی سے کس والہانہ انداز میں محبت رکھتی ہیں، مطالعہ کے دوران مجھے محسوس ہوا کہ ان کا پورا نعتیہ کلام کیف و سوز سے لبریز ہے، زبان نہایت شیریں اور میٹھی ہے، بیان میں برجستگی، شستگی، شگفتگی اور شائستگی ہے، مضامین کا تسلسل سیلِ رواں کی طرح جاری ہے، ترنم اور نغمگی کی وہ کیفیت ہے کہ جیسے ہوا کے جھونکوں سے درخت کی شاخیں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہی ہوں، وادیِ کہسار میں آبشار سے پانی چٹانوں کے سینوں کو چیرتے ہوئے کیف و مستی میں سامعہ نواز صداؤں کے ساتھ بہا چلا جا رہا ہو، شاعرہ کا دل ٹوٹا ہوا ہے، اور ہر ٹوٹے دل کی آواز میں فطری طور پر تاثیر ہوتی ہے، یہ تاثیر

اس نعتیہ کلام کے مجموعہ میں علانیہ طور پر محسوس ہوتی ہے، گویا "از دلِ خیزد بر دل ریزد" (دل سے جو بات نکلتی ہے، اثر رکھتی ہے) کی تعبیر مل رہی ہے ؎

ہر شعر میرا تہنیت نالۂ دل ہے
اس سے مجھے منظور کوئی نام نہیں ہے

ایک دوسرا شعر ہے ؎

ذکرِ نبی میں ہم جو تڑپتے ہیں تہنیت!
کیوں کر نہ وجد آئے ہمارے بیان پر

نعت کا یہ گلدستہ جن گلوں کو چن کر بنایا گیا ہے، اس گلستاں کی نہ دیوار بلند ہے اور نہ شاخِ گل ہی اونچی ہے، تھوڑی ہمت سے کام لیجئے اور گلچیں کے چنے ہوئے گل سے جیب و دامن کو بھر لیجئے۔

محترمہ تہنیت بزمِ امکاں کی بے مثال ہستی کی خدمت میں اپنا نذرانۂ عقیدت اس طرح پیش کرتی ہیں ؎

محمد مصطفےٰ کا نام ہم لیتے ہیں عنواں ہیں
عجب ہستی بنائی حق نے ان کی بزمِ امکاں میں

سادہ زبان میں حقیقت بیانی کا انداز دیکھئے، شاید شاعری کی دنیا میں اسی کو "سہلِ ممتنع" کہتے ہیں ؎

محمدؐ سا کوئی نہیں بحر و بر میں
خدا کی خدائی ہے ساری نظر میں

وہ انسان کامل ہیں خیر البشر ہیں
نہیں دوسرا کوئی جن و بشر ہیں

وہ سب کے لئے رہنما بن کے آئے
نہیں ان سا ہم دم رہِ پُرخطر میں

وہ دنیا میں پیغامِ حق لانے والے
حبیبِ خدا جگ میں کہلانے والے

تہنیت کہتی ہیں کہ آپؐ سراپا رحمتِ دنیا ہیں، اور آپؐ نے رازِ ہستی کو بے نقاب کیا ہے

رازِ ہستی بے نقاب اس طرح دنیا پر کیا
وہ سراپا رحمتِ دنیا نظر آنے لگے

نوعِ انساں کو دکھائی راہِ عرفاں اس طرح
رازہائے عالمِ بالا نظر آنے لگے

انساں کو جس نے واقفِ انسانیت کیا
احسان کر گیا ہے جو سارے جہان پر

محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے صنفِ نسواں کو قعرِ مذلت سے نکالا ہے

نکالا قعرِ مذلت سے صنفِ نسواں کو
کوئی تو عزتِ عورت کا پاسباں ہوتا

صنفِ نسواں کو بخشی نئی آب رو!
بخت بگڑے تھے اس کے مگر بن گئے

آپؐ نے غلام کا اعتبار بڑھایا ہے

دی غلاموں کو دنیا میں وہ حیثیت
تھے جو ذلت میں وہ معتبر بن گئے

تہنیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیع تر پیام انسانیت کو سامنے رکھتے

ہوئے یہ پیام دیتی ہیں ؎

مختلف رنگ و نسل و وطن کے بشر
جو بھی واں آئے شیر و شکر بن گئے

رنگ و نسل کی تفریق نہیں دین میں کچھ
یاں کوئی فرق نہ خوش رو نہ سیہ فام میں ہے

اختصار کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بغیر کسی ترتیب اور تمہید کے چند اشعار "گلدستۂ نعت" سے پیش ہیں ؎

سرمایہ کچھ عقبیٰ کے لئے بھی ضروری ہے
انسان کے لئے بس غمِ دنیا تو نہیں ہے

انسان ہے وہی وقت پہ دونوں سے جو لے کام
تدبیر و عمل اور ہے، اور صبر و رضا اور

ہم قصۂ تسلیم و رضا کس کو سنائیں
دل والے ہیں کم، عقل کے معذور بہت ہیں

لازم ہے صبر و شکر بہ ہر حال دوستو
ان کی نوازشوں کا تصور محال ہے۔

نیکی و بدی دونوں پہ قابو ہے بشر کو
پر اس کی جزا اور ہے، اس کی سزا اور

تہنیت دین کے آگے غمِ دنیا کیا ہے ؟
نہ دیا ساتھ کسی کا اس ہرجائی نے

تمہیں نے دہر میں انسان کو جینے کا ہنر بخشا
دکھائی جس نے راہِ حریت وہ راہنما تم ہو

اٹھائی عمر بھر جن سے اذیت ان کے حق میں بھی
جو دیکھا تو یہی دیکھا کہ مصروفِ دعا تم ہو۔

تمہارے حلم و صبر و ضبط کی تعریف ہو کیوں کر
فرشتوں کو ہو جس پر رشک وہ خیر الوریٰ تم ہو

گزرے اسی طرح سے یہ زندگی ہماری
آئیں مدینہ سے ہم اور پھر مدینہ جائیں

آپ کی چشمِ التفات
اپنی متاعِ کائنات

آپ کی رہ میں ہو نثار
بس یہی مقصدِ حیات

دعا کرتے ہیں اس میں امن و خوشحالی رہے قائم
حرم میں جب کوئی ملکِ دکن کی بات کرتے ہیں

دین و ایمان جو سلامت رہے ہیں بس کافی ہے
حشمت و ثروتِ دنیا ہمیں منظور نہیں

کفر و عصیاں میں جو تھے بھٹکتے ہوئے
ان کے ہی فیض سے راہ بر بن گئے

بن کے آئے تھے رحم و کرم سر بہ سر
وہ سبھی کے لئے چارہ گر بن گئے۔

دل ہے کہ ہو غمِ انساں سے مضطرب
وہ فیض ہی نہیں ہے نہ ہو جو کہ فیضِ عام

احکامِ خدا جو بھول گیا جو راہِ نبیؐ سے ہٹ کے چلا
انسان کی حقیقت کیا سمجھے وہ اور مسلمان کیا ہوگا۔

جو دکھ میں کسی کا ساتھ نہ دے جو اپنی غرض کا بندہ ہو
وہ شیخ برہمن تو ہوگا لیکن کوئی انسان کیا ہوگا

ان کی ہر بات، ان کی ہر حرکت
راہِ حق کا پیام ہو جائے
پیروی ان کی آدمی کے لئے
زندگی کا نظام ہو جائے

ہمیں ناز اپنے پہ ہے بجا کہ ہمارے ہیں وہی رہنما!
وہی ٹھیک سب میں ہے راستہ کہ جو وہ جہاں میں دکھا گئے

انسان کامیاب وہی ہے جسے سدا
دنیا سے بڑھ کے دین کی ہو آب رو پسند

مزدور اور غریب کے ہر دم رہا قریب
رکھتا تھا جو کرم کی نظر ہر کسان پر
مخلوق کے لئے کرے خالق سے التجا
ایسا زمین پر نہ کوئی آسمان پر

جو قوم اس کا درسِ حقیقت سمجھ گئی
پاتی ہے فتح ہر گھڑی وہم اور گمان پر

وہ محبوبِ خدا یوں رہنمائے دین و دنیا ہیں
نظر ان کی بنا دیتی ہے دیوانے کو فرزانہ

انسان نہیں جس میں نہ الفت ہے نہ سہارا ہے
مومن ہے اگر صاحبِ تسلیم و رضا ہے۔
انسان نہیں جس میں نہ ہو خلق و مروت
مومن ہے اگر وقف رہِ خلقِ خدا ہے

انسان کو بنانی ہے حقیقت میں جو انسان
وہ پیروی اسوۂ محبوبِ خدا ہے
جو رہ پہ چلا اس کی، ہوا مسلم و مومن
گھاٹے میں ہے وہ جس کی روش اس سے سوا ہے

نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا سہارا سب کو ہے، تہنیت کا یہ ایمان و اعتقاد دیکھئے ؎

بھروسا ہے شفاعت کا ان ہی کی سب کو محشر میں
نہ ہوتے وہ تو ہم جیسے خدا جانے کہاں جاتے
بچالو تہنیت کو روزِ محشر شرم ساری سے
اسے ہے ناز اس کا شافعِ روزِ جزا تم ہو

کالی کملی میں وہ چھپالیں گے
پرسشِ حشر کیا ڈراتی ہے

اس وقت پوری دنیا کی جو صورتِ حال ہے، اس میں تہنیت کی نعتیہ شاعری زخمی دل کے لئے مرہم اور بے چین دل کے لئے سکون کا سامان بھی بہم پہونچاتی ہے، ذرا دیکھئے ؎

ہم ہند کے مسلم صبح و مسا کہتے ہیں بہ صد امید و رجا!
سنتے ہیں کہ تم قوموں کی سدا قسمت کو سنوارا کرتے ہیں

ہے آج ہر اک ایمان دشمن، کب تک یہ سہیں ہم رنج و محن
تم ہم کو سنبھالو شاہِ زمن، ہم تم پہ سہارا کرتے ہیں

وہ نہایت عزم و حوصلہ اور مؤمنانہ شان کے ساتھ یہ بھی کہتی ہیں ؎

یہ دَور ابتلا ہے، امتحاں ہے اس میں انساں کا
مصیبت میں بھی اے ہم دم نہ چھوٹے ساتھ ایماں کا

تم اپنے دورِ حاضر سے نہ گھبراؤ مسلمانو
بہار آنے کو ہے اب رنگ بدلے گا گلستاں کا

زمانے کے حوادث کی کبھی پرواہ نہیں کرتے
دلوں پر نقش ہے جن کے ہمیشہ درسِ قرآں کا

محترمہ تہنیت النساء بیگم کی نعتیہ شاعری کے مجموعے "گلدستۂ نعت" کا مطالعہ میں نے اپنی سعادت سمجھ کر کیا، میرے اس مطالعہ نے مجھے جس نتیجہ تک پہونچایا، اس کا ایک اجمالی خاکہ اوپر بیان کر دیا، امید کہ اہلِ دین و ادب اور اصحابِ شعر و سخن اپنے اپنے انداز میں اس نئی کتاب کا مطالعہ جاری رکھیں گے، اور اس پر تبصرہ و تجزیہ کا سلسلہ بھی جاری رہے گا، علم اسی طرح توانائی پاتا ہے، اور فن کو اسی راہ سے عروج حاصل ہے تاہم میں اپنے اس مطالعہ کو "گلدستۂ نعت" میں درج ایک "نعتیہ شہہ پارہ" پر ختم کرتا ہوں، جس میں شاعرہ نے نہایت آسان اور سادہ زبان میں ایک خاص کیف و سوز کے عالم میں وہ باتیں کہی ہیں، جو ہر مومن کے قلب کی صدا اور ہر روح کی آواز ہے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے، آیئے اور محترمہ تہنیت کے اس پاکیزہ نغمہ کو حرزِ جاں بنایئے، اور زیرِ لب گنگنا کر سکون و قرار حاصل کیجئے۔

دل محمدؐ سے لگانا چاہیئے
اپنی قسمت آزمانا چاہیئے

کوئی اور آنکھوں میں جچتا ہی نہیں
سر اسی در پر جھکانا چاہیئے

آرزو اک دل میں باقی ہے یہی
جا کے طیبہ پھر نہ آنا چاہیئے

ساقیِ کوثر کے فضل و لطف سے
تشنگی اپنا بجھانا چاہیئے

تہنیتؔ چل کر مدینہ ہی میں سب
حالِ دل اپنا سنانا چاہیئے

اس وجد آفریں اور ولولہ انگیز نعت کے بعد تہنیتؔ ہی کے اس معنی خیز اور مسرت انگیز شعر کو "خیر ختام" بنانا بہر طور مناسب ہوگا۔ ؎

دل شاد رہے تہنیتؔ اِس طرح ہمیشہ
ہو وردِ زباں صلِّ علیٰ، صلِّ علیٰ اور

جدّوجہدِ آزادی میں قلم کا کردار

آج ہمارا ملک "ہندوستان" آزاد ہے، اپنی اس آزادی کی نعمت سے پہلے ایک طویل عرصہ تک انگریزوں کی غلامی کی لعنت میں گرفتار رہا ہے، غلامی خواہ ذہن و فکر کی ہو یا جسم و جان کی، انسان کے لئے گوارا نہیں ہے، وہ اپنی فطرت اور طبیعت کے اعتبار سے آزادی چاہتا ہے، آزادی، مکمل آزادی۔ صدیوں کی تاریخ رکھنے والی قوم کی گردن میں جب انگریزوں نے اپنی "عیاری" سے غلامی کا پھندا ڈالنا چاہا تو پہلے یہ قوم اپنی "سادگی" میں اس "عیاری" کو سمجھ نہ سکی، جب پھندا ڈال دیا گیا اور بتدریج اس کے حلقہ کو تنگ کیا جانے لگا تو قوم چیخی، چلائی، گرجی برسی، ظالم حاکم ٹس سے مس نہ ہوا، اور ٹس سے مس کیا ہوتا، اس کے برعکس اس نے چیخنے، چلانے، گرجنے، برسنے والوں کے پھندے کو مزید تنگ کرنا شروع کر دیا، اب کیا تھا، ڈنڈے تھے، ہتھکڑیاں تھیں، بیڑیاں تھیں، جیل کی کوٹھڑیاں تھیں، تاریک کنویں تھے، دل دہلا دینے والی اذیت ناکیاں تھیں، کالا پانی کی جلا وطنی تھی، مالٹا کی اسارت تھی، بندوق کی گولیاں تھیں، پھانسی کے تختے تھے، اجتماعی قتل تھا، عورت کا سہاگ لٹ رہا تھا، بچے یتیم ہو رہے تھے، جوانی خاک و خون

میں تڑپ رہی تھی، بوڑھوں کی آنکھیں بے نور تھیں، علماء جامِ شہادت پی کر جامِ کوثر پینے کی مشق کر رہے تھے اور ان کی زبان یہ کہتے ہوئے لطف لے رہی تھی :-

"تم مجھ کو اور میرے ساتھیوں کو روزانہ پھانسی دے سکتے ہو، مگر یاد رکھو کہ ہمارے خون کی چھینٹوں سے ہزاروں آزادی کے متوالوں کے بدن میں ایسی گرمی آئے گی کہ اس گرمی سے تم اور تمہاری حکومت پگھل کر رہ جائے گی"

(مولانا پیر علی)

گویا زمانہ کی کسی "ترشی" نے آزادی کے متوالوں کے "نشۂ آزادی" کو نہیں اتارا، مگر یہ نشہ کیسے چڑھا اور کس نے چڑھایا؟ ممکن ہے جواب میں ہزارہا باتیں سامنے آئیں، لیکن مختصر یہ کہ سارا کرشمہ "زبان" اور "قلم" کا تھا، ایک طرف زبان یہ آگ برسا رہی تھی :-

"اگر بیورو کریسی کے نزدیک آزادی اور حق طلبی کی جدوجہد جرم ہو اور وہ ان لوگوں کو سخت سزاؤں کا مستحق قرار دے جو انصاف کے نام سے اس کی غیر منصفانہ ہستی کے خلاف جنگ کر رہے ہیں تو میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نہ صرف اس کا مجرم ہوں، بلکہ ان لوگوں میں ہوں جنہوں نے اس جرم کی اپنی قوم کے دلوں میں تخم ریزی کی ہے اور اس کی آبیاری کے لئے اپنی پوری زندگی وقف کر دی ہے"

(مولانا آزاد)

دوسری طرف قلم یہ بجلی گرا رہا تھا :-

"ہم نے اول دن سے یہ اعلان کیا ہے کہ موجودہ جدوجہد کی

آخری منزل قید خانہ ہے، اس جنگ کی فتح و شکست کا فیصلہ میدانوں میں نہ ہوگا، قید خانے کی کوٹھریوں میں ہوگا، ہم نے اس لئے "سول ڈیس او بیڈینس" یعنی سول نافرمانی کو بھی پروگرام میں داخل کیا۔ کیوں کہ قید خانے کی سب سے زیادہ سہل اور سیدھی راہ یہی ہے، پھر کیا واقعی قید و بند کا پیام آگیا ہے؟"

(مولانا آزاد)

اور یہ بھی کہ ؎

ہلا دے جور و استبداد کی سنگین بنیادیں
غلامی کے بتوں کو گرزِ حرّیت سے غارت کر
غلامی مستقل لعنت ہے اور توہینِ انساں ہے
غلامی سے رِہا ہو اور آزادوں میں شرکت کر

(ساغر نظامی)

ہندوستان کی تاریخِ آزادی پر اگر نظر ڈالی جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ آخری دور کی جدوجہد میں زبان اور قلم کا جوش سمندر کی موجوں کی طرح ٹھاٹیں نہ مارتا تو آزادی کی منزل اس قدر قریب نہیں آتی، اس دور میں زبان اور قلم دونوں نے اپنا حصہ اور کردار بھرپور طریقہ پر ادا کیا ہے، بلاشبہ اس میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے فتویٰ، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی بصیرت، مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی عالمیت، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے اخلاص اور جذبۂ دروں، مولانا مفتی کفایت اللہؒ کی فقہی بصیرت، مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی ژرف نگاہی، مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کی دینی ذکاوت،

مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے جوشِ جنوں، راجہ مہندر پرتاپ کی حبّ الوطنی، سبھاش چندر بوس کی سرفروشانہ مہم، جواہر لال نہرو کی دردمندی، گاندھی جی کی بالغ نظری اور اس طرح کے بہت سارے مسلم، ہندو اور دیگر محبانِ وطن کی مختلف جہتوں سے جو کوششیں رہی ہیں، ان کی اپنی جگہ بڑی اہمیت ہے، لیکن گھر سے میدان میں اور خواص سے عوام میں اس "جنگ" کی آگ کو جس نے بھڑکایا ہے، وہ یہی اہل زبان اور اصحابِ قلم ہیں، جنہیں لوگ خطیب و مقرر اور شاعر و صحافی کی حیثیت سے جانتے پہچانتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت بھی دیکھئے کہ وقت کی ضرورت اور نزاکت کے لحاظ سے اس زمانہ میں ایسے خطیب اور اہلِ تحریر کو پیدا فرمایا، جن کی خطابت اور تحریر پر خود فنِ خطابت اور فنِ تحریر کو ناز ہے، تاہم بنیادی طور پر اور ہر شعبۂ حیات کے ذمہ داروں تک کمک اور غذا پہنچانے کی حیثیت سے "تحریر" (وسیع تناظر میں) کو جو اہمیت حاصل ہے، اس پر نظر ہر صاحبِ نظر کی ہوگی، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب کا آغاز پڑھنے لکھنے اور علم و قلم سے فرمایا، مستقل ایک سورت نازل کی، جس کا نام ہی "القلم" ہے، قلم کی یہی وہ عظمت و حیثیت ہے کہ اس کی قوت ہر دور میں ایک تسلیم شدہ حقیقت رہی ہے اور بڑے سے بڑے ظالم حاکم اور جابر حکومت کو "قلم" کے سامنے جھکنا پڑا، بقول شورش کاشمیری ؎

کانپتے ہیں اس کی ہیبت سے سلاطینِ زمن
دبدبہ فرماں رواؤں پر بٹھاتا ہے قلم
برق بن کر ٹوٹتا ہے خرمنِ اغیار پر
دوستوں کے نام کا ڈنکا بجاتا ہے قلم

صفحۂ کاغذ پہ جب موتی لٹاتا ہے قلم
ندرتِ افکار کے جوہر دکھاتا ہے قلم
قطع کرنی پڑتی ہیں فکر و نظر کی وادیاں
تب کہیں شورشؔ مرے قابو میں آتا ہے قلم

شورشؔ یہ بھی کہتے ہیں ؎

تیز ہو جاتے ہیں یارانِ سخن کے ولولے — جب کبھی زورِ جنوں سے پھڑپھڑاتا ہے قلم
ہر روش پر اس کے آثار و مظاہر رونما — ہر زمانہ کے خداؤں کو جھکاتا ہے قلم
کوئی سی شئی ہی نہیں میر و وزیر و تخت و تاج — ان کے جبر و جور کی ہیبت مٹاتا ہے قلم
اہلِ تسلیم و رضا کو ماسوا سے کاٹ کر — خوفِ اِک اللہ کا دل پہ بٹھاتا ہے قلم
چاک ہوتا ہے جگر شمشیر جوہر دار کا — موج میں جب لولوئے لالہ لٹاتا ہے قلم

قلم کے بارے میں یہ خیالات کوئی "تعلّی" نہیں ہے بلکہ حقیقت کا اظہار ہے، ہندوستان کی تاریخ جدوجہد آزادی میں یہ حقیقت ہمیں بہت نمایاں نظر آتی ہے، یہی وہ قلم ہے جس نے حضرت سید احمد شہیدؒ سے یہ خط لکھایا کہ "وہ غیر جن کا وطن بہت دور ہے، بادشاہ بن گئے، جو تاجر سامان بیچ رہے تھے، انہوں نے سلطنت قائم کر لی، میرا عزم ہے کہ میں مجاہدین کو لے کر ہندوستان کی طرف متوجہ ہوں گا، میرا اصل مقصود ہندوستان پر جہاد ہے" حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنے قلم سے الگ الگ وقت میں جو دو فتوے لکھے، اس کا حاصل یہی تھا کہ "انگریزی حکومت سے جہاد فرض ہو چکا ہے"، قلم ہی نے مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ اور شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ سے انگریزی دورِ حکومت میں ہندوستان کے "دار الحرب" ہونے کا فتویٰ دلایا تھا، یہ قلم جب مولانا مفتی کفایت اللہؒ اور

مولانا ابو المحاسن سجادؒ کے ہاتھ میں پہنچتا ہے تو اس طرح بولنے لگتا ہے کہ "بدیسی سامان کا بائیکاٹ کرنا چاہیئے"، مولانا انور شاہ کشمیریؒ اپنے قلم سے وطن کی محبت کا راز سمجھاتے ہیں، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ اپنے قلم کے سہارے مسلمانوں کو یہ بتاتے ہیں کہ "موجودہ غلامی سے آزاد ہونا اور اس کے لئے انتہائی جدوجہد عمل میں لانا تمام باشندگانِ ہند سے ہم پر زیادہ لازم اور ضروری ہے"۔ ریشمی رومال کی تحریک میں بھی قلم کا کارنامہ نمایاں ہے، قلم ہی ہے جس نے ۱۶ ستمبر ۱۹۳۹ء کو جمعیۃ علماء ہند کی ورکنگ کمیٹی سے یہ فیصلہ لکھایا کہ :-

> "جمعیۃ علماءِ ہند کا نصب العین ہمیشہ سے مکمل آزادی رہا ہے، اور وہ اس کو پانا شرعی، سیاسی اور اخلاقی حق سمجھتی ہے، اور کوئی چیز جو اس حق کے راستہ میں مزاحم ہو، اس کے نزدیک قابلِ برداشت نہیں، اس لئے ہم کسی نقطۂ نگاہ سے بہ حالتِ موجودہ جنگ میں امپریلزم کی امداد کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں پاتے ہیں، ہم ساری جماعتوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ خود بھی یہی فیصلہ کریں کہ اسی فیصلہ پر ان کی نجات اور آزادی کا حقیقی مدار ہے"۔

جدوجہد آزادی کے زمانہ میں قلم کی بوقلمونیاں اخبارات اور رسائل و جرائد میں بھی خوب ظاہر ہوئی ہیں، خصوصیت کے ساتھ اردو اخبار نویسوں اور صحافیوں نے صحافت کے محاذ پر اس قدر زبردست کام کیا ہے کہ اس کا ذکر کئے بغیر ہندوستان کی تاریخ آزادی مکمل ہی نہیں ہوسکتی، مولانا برکت اللہ بھوپالیؒ وہ قلمی مجاہد ہیں جنہوں نے ہندوستان سے باہر

رہتے ہوئے امریکہ، فرانس، جرمنی، جاپان یہاں تک کہ انگلستان میں صحافت کے ذریعہ اپنے قلمی جہاد کو جاری رکھا، وہ لوگ جو اس موضوع سے دل چسپی رکھتے ہیں، ان کے لئے "جامِ جہاں نما، دہلی کا اُردو اخبار رہبرِ ہند، مشیرِ دکن اور اعظم الاخبار" سے لے کر "پیسہ، ہمدرد، زمیندار، انقلاب (سالک، مہر) اور الہلال" تک کے اخبارات کی تاریخ کا مطالعہ بہت ساری معلومات میں اضافہ کا باعث ہوگا، اس مطالعہ سے آپ پر یہ بھی واضح ہوگا کہ مطبوعہ صحافت کے ساتھ قلمی صحافت بھی جاری تھی، صرف دہلی سے ہر روز ایک سو بیس قلمی اخبار باہر بھیجے جاتے تھے، لارڈ میکالے نے ۱۸۳۶ء میں صحافت پر جو یادداشت مرتب کی، اس میں اس خیال کا اظہار کیا کہ عوام میں مطبوعہ صحافت کا اثر اتنا نہیں ہے جتنا قلمی صحافت کا ہے، سرجان میکلم کا بیان ہے کہ ۱۸۵۷ء میں جو کچھ ہوا وہ تمام تر قلمی اخبارات کی تحریک و تاثر کا نتیجہ تھا، اسی طرح مطالعہ میں یہ بات بھی سامنے آئے گی کہ برق بے چارے اردو اخبار نویسوں ہی پر گرتی تھی، چنانچہ "دہلی اردو اخبار" کے ایڈیٹر مولانا محمد باقر کو اس الزام میں گولی سے اڑا دیا کہ وہ دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر کے قتل کی سازش میں شریک تھے، ان کے فرزند مولانا محمد حسین آزاد اس اخبار کے پرنٹر اور پبلشر تھے، ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوگئے تو پا پیادہ لکھنؤ بھاگ کر جان بچائی، "صادق الاخبار" کے ایڈیٹر کو تین سال قید میں رکھا گیا، اسی پسِ منظر میں شورش کاشمیری نے لکھا ہے:

"یہ حقیقت ہے کہ انگریزی ہندوستان میں تحریکِ آزادی کے دوران اردو اخبار بھی مختلف اوقات میں حکومت کے زیرِ

عتاب رہے اور امتحان و ابتلاء کے شدائد سے گذرے، جتنی نظمیں بحق سرکار ضبط ہوئیں وہ نوے فیصد اردو میں تھیں اور قید ہونے والے شاعروں میں بھی نوے فیصد اردو شاعر تھے، ہندوستان کے بڑے بڑے مقرر اُردو ہی کے مقرر تھے، جن ادبی مؤرخوں نے ادب کے مختلف دور قائم کئے، وہ اگر ہر دور کے سرفہرست مصنفین و مؤلفین کی تحقیقات و تالیفات کی مجموعی اشاعت کا حساب کریں تو ان کی تعداد الہلال، کامریڈ، زمیندار اور ہمدرد کے ایک شمارے کی اشاعت سے بھی کم ہوگی، حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے معاشرے اور ہندوستان کے سماج کو اتنا کتابوں نے بیدار نہیں کیا جتنا اخباروں نے جگایا اور ان پر سحر کیا، زمیندار، کامریڈ اور الہلال تاریخ ساز ہی نہیں، خود تاریخ تھے اور یہ خصوصیت کسی دوسرے جریدے یا مجلّے کو حاصل نہیں ہوئی اور نہ کسی نے سیادت و سیاست میں اتنے منظم برگ و بار پیدا کئے، جواہر لال نہرو نے اعتراف کیا تھا کہ ہندوستان میں قومی آزادی کی تحریک کو پھیلانے اور چلانے میں اردو کا سب سے بڑا حصّہ ہے"

(ابوالکلام آزاد، صفحہ ۴۱۲)

اردو صحافی کی حیثیت سے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں، مولانا حسرت موہانی، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا غلام رسول مہر، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اور قاضی عبدالغفار کا قلم ہمیشہ تازہ اور جواں رہا اور کبھی تعب اور تھکن سے آشنا نہیں ہوا، مگر سچی بات تو یہی ہے کہ امام القلم، امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد ہیں

شورش کاشمیری مرحوم کا یہ تبصرہ مجھے حق بجانب معلوم ہوتا ہے کہ :

" سرسید کی عبارت کی ناہمواری اور پھیکے پن کو حالی نے اپنی سادگی اور پُرکاری سے دور کیا، محمد حسین آزاد نے اس کو رنگینی اور دل کشی عطا کی، ڈپٹی نذیر احمد نے برجستگی اور صاف گوئی دی، شبلی نے متانت، ثقاہت اور لطافت بخشی، لیکن اُردو کے اسلوب بیان میں شوکت وحشمت اور عظمت وجلال کی جو کمی تھی، اس کو مولانا آزاد نے الہلال کے ذریعہ پورا کیا، الہلال ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہبی دینی اور سیاسی زندگی کا ایک اہم موڑ تھا، مولانا نے الہلال کی معرفت مسلمانوں کی دینی حمیّت، ملی غیرت اور قومی بصیرت کا مینار تیار کیا پھر اس کی بلندی پر چڑھ کے ملکی سیاست اور وطن آزادی کا صور پھونکا، جس نے انگریزوں کے تعمیر کردہ طلائی قصر کی بنیاد ہلادی "۔ (ابوالکلام آزاد، صفحہ ۴۱۴ــ۴۱۳)

مولانا آزادؒ کے قلم کی جادو بیانی کا ایک چھوٹا سا نمونہ ملاحظہ کیجئے :

" ..... جب ملک قربانی اور سرفروشی کا یہ جذبہ طے کرلے گا تو پھر اس کی طاقت ناقابلِ تسخیر ہو جائے گی، کوئی ہتھیار اس پر اثر نہ کرے گا، کوئی فوج اس کو فتح نہ کر سکے گی، آسمان کی تمام بجلیاں بھی اگر اُتر آئیں اور سمندر کی تمام موجیں بھی اکٹھی ہو جائیں جب بھی قربانی کی قہرمانی طاقت کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، انسانوں کو قید کے نام سے دھمکایا جا سکتا ہے اور موت کے خوف سے وہ مسخر ہو جاتا ہے لیکن جو انسان خود قید کا آرزو مند ہو اور موت سے بے خوف ہو، اس کا مقابلہ کس ہتھیار سے کیا جائے؟ بالآخر

گورنمنٹ کو اپنے گھمنڈ کے تخت سے اترنا ہوگا اور حق و انصاف کے آگے جھکنا ہوگا، یا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسے تخت چھوڑ دینا پڑے گا۔"

مولانا آزادؒ کے قلم کی یہی وہ نئی جھنکار اور للکار تھی، جس سے متاثر ہوکر شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے کہا تھا کہ "الہلال نے ہمیں بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔" مولانا سید سلیمان ندویؒ کی رائے یہ تھی کہ "مولانا آزاد نے اس فتنۂ فرنگ کے عہد میں اس طرز و روش کی پیروی کی جس کو ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ نے فتنۂ تاتار میں پسند کیا تھا۔" اقبالؒ نے الہلال کے لئے خریدار مہیا کرکے اسے اپنا خراجِ عقیدت و محبت پیش کیا، بے مثال خطیب نواب بہادر یار جنگ کہا کرتے تھے کہ "میں الہلال پڑھ کر مقرر ہوا ہوں۔"

دوسرے بڑے خطیب عطاء اللہ شاہ بخاریؒ فرماتے ہیں کہ "مولانا ابوالکلام آزادؒ کے الہلال نے میری کایا پلٹ دی۔ اور مولانا ظفر علی خاں کے زمیندار اور ستارۂ صبح نے انہیں حریت پسندوں کے قافلہ میں شامل کر دیا۔"

مولانا محمد علی جوہر کا بیان ہے کہ "میں نے لیڈری ابوالکلام کی نثر اور اقبالؒ کی شاعری سے سیکھی ہے۔ مولانا ظفر علی خاں کا قول ہے کہ "اردو ادب الہلال کی اداؤں سے بلند و بالا ہوگیا، دینِ قیم کے چہرے پر اس کی صداؤں سے رونق آگئی اور سیاست کا بازار اس کے ولولوں سے معمور ہوگیا، الہلال قرنِ اول کی آواز تھا، لیکن کامریڈ میں صحابہ کا التہاب تھا اور زمیندار بلال کی اذان تھا۔" مولانا شبلی نعمانی کہا کرتے تھے، میں ایجاز (اختصار) کا بادشاہ ہوں اور ابوالکلام اطناب (طوالت) کا۔ مولانا حسرت موہانی کا تأثر یہ تھا کہ ؎

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر ∴ نظمِ حسرت میں بھی مزا نہ رہا

گویا عالم، ادیب، خطیب، صحافی، شاعر سبھی مولانا آزادؒ کے "حسنِ قلم" کے نہ صرف قائل بلکہ گھائل تھے، ہر باشعور شخص، قابلِ ذکر جماعت

اور ادارے نے ان کے قلمی فیضان سے فیض حاصل کیا تھا، اور "بارگاہِ آزاد" سے اسے ہمت مل رہی تھی کہ آزادی اور خدمتِ دین و ملت کی شمع کی لَو تیز تر کرے، اس لئے مولانا آزاد حق بجانب ہیں کہ وہ اپنے بارے میں کہیں :۔

بُھلا سکیں گے نہ اہلِ زمانہ صدیوں تک
مری وفا کے، مرے فکر و فن کے افسانے

جدوجہد آزادی میں قلم کا یہ نثری کرشمہ ہے، جس میں فتویٰ ہے، خطوط نویسی ہے، تجاویز نگاری ہے، اخبار نویسی اور صحافت ہے، جہاں تک تعلق قلم کی شاعرانہ جلوہ طرازیوں کا ہے تو "شعری دامن" نثری دامن سے کچھ کم وسیع نہیں ہے، سینکڑوں شعراء ہیں جنہوں نے اپنی شاعری سے تحریکِ آزادی کو پروان چڑھایا تھا اور اپنی رجزیہ خوانی سے جوانوں، بوڑھوں، بچوں، عورتوں سب کے سینوں کو جوشِ جہاد سے بھر دیا تھا، بہادر شاہ ظفر، محمد حسین آزاد، اسمٰعیل میرٹھی، اکبر، حالی، شبلی، اقبال، ظفر علی خاں، حسرت موہانی، محمد علی جوہر، چکبست، ترلوک چند محروم، ساغر نظامی، احسان دانش، جوش، شورش، حفیظ جالندھری، آنند نرائن ملا، فراق، فیض احمد فیض، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، مجروح سلطان پوری ..... جگر مراد آبادی، سکندر علی وجد، آخر کس کس کا نام لیا جائے، بطور نمونہ جوش کے اس پرجوش انداز کو دیکھئے : ؎

کام ہے میرا تغیر، نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ "انقلاب و انقلاب و انقلاب"

کوئی قدرت راہ سے مجھ کو ہٹا سکتی نہیں
کوئی ضربت میری گردن کو جھکا سکتی نہیں

شورش کا یہ پیغام تھا ؎

اے لشکرِ ملّت کے رضا کار جوانو
آزادیٔ کامل کے طلب گار جوانو
تقدیر کو تدبیر کے بازو پہ جھکا دو
ناموسِ وطن کے لئے جانوں کو لڑا دو

غفلت شعار، نیند کے ماتوں کو اقبالؔ اس طرح ہوشیار کر رہے تھے ؎

چھپا کر آستین میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادلِ باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

احسان دانشؔ کا یہ ترانۂ جہاد تھا :

ڈرا جو موت سے نہیں وہ شاد کامِ زندگی
ڈرو نہ موت سے کہ موت ہے دوامِ زندگی
ہے دل کی زندگی لگن بڑھے چلو بڑھے چلو
مجاہدینِ صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو

روش صدیقی فلسفۂ آزادی کو اس طرح پیش کر رہے تھے ؎

زندگی۔ تابندگی ہے روحِ آزادی کے ساتھ
زندگی۔ پایندگی ہے روحِ آزادی کے ساتھ
زندگی ہی زندگی ہے روحِ آزادی کے ساتھ
زندہ رہنا ہے تو آزادی سے کیسا اجتناب
انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق! انقلاب

پھر ہوا یہ کہ خطابت نے جو زورِ بیانی دکھایا تھا اور قلم نے جو جوشِ جہاد پیدا کیا تھا، اس کے نتیجہ میں آزادی کی صبح ایک زندہ حقیقت بن کر طلوع ہو گئی۔

سینے سے آدھی رات کے، پھوٹی وہ سورج کی کرن
برسے وہ تاروں کے کنول، وہ رقص میں آیا گگن
آئے مبارکباد کو، کتنے شہیدانِ وطن
آزاد ہے، آزاد ہے، آزاد ہے اپنا وطن

غلام ہندوستان کے بعد جب آزاد ہندوستان میں سورج طلوع ہونے لگا تو سکندر علی وجدؔ کے قلم نے اسے "آفتاب تازہ" سے تعبیر کیا اور اپنے سینہ میں وجد و کیف کی ایک دنیا بسائے ہوئے یوں گویا ہوا: ؎

دامانِ چاک اشکِ مسرّت سے تر ہے آج
دو سو برس کے بعد طلوعِ سحر ہے آج
شمعِ یقیں کے دم سے شکستوں کی شب کٹی
مہرِ مبیں پیمبرِ فتح و ظفر ہے آج
محسوس ہو رہا ہے انوکھا سُہانا پن
اک سادا جھونپڑا ہی سہی اپنا گھر ہے آج
سب تاجرانِ طوق و سلاسل چلے گئے
اے وجدؔ لطف عرض متاعِ ہنر ہے آج

تحریکِ آزادیٔ ہند کے جانبازوں سے ملاقات

آج سے پچاس سال پہلے ہمارا ملک ہندوستان غلام تھا۔ اب یہ آزاد ہے مگر آزادی کی یہ "نعمت" سونے کے طشت میں پیش نہیں کی گئی تھی بلکہ اس کے حصول کے لئے اَن گنت اور نت نئی کٹھنائیوں، دشواریوں اور قربانیوں سے گذرنا پڑا ہے، جن لوگوں نے اس کے لئے کمرِ ہمت باندھی تھی، وہ پہلے ہی روز سمجھ گئے تھے کہ :

؎ یہ عشق نہیں آساں، بس اتنا سمجھ لیجئے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

جوانوں کا، متوالوں کا، عشق کے بازیگروں کا یہی وہ "آہنی عزم" تھا جس کے سبب ساری بلائیں پسپا ہوئیں، شبِ دیجور اور گھنگھور گھٹا کے بادل سے آزادی کا سورج طلوع ہوا، اس راہ کے مسافر کتنے اوہام سے گذرے تو بالآخر یقین تک پہونچے، جگرؔ بھی یہ کہہ کہہ کر انہیں تسلّی دیتے رہے :

؎ طولِ غمِ حیات سے گھبرا نہ اے جگرؔ
ایسی بھی کوئی شام ہے جس کی سحر نہیں؟

سحر کو نمودار ہونا تھا، وہ نمودار ہوئی، تاریکی کو دور ہونا تھا، وہ دور

ہوئی، بقول شخصے :-

"نوے سال کی طویل مسافت طے کرتے ہوئے کاروانِ آزادی ۱۹۴۷ء میں ۱۴-۱۵ اگست کی درمیانی رات کے بارہ بجے اپنی منزل پر پہنچ گیا، جب پورا ہندوستان محوِ خواب تھا تو ہندوستان کا مقدر جاگ گیا اور ہندوستانی وقت کے مطابق ٹھیک بارہ بجے آل انڈیا ریڈیو سے ہندوستان کی آزادی کا اعلان ہوگیا۔"

تاہم ایسے موقع پر جب کہ ہم آزادی کا پچاس سالہ جشن منا رہے ہیں ایسا نہ ہو کہ ہم اپنے اس جشن کی ہماہمی، رنگ برنگ کے قمقموں، گانوں اور باجوں، مختلف سطح پر ترتیب دیئے گئے دل کش اور دل آویز پروگراموں میں اپنے ان سرفروشوں کو فراموش کر بیٹھیں جن کے سینوں میں سرفروشی کی تمنا مچلا کرتی تھی اور کامل شانِ استغنار کے ساتھ ان کی زبان یہ گویا ہوتی تھی ؎

سرفروشی کی تمنا اَب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

نہ جانے کیوں بے اختیار جی چاہ رہا ہے کہ ان سرفروشانِ آزادی سے جنہوں نے ہندوستان کی قسمت کو جگایا، چمکایا، بنایا اور سنوارا ہے مختصر تعداد ہی میں سہی مگر ملا جائے اور ان کے عزم کی آنچ سے کچھ گرمی حاصل کی جائے اور نئی نسل کو بتایا جائے کہ :

ع ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

اور یہ بھی کہ ؎

عزم کی آنچ سے پتھر بھی پگھل جاتے ہیں گر نہ ہو عزم تو موم بھی ہے پتھر کی طرح

اقبال سہیل کی یہ صدا بھی لائقِ التفات ہے :

ے جوانو ! یہ صدائیں آرہی ہیں آبشاروں سے
چٹانیں چور ہو جائیں جو ہو عزمِ سفر پیدا

آئیے، آگے بڑھئے، سب سے پہلے اِن سے ملیئے، یہ ہیں میسور کے بلند ہمت اور غیور فرمانروا فتح علی خاں ٹیپو سلطان ——— یہ وہ پہلے آدمی ہیں جنہیں انگریز کی خطرناک سازش اور باریک چال کا اندازہ ہوگیا تھا اور یہ سمجھ گئے تھے کہ بتدریج انگریز ایک ایک صوبہ اور ایک ایک ریاست کو ہضم کرتے چلے جائیں گے، انہوں نے انگریزوں سے جنگ کا فیصلہ کیا اور اپنے پورے ساز و سامان، وسائل اور فوجی تیاریوں کے ساتھ ان کے مقابلہ میں میدان میں آگئے مگر انگریزوں نے جنوبی ہند کے امراء کو اپنے ساتھ ملالیا اور آخر کار اس مجاہد بادشاہ نے ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو سرنگاپٹم کے معرکہ میں شہید ہوکر سرخروئی حاصل کی، انہوں نے انگریزوں کی غلامی اور اسیری اور ان کے رحم و کرم پر زندہ رہنے پر موت کو ترجیح دی، ان کا مشہور تاریخی مقولہ ہے کہ "گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی اچھی ہے" جب جرنل (HORSE) کو سلطان کی شہادت کی خبر ملی تو اس نے ان کی نعش پر کھڑے ہوکر یہ الفاظ کہے کہ :

"آج سے ہندوستان ہمارا ہے"

"ہندوستان کی تاریخ سلطان ٹیپو سے زیادہ بلند ہمت، بالغ نظر، مذہب و وطن کے فدائی اور غیر ملکی اقتدار کے دشمن سے آشنا نہیں، انگریزوں کے لئے ٹیپو سلطان سے زیادہ مہیب اور قابلِ نفرت شخصیت کوئی نہ تھی، بہت عرصہ تک (اور وہ زمانہ ہم نے بھی دیکھا ہے) وہ اپنے

دل کی آگ بجھانے اور آزادی و جہاد کے اس ہیرو کی تذلیل و توہین کے لئے اپنے کتوں کو سلطان ٹیپو کے نام سے پکارتے تھے، گاندھی جی نے (YOUNG INDIA) کے ایک مضمون میں سلطان کی حُبُّ الوطنی اور رواداری کا کھل کر اعتراف کیا تھا اور کہا تھا کہ وطن اور قوم کے شہیدوں میں ان سے بلند مرتبہ کوئی نہ تھا۔"

(ہندوستانی مسلمان، از: مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ صفحہ ۱۵۶)

یہ ہیں پیر علی، شہر عظیم آباد (پٹنہ) کے رہنے والے، ان کی قیادت میں ۱۸۵۷ء میں باغیانہ سرگرمیاں جاری ہیں، ان کے تمام ساتھیوں کو گرفتار کرکے پھانسی دیدی گئی ہے۔ جب پیر علی کو گرفتار کیا گیا تو اپنے ساتھیوں کے انجام کے اثر سے کسی طرح کی کوئی سراسیمگی ان پر طاری نہیں ہے، جرأت اور بے خوفی کا جو عالم ہے اس کی تفصیل خود ولیم ٹیلر "پٹنہ کرائی سز" (PATNA CARISIS) میں لکھتا ہے:-

"جب پیر علی کو پھانسی کا حکم سنایا گیا تو پھانسی سے قبل سازش کے متعلق چند معلومات حاصل کرنے کی غرض سے میں نے اس کو اپنے خاص کمرے میں بلایا، وہ جب میرے اور دوسرے انگریز افسروں کے سامنے لایا گیا تو اس وقت وہ سر سے پاؤں تک اس طرح زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا کہ نہ بیٹھ سکتا تھا نہ آسانی سے چل سکتا تھا، اس کے کپڑے انتہائی گندے اور جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے، نیز پھٹے ہوئے کپڑے لہو کے دھبّوں سے چپک چپک گئے تھے، ان تمام کربناک حالات اور پھانسی کا حکم سننے کے باوجود وہ نہایت مطمئن اور بے خوف نظر آرہا تھا، اس کی بے خوفی اور اطمینان کو دیکھ کر تمام لوگوں کے دلوں پر گہرا اثر ہوا

اس سے قبل اتنا بڑا نڈر، بے خوف اور عالی ہمّت آدمی نہیں دیکھا تھا، جب اس سے پوچھا گیا کہ" اگر وہ سازشوں کے سلسلے میں چند سوالات کا صحیح صحیح جواب دیدے تو اس کی جان بچانے کی صورت نکل سکتی ہے"۔ اس بات کو سن کر پہلے تو اس نے اتنے تیکھے تیور سے دیکھا کہ ہم لوگوں کے دلوں میں دہشت سی پیدا ہوگئی پھر اس نے کسی بھی راز کو بتانے سے انکار کردیا اور نہایت ہی جرأت و استقلال کے ساتھ جواب دیا ——— " زندگی کے چند مواقع ایسے ہوتے ہیں جب کہ جان بچانا عقل مندی کا کام ہوتا ہے مگر بعض ایسے مواقع بھی آتے ہیں جبکہ جان کی پرواہ نہ کرنا اور اصول و دیانت نیز اپنے وطنِ عزیز پر قربان ہو جانا، شرافت و دیانت داری کے ساتھ ساتھ حُبّ الوطنی کی دلیل ہوتی ہے، اس کے بعد نہایت نفرت و حقارت سے دیکھتے ہوئے میری سخت گیری پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ" تم مجھ کو اور میرے ساتھیوں کو روزانہ پھانسی دے سکتے ہو مگر یاد رکھو کہ ہمارے خون کی چھینٹوں سے ہزاروں آزادی کے متوالوں کے دلوں میں ایسی گرمی آئے گی کہ اس گرمی سے تم اور تمہاری حکومت پگھل کر رہ جائے گی"۔

اس کے بعد اس پیکرِ جہادِ آزادی کو بانکی پور لان کے شمال مغربی کونے پر ۷ جولائی ۱۸۵۷ء کو جہاں آجکل چلڈرن پارک ہے، پھانسی دیدی گئی"۔ (ہندوستانی مسلمانوں کا جنگِ آزادی میں حصّہ، صفحہ: ۱۷، ۱۶)

پیر علی کے بعد بہادر شیر علی سے ملئے، صورت حال یہ ہے کہ" جسٹس نارمن کے قاتل عبداللہ کو پھانسی دیدی گئی ہے، اسی دن شیر علی نے قسم کھالی ہے کہ وہ کسی بڑے انگریز کو ضرور قتل کرے گا، وہ اکثر روز

رکھتا ہے، محنت مزدوری کرکے جب کچھ پیسے مل جاتے ہیں تو ہر مہینے کھانا پکوا کر مسکینوں میں تقسیم کرتا ہے اور جزیرہ میں وہ بڑا نیک نام اور ممتاز ہے، اسی نیک چلنی کی وجہ سے اس کی زیادہ نگرانی بھی پولیس نہیں کرتی ہے، وائسرائے کے قتل کے بعد اس پر مقدمہ چلا اور پھانسی کی سزا ہوئی، تختہ پر کھڑے ہوکر وہ لوگوں کو مخاطب کرکے کہہ رہا ہے :-

"میں نے جب اس کام کا ارادہ کیا ہے تو اپنے تئیں مُردہ سمجھ لیا ہے مسلمان بھائیو! میں نے تمہارے دشمن کو مار ڈالا، اَب تم شاہد رہو کہ میں مسلمان ہوں اور پھر کلمہ پڑھا، دو دفعہ ہوشیاری سے پڑھا تیسری دفعہ پھانسی کی رسی سے اس کا گلا گھٹ گیا اور پورا کلمہ زبان سے نہ نکل سکا" (تحریکِ آزادی اور مسلمان، صفحہ ۵۵)

اس نوجوان کو لوگ اشفاق اللہ خاں کے نام سے جانتے ہیں، یہ پھانسی کے تختہ پر چڑھا دیئے گئے ہیں، لیکن آزادیِ وطن کا نشہ کسی ترشی سے اترنے والا نہیں، اسی حالت میں اپنے نڈھال اور غم زدہ عزیزوں اور دوستوں کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کہہ رہے ہیں :-

" اگر مجھے آخری رسم ادا کرنے کی اجازت باعزت طور پر نہیں دی گئی تو اس موقع کا تقدس مجروح ہو جائے گا، میں آج عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہوں، اس لئے کہ مادرِ وطن کی آزادی کیلئے پھانسی کے تختہ پر چڑھایا جارہا ہوں، تمہیں فخر کرنا چاہئے اور خوش ہونا چاہئے کہ تمہارا ایک عزیز ایک مقدس فرض کو پورا کرنے کے سلسلہ میں اپنی جان دے رہا ہے، ہندو قوم کے افراد کنھی لال اور خودی رام نے جان دی، مجھے بحیثیت مسلمان ہونے کے اس راستہ

میں شہادت نصیب ہو رہی ہے، یہ تو خوشی کی بات ہے"۔
پھانسی کے وقت تختۂ دار پر چڑھتے ہوئے قرآنِ پاک کی آیتیں
اس کی زبان پر ہیں اور پھانسی کا پھندا اس کے گلے میں لگایا جا رہا ہے"۔

(تحریکِ آزادی اور مسلمان، صفحہ ۲۱۶ - ۲۱۵)

یہ مولوی رضی اللہ صاحب ہیں، مشہور محدث، فقیہ، مؤرخ اور مجاہدِ آزادی مولانا سید محمد میاں ان سے آپ کی ملاقات کرا رہے ہیں:۔

" مولوی رضی اللہ بدایون کے صدیقی شیخ ہیں، مولوی صاحب سے کارمیکل نے پڑھا تھا، جب وہ گرفتار ہو کر اس کے سامنے پیش ہوئے، اس کے استفسار پر مولوی صاحب نے شرکتِ ہنگامہ کا اقبال کیا، اس نے مقدمہ ملتوی کر کے دوسرے دن پر رکھا اور چاہا کہ مولوی صاحب انکارِ جرم کریں مگر دوسرے دن پھر پیشی کے وقت مولوی صاحب نے پچھلے بیان سے سرِ مو فرق نہیں کیا، سزائے موت کا حکم ہوا، جس وقت گولی کے نشانہ کے لئے پیش ہوئے، اس وقت کارمیکل نے کہا کہ اگر آپ اس وقت بھی انکار کر دیں تو آپ کی جان بچا دوں، مولوی صاحب نے جواب دیا، کیا میں تمہاری وجہ سے اپنا ایمان و عاقبت خراب کر لوں، نہایت خندہ پیشانی سے جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دی"۔

(علماءِ ہند کا شاندار ماضی جلد ۴ صفحہ ۳۶۳)

مولانا سید محمد میاں صاحب ہی کے توسط سے ایک اور ملاقات کر لیجئے، دیکھئے مولانا کیا فرما رہے ہیں:

" ۲۸ اپریل ۱۸۵۸ء کو مراد آباد پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہوا، مولانا کفایت علی کافی کچھ دنوں محفوظ رہے۔ ۳۰ اپریل ۱۸۵۸ء مطابق

۱۶ رمضان المبارک ۱۲۷۴ھ کو مولانا گرفتار ہوئے، مولانا پر مختلف الزامات عائد کئے گئے اور ضابطہ کی کارروائی کے بعد پھانسی کا حکم صادر کر دیا گیا، مولانا کافی نے جیسے ہی حکم سنا، نہایت خوشی کا اظہار کیا اور اب مولانا کو پھانسی کے لئے لے جایا جا رہا ہے، آپ کی زبان پر ایک تازہ نظم ہے، جو بڑے ترنم سے بلند آواز سے پڑھ رہے ہیں۔ نظم یہ ہے :-

کوئی گل باقی رہے گا، نے چمن رہ جائے گا
پر رسول اللہؐ کا دینِ حسن رہ جائے گا

ہم سفیرو باغ میں ہے کوئی دم کا چہچہا
بلبلیں اڑ جائیں گی، سونا چمن رہ جائے گا

اطلس و کمخواب کی پوشاک پر نازاں نہ ہو
اس تنِ بے جان پر خاکی کفن رہ جائے گا

نام شاہانِ جہاں مٹ جائیں گے لیکن یہاں
حشر تک نام و نشانِ پنجتن[1] رہ جائے گا

جو پڑھے گا صاحبِ لولاک کے اوپر درود
آگ سے محفوظ اس کا تن بدن رہ جائے گا

سب فنا ہو جائیں گے کافی ولیکن حشر تک
نعتِ حضرتؐ کا زبانوں پر سخن رہ جائے گا

حضرت مولانا کافی کو جیل مراد آباد کے پاس مجمع عام کے سامنے پھانسی دی گئی اور وہیں تدفین عمل میں آئی ——— جہاں تک تعلق پنجتن کا ہے تو اس کی تفسیر مولانا کافی کے دیوان کے مندرجہ ذیل اشعار میں ملاحظہ فرمائیے :-

---

[1] ان کے ساتھ تمام صحابۂ کرام اور صلحائے عظام کے نام بھی باقی رہیں گے، قرآن کا فرمان ہے : وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ (سورۂ رعد : ۱۷) اور جو چیز لوگوں کے لئے نفع بخش ہوتی ہے وہ زمین میں (ہمیشہ) باقی رہتی ہے۔) م۔ر

السّلام اے چار یارِ باصفا، ارکانِ دین
مجمعِ جود و حیا، صدق و عدالت السّلام

ثنا خوانِ نبیؐ ہوں اور اصحابِ نبیؐ کا فی
ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ سے مجھکو الفت ہے

مجھے الفت ہے یارانِ نبیؐ سے
ابوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ و علیؓ سے،

محبت ان کی ہے ایمان میرا
میں ان کا مدح خواں ہوں جان و جی سے

(ایضاً، صفحہ ۳۷۹ ـــــ ۳۷۸)

اور ہاں! مولانا فضلِ حق خیرآبادی کی داستانِ کرب و بلا بھی تو سنئے، وہ فرمارہے ہیں:-

"مکر و تلبیس سے جب نصاریٰ نے مجھے قید کرلیا تو ایک قید خانہ سے دوسرے قید خانہ اور ایک سخت زمین سے دوسری سخت زمین میں منتقل کرنا شروع کیا، مصیبت پر مصیبت اور غم پر غم پہنچایا۔ میرا جوتا اور لباس تک اتار کر موٹے اور سخت کپڑے پہنا دیئے، نرم بستر چھین کر خراب، سخت اور تکلیف دہ بچھونا حوالہ کر دیا، گویا کانٹے بچھا دیئے گئے یا دہکتی ہوئی چنگاریاں ڈال دی گئیں ہیں، میرے پاس لوٹا، پیالہ اور کوئی برتن تک نہیں، بخل سے ماش کی دال کھلائی اور گرم پانی پلایا، کوئی گرمجوش دوست تو کیا ملتا، گرمجوش پانی دیا گیا، اس ضعیفی اور پیرانہ سالی میں ہر وقت اور ہر آن ذلّت و توہین سے کام لیا گیا

پھر مجھے دریائے شور کے کنارے ایک ایسے پہاڑ پر پہنچا دیا گیا جس کی آب و ہوا ناموافق، جہاں سورج ہمیشہ سر پر ہی رہتا ہے، اس کی گھاٹیاں دشوار گذار، پیچ در پیچ، جنہیں دریائے شور کی موجیں ڈھانپ لیتی ہیں، اس کی نسیم صبح بھی سموم سے زیادہ گرم، غذا حنظل سے زیادہ کڑوی اور زہر ہلاہل سے زیادہ مضر، اس کا پانی سانپوں کے زہر سے زیادہ ضرر رساں، ہر کوٹھری پر چھپر ہے جس میں رنج و مرض بھرا ہوا ہے، میری آنکھوں کی طرح ان کی چھتیں ٹپکتی رہتی ہیں اور ان سے بدبو ٹپکتی رہتی ہے، امراض کی کثرت، بیماری عام، دوا ناپید اور مشکل، خارش اور قوبا (جس مرض میں بدن کی کھال چھلنے اور پھٹنے لگتی ہے) کا رواج عام، بیمار کے علاج، تندرست کے بقاءِ صحت اور زخم کے اندمال کی صورت نہیں، دنیا کی کوئی مصیبت یہاں کی مصیبتوں پر قیاس نہیں کی جا سکتی، یہاں کی معمولی بیماری بھی خطرناک ہے، بخار موت کا پیغام، مرض سرسام اور برسام (دماغ کے پردوں کا ورم) ہلاکت کی علّتِ تام ہے اور کتنی ہی بیماریاں ایسی ہیں کہ طب کی کتابوں میں ان کا نام و نشان نہیں، ڈاکٹروں کی یہ حالت کہ مرض کچھ دوا کچھ، مرنیوالے کے ساتھ یہ سلوک کہ مردہ خاکروب کے حوالہ کر دیا جاتا ہے، نہ غسل نہ کفن نہ دفن نہ نمازِ جنازہ، اگر میت کے ساتھ یہ سلوک نہ ہوتا تو یہاں کی مصیبتوں کے مقابلہ میں مرجانا سب سے بڑی آرزو ہوتی اور اگر مذہباً خودکشی ممنوع نہ ہوتی تو قید و بند کی ان مصیبتوں سے نجات پالینا بہت آسان تھا۔

میں نہیں جانتا کہ ان مصیبتوں سے کس طرح چھٹکارا ہو سکے گا، خارش اور قوبا میں مبتلا ہو جانا مصیبت بالائے مصیبت ہے، صبح و شام اس

طرح بسر ہوتی ہے کہ تمام بدن زخموں سے چھلنی بن چکا ہے، روح کو تحلیل کر دینے والے درد اور تکلیف کے ساتھ زخموں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے"

اس کے بعد کا واقعہ ان کے بعض سیرت نگاروں کے حوالہ سے پڑھئے:

" مولانا کو پہلے صفائی کے کام پر لگایا گیا، برہنہ پا، صرف ایک لنگی اور کمبل کا کرتہ، کوڑا کرکٹ صاف کرتے اور ٹوکرے میں اکٹھا کر کے پھینک آتے مگر کچھ دنوں بعد آپ کو محرّری کے کام پر لگا دیا گیا اور اس تبدیلی کا سبب آپ کا علمی تبحر ہوا، صورت یہ ہوئی کہ سپرنٹنڈنٹ کے پاس علم ہیئت کی ایک قلمی کتاب تھی، سپرنٹنڈنٹ کے یہاں ایک مولوی صاحب کام کرتے تھے، سپرنٹنڈنٹ نے مولوی صاحب کو کتاب دی کہ اس کی غلطیاں درست کر دیں، مولوی صاحب یہ کتاب مولانا کے پاس لے آئے۔ مولانا نے نہ صرف عبارتیں درست کیں بلکہ جگہ جگہ مضمون کی بھی تصحیح اور توضیح کر دی اور کتابوں کے حوالے بھی درج کر دیئے، سپرنٹنڈنٹ کو جب مولانا کے علم و فضل کا احساس ہوا تو اس نے صفائی کی خدمت سے ہٹا کر محرری پر لگا دیا اور حکومت سے رہائی کی سفارش بھی کر دی۔

علامہ کے صاحبزادے مولوی شمس الحق اور خواجہ غلام غوث بیخبر میر منشی لفٹنٹ گورنر کی کوششیں برابر جاری رہیں، ادھر انڈمان کے سپرنٹنڈنٹ جیل نے بھی سفارش کی ہے، نتیجہ میں کامیابی ہوئی، یعنی رہائی کا حکم ہو گیا، لیکن عجیب و غریب اور نہایت تکلیف دہ اور دلخراش صورت یہ پیدا ہوئی کہ مولانا شمس الحق صاحب پروانۂ رہائی حاصل کر کے انڈمان پہونچے، جہاز سے اتر کر شہر میں گئے تو ایک جنازہ پر

نظر پڑی، اس کے ساتھ بڑا اژدہام تھا، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کل ۱۲ر صفر ۱۲۷۸ھ مطابق ۲۰ر اگست ۱۸۶۱ء کو علامہ فضل حق خیرآبادی کا انتقال ہوگیا ہے۔ اَب سپردِ خاک کرنے جارہے ہیں۔ یہ بھی بصد حسرت ویاس شریکِ دفن ہوئے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

(ایضاً صفحہ ۴۵۲ تا ۴۵۵)

اسیر مالٹا حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی نے ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں جو عظیم خطرات مول لئے ہیں اور ناقابلِ بیان تکلیف دہی اور اذیت رسانی کا تسلسل انگریزوں کی جانب سے ان کے ساتھ جورہا ہے، اس سے کوئی بھی باخبر بے خبر نہیں ہے، مالٹا کی قید سے آزاد ہوچکے ہیں۔ ضعف اور پیرانہ سالی کے ساتھ مختلف بیماریوں نے گھیر لیا ہے۔ اس حالت میں علی گڑھ میں ایک مجلس کی صدارت کی خواہش کی جاتی ہے، مولانا کی بیماری اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ کروٹ بدلنے میں بھی دشواری ہوتی ہے، معتقدین اس حالت میں سفر اور پھر صدارت کو بہت زیادہ خطرناک تصور کرتے ہیں اور اصرار کے ساتھ حضرت شیخ کو منظوری صدارت سے منع کرنا چاہتے ہیں لیکن حضرت شیخ کا جواب یہ ہے:۔ "اگر میری صدارت سے انگریز کو تکلیف ہوگی تو میں اس جلسہ میں ضرور شریک ہوں گا" چنانچہ اس جذبہ کے تحت انہوں نے اس جلسہ میں شرکت فرمائی۔ (علمائے حق، جلد اول صفحہ ۲۱۳)

شیخ الہند کے چہیتے شاگرد اور مالٹا کی اسارت کے زمانہ کے خاص رفیق مشہور مجاہدِ آزادی شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کی طرف بھی توجہ کیجئے، ایک خاص مقدمہ میں عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے

آہنی عزم اور فولادی جگر کے ساتھ فرما رہے ہیں :۔

" اگر گورنمنٹ کا منشا مذہبی آزادی کو سلب کرنا ہے تو صاف صاف اعلان کر دیا جائے تاکہ سات کروڑ مسلمان اس بات پر غور کر لیں کہ آیا ان کو مسلمان رہنا منظور ہے یا گورنمنٹ کی رعایا، اسی طرح ۲۲ کروڑ ہندو بھی غور کر لیں کہ ان کو کیا کرنا چاہیئے، کیوں کہ جب مذہبی آزادی چھینی جائے گی تو سب کی چھینی جائے گی" ——————— " اگر لارڈ ریڈنگ اس لئے ہندوستان بھیجے گئے ہیں کہ قرآنِ مجید کو جلا دیں اور حدیثوں کو مٹا دیں اور فقہ کی کتابوں کو تباہ و برباد کر دیں تو سب سے پہلے اسلام پر اپنی جان قربان کرنے والا میں ہوں گا"

اس بیان پر بے قابو ہو کر حاضرین نعرۂ تکبیر بلند کر رہے ہیں اور مولانا محمد علی بڑھ کر مولانا کے ہاتھ چوم رہے ہیں۔

مولانا مدنی کے ہاتھ چومنے والے مولانا جوہر کی یہ للکار بھی سنیئے جسے وہ انگریزوں کے پایۂ تخت لندن میں ایک بھرے مجمع کے سامنے لگا رہے ہیں :۔

" میں غلام ہندوستان میں واپس نہیں جاؤں گا، میں یہاں سے اس وقت لوٹوں گا جب میرے ہاتھ میں ہندوستان کی آزادی کا پروانہ ہوگا اور اگر تم مجھے آزادی کا پروانہ نہیں دے سکتے تو میرے لئے اسی سرزمین میں ایک قبر کی جگہ تو دینی ہی پڑے گی"

بیرونی محاذ کے مشہور مجاہد آزادی مولانا برکت اللہ بھوپالی

بوقتِ وفات اپنے پورے ہوش و حواس میں ہیں اور اس وقت اپنے کچھ ساتھیوں کے سامنے، جو بسترِ مرگ کے پاس اس وقت موجود ہیں، ان کے آخری الفاظ یہ ہیں :-

" تمام زندگی میں پوری ایمانداری کے ساتھ وطن کی آزادی کے لئے جدوجہد کرتا رہا۔ یہ میری بڑی خوش قسمتی ہے کہ میری یہ ناچیز زندگی میرے پیارے وطن کے کام آئی، آج اس زندگی سے رخصت ہوتے ہوئے جہاں مجھے یہ افسوس ہے کہ میری زندگی میں میری کوششیں کامیاب نہ ہوسکیں وہاں مجھے اس بات کا بھی اطمینان ہے کہ میرے بعد میرے ملک کو آزاد کرنے کے لئے لاکھوں آدمی آج آگے بڑھ آئے ہیں جو سچے ہیں، بہادر ہیں اور جانباز ہیں، میں اطمینان کے ساتھ اپنے پیارے وطن کی قسمت ان کے ہاتھوں میں سونپ کر جارہا ہوں "

یہ ہیں مولانا محمد بشیر صاحب، کابل کی عارضی حکومت میں وزیرِ دفاع بنائے گئے ہیں، وہ ابتدا ہی سے جماعت مجاہدین کے کام میں حصہ لینے لگے تھے۔ اگرچہ ان کا کاروبار اچھا خاصہ تھا لیکن مجاہدین کے ساتھ وہ قلبی تعلق پیدا ہوا کہ سب کچھ چھوڑ کر ہجرت کر آئے، ان کے گھر کی معاشی حالت خراب ہوگئی لیکن ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی، ایک شخص ان سے وطن لوٹنے کے بارے میں کہہ رہا ہے تو اس کے جواب میں وہ فرمارہے ہیں :-

" میں جس دن گھر بار چھوڑ کر نکلا ہوں، خدا سے عہد کیا ہوں کہ جب تک ہندوستان کی سرزمین پر انگریزوں کا سایہ بھی موجود

ہے، خواہ اس کی حیثیت کچھ بھی ہو، کبھی واپس نہیں جاؤں گا اور غلام ہندوستان میں سانس لینا بھی اپنے لئے حرام سمجھوں گا، میں یہ عہد اپنے آخری دم تک نبھاؤں گا۔"

مولانا اسیر ادروی اپنی کتاب "تحریک آزادی اور مسلمان" میں لکھتے ہیں :-

" جنگِ آزادی میں حصہ لینے والی بہادر خواتین میں ماجدہ بیگم اور حسینی بیگم کے نام جلی حروف میں لکھے جائیں گے، خلوص اور سچائی سے کام کرنے والی یہ خواتین ہیں، حسینی بیگم ایک جاروب کش کی لڑکی ہے، اپنے حقوق اور سوشل انصاف کے لئے اس نے لڑائی کو بہت تیز کیا ہے، جس کے نتیجہ میں اسے جیل جانا پڑا، قید کی مدّت گذار کر واپس آئی ہے تو اس کی سرگرمیاں اور بڑھ گئی ہیں، پولیس نے دوبارہ اس کو جیل بھیجدیا ہے، اس نے پولیس مظالم کے خلاف آواز بلند کر دیا ہے اور پوری جرأت و ہمت کے ساتھ اپنے موقف پر قائم ہے، مسلم لیگ کے انداز فکر اور تنگ نظری کی سخت دشمن ہے اور مسلم لیگ کے خلاف برابر جدوجہد کرتی رہی اور فرقہ وارانہ منافرت کا اس نے ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے۔

کلکتہ کے ٹراموے مزدوروں کی تنظیم میں بھی کمیونسٹ پارٹی کے ورکروں نے بھرپور حصہ لیا ہے، ان میں بڑی تعداد مسلمان ورکروں کی ہے، ۱۹۴۶ء میں بحری بیڑے میں کام کرنے والوں نے بمبئی اور کراچی میں انقلاب کا نعرہ بلند کیا، بمبئی کے بحری بیڑے میں کرنل خاں کی سرگرمیاں تیز تر ہیں، انہوں نے گودی کی بغاوت میں اہم

رول ادا کیا ہے، انہوں نے سارے ہندوستان سے اپیل کی ہے کہ بلا امتیاز مذہب و قوم ہماری مدد کی جائے۔ کراچی کی بحری بغاوت کا یہ واقعہ ناقابلِ فراموش ہے کہ ایک مسلمان نوجوان طالب علم انور حسین لاہوری جہاز کے ڈیک پر ہاتھ میں سُرخ جھنڈا لے کر چڑھ گیا ہے اور انقلاب زندہ باد کا نعرہ بلند کر دیا ہے، پولیس نے نشانہ لگا کر انور حسین کو وہیں گولی مار دی ہے اور جھنڈا ہاتھ میں لئے ہوئے وہیں شہید ہو گیا ہے۔" (صفحہ ۲۱۴-۲۱۳)

اسی کتاب میں ہے :-

"جنرل شاہ نواز جو آزاد ہند فوج میں جنرل ہے، ——— انگریزی عدالت میں ان پر مقدمہ چل رہا ہے، عدالت کے سامنے بیان دیتے ہوئے وہ اس کا اظہار کر رہے ہیں کہ :-

" میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ برطانیہ کا نظامِ حکومت ناانصافی پر مبنی ہے اور اس ناانصافی کو ختم کرنے کے لئے میں نے اپنا سب کچھ قربان کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے، اپنی زندگی، اپنا گھر بار، اپنا خاندان اور اپنی خاندانی روایات، میں نے طے کر لیا ہے کہ اگر میرا حقیقی بھائی بھی اس راستہ میں حائل ہوگا تو میں اس کے ساتھ بھی لڑوں گا اور یہ واقعہ ہے کہ ۱۹۴۴ء میں جو لڑائیاں برپا ہوئیں، ان میں ہم دونوں بھائی ایک دوسرے کے خلاف لڑتے رہے حتیٰ کہ وہ زخمی ہو گیا، چندون نامی پہاڑیوں میں میرے اور میرے بھائی کے درمیان دو ماہ تک روزانہ لڑائی ہوتی رہی۔

مختصر یہ کہ میرے سامنے سوال ہے کہ مجھے ملکِ معظم کے

ساتھ وفادار رہنا چاہیئے یا اپنے وطن کے ساتھ ؟ اور میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مجھے اپنے وطن کے ساتھ اظہارِ وفاداری کرنا چاہیئے، چنانچہ میں نے نیتاجی سبھاش چندر بوس سے وعدہ کرلیا ہے کہ میں اپنے وطن عزیز کے لئے جان تک قربان کردوں گا۔

(صفحہ : ۳۲۵)

مولانا ابوالکلام آزاد نے "ستیہ گرہ" کا ایک نسخۂ کیمیا مرتب کیا ہے، وہ لوگوں کو اس راہ پر چلنے کی پُرجوش طریقہ اور ولولہ انگیز انداز میں اس طرح دعوت دے رہے ہیں :-

"ہم نے اول دن سے اعلان کیا ہے کہ موجودہ جدوجہد کی آخری منزل قید خانہ ہے، اس جنگ کی فتح و شکست کا فیصلہ میدانوں میں نہ ہوگا، قید خانوں کی کوٹھڑیوں میں ہوگا، ہم نے اس لئے "سول ڈیس رُوبیڈینس" یعنی سول نافرمانی کو بھی پروگرام میں داخل کیا ہے، کیونکہ قید خانے کی سب سے زیادہ سہل اور سیدھی راہ یہی ہے، پھر کیا واقعی قید و بند کا پیام آگیا ہے ؟

ہندوستان نے سفر شروع کیا ہے، ایک سفر اس کے مقاصد کا ہے، ایک سفر جاں دادگانِ مقاصد کے فرائض کا ہے اور پہلے کی کامیابی دوسرے کی کامیابی پر موقوف ہے، طریقِ عمل یہ قرار پایا کہ جو سفر اس وقت چند مسافروں میں محدود ہے، اس کو تمام ملک اپنا شیوہ بنالے اور سینکڑوں ہزاروں جانباز ایسے پیدا ہوجائیں جو کامل خودفروشی اور قربانی کے ساتھ کوچ کردیں، ایمان کی لازوال روح ان کے دلوں میں ہو، صبر کی انتھک اور

اٹل طاقت ان کے قدموں میں رہے، عشق ان کی رہبری کرے، شوق ان کا رفیق اور دمساز ہو، عزم قدم قدم پر ہمت بڑھائے، ہمت آگے بڑھ کر راستہ صاف کرے اور پھر جب آخری منزل آجائے، قید و بند کی پکار اور طوق و زنجیر استقبال کریں تو ایسا ہو کہ ہزاروں قدم اس کے لئے مضطربانہ دوڑیں، ہزاروں ہاتھ اس کی طرف والہانہ بڑھیں ہزاروں دل اس طلب و شوق سے معمور ہو جائیں، وہ عشق و نشاط کی پکار ہو، کامرانی و مراد کی بخشش ہو، فتح و اقبال کا نشان ہو، ہر انسان اس کی آرزوئیں کرے، ہر دل اس کے لئے رشک کھائے اور ہر روح میں اس کے لئے بیقراری سما جائے، قید کرنے والے قید کرنے سے تھک جائیں لیکن قید ہونے والے قید ہونے سے نہ اُکتائیں، ہتھکڑی پہنانے کے لئے ہاتھ نہ ملیں لیکن ہتھکڑی پہننے والے ہاتھوں کی کمی نہ ہو، یہاں تک کہ ہندوستان کے جیل خانوں میں ایک نئی بستی زندانیانِ حق کی آباد ہو جائے اور اس کی کوٹھڑیوں اور محنت خانوں میں چوروں اور ڈاکوؤں کو رکھنے کی جگہ باقی نہ رہے، جب ملک قربانی اور سرفروشی کا یہ جذبہ طے کرلے گا تو پھر اس کی طاقت ناقابلِ تسخیر ہو جائے گی، کوئی ہتھیار اس پر اثر نہ کرے گا، کوئی فوج اس کو فتح نہ کر سکے گی، آسمان کی تمام بجلیاں بھی اگر اتر آئیں اور سمندر کی تمام موجیں بھی اکٹھی ہو جائیں جب بھی قربانی کی قہرمانی طاقت کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، انسانوں کو قید کے نام سے دھمکایا جا سکتا ہے اور موت کے خوف سے وہ مسخر ہو جاتا ہے، لیکن جو انسان خود قید کا آرزومند ہو اور موت سے بے خوف

ہو، اس کا مقابلہ کس ہتھیار سے کیا جائے گا؟ بالآخر گورنمنٹ کو اپنے گھمنڈ کے تخت سے اترنا ہوگا اور حق و انصاف کے آگے جھکنا ہوگا، یا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کو تخت چھوڑ دینا پڑے گا۔"

(تحریکِ آزادی اور مسلمان صفحہ ۱۷۶-۱۷۵)

تحریکِ آزادی ہند کے مسلم جانبازوں سے ملاقات کا یہ سلسلہ طویل تر ہوسکتا ہے مگر اسے ہم مولانا آزاد کی اس ملاقات پر ختم کرتے ہیں، مشہور مفکر اور مؤرخ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے اس اظہارِ حقیقت کے ساتھ کہ:

"باوجود اس کے کہ یہ جنگِ آزادی صحیح معنی میں عوامی اور قومی تھی، اور ہندو و مسلمان سب ان میں شریک تھے اور ہندوستان نے وطن دوستی، اتحاد اور گرمجوشی اور ولولہ کا ایسا منظر کبھی نہ دیکھا تھا جیسا کہ اس وقت دیکھنے میں آیا، پھر بھی قیادت و رہنمائی کے میدان میں مسلمان کا پلڑہ بھاری تھا، چنانچہ اکثر قائد مسلمان ہی تھے۔"

(ہندوستانی مسلمان صفحہ ۱۵۸)

جنگِ آزادی کے اس ماحول سے نکل کر جب میں واپس آرہا تھا تو مجھ سے میرا یہ خیال سرگوشی کرنے لگا کہ "جذبۂ حریت سے سرشار سرفروشوں کی قربانیوں کے نتیجہ میں جو "آزادی" ملی، اس کا حق ہے کہ وسیع تر معنی و مفہوم میں اس کی "قدر" کی جائے اور باشندگانِ ہند کسی نفرت، تعصب اور بھید بھاؤ میں پڑے بغیر دوش بدوش ملک کی تعمیر و ترقی میں اپنا اپنا حصہ ادا کریں"۔ ——— خیال کی اس لہر کے ساتھ فضا میں ایک آواز لہرائی آواز میں درد تھا، سوز تھا، خلوص تھا، وفا تھی، حلاوت تھی، مٹھاس تھی.... .... کان کی راہ سے یہ آواز براہِ راست دل تک پہنچ رہی تھی، پلٹ کر

دیکھا تو جگرؔ مراد آبادی تھے جو پر اعتماد، باوقار، ترنم بیز، جادو بھرے لب و لہجہ میں نمناک آنکھوں کے ساتھ فرما رہے تھے : ؎

چمن کے مالی، اگر بنالیں موافق اپنا شعار اَب بھی
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اَب بھی

زمین بدلی، زمانہ بدلا، مگر نہ بدلے تو وہ نہ بدلے
جو تنگ و تاریک ذہنیت تھی، وہی ہے بر روئے کار اَب بھی

جو محوِ جشنِ نظامِ نو ہیں، پکار کر ان سے کہہ رہا ہوں
یہ جان ہے سوگوار اَب تک، یہ دل ہے ماتم گسار اَب بھی

وسیع مسلک، رفیع فطرت، خلوصِ ایماں خلوصِ نیّت
انہیں فضائل پہ ہے وطن کے وقار کا انحصار اَب بھی،

کال کرے سو آج کر، آج کرے سو اب

کبیر (انتقال ۱۵۱۸ء) تاریخ کا افسانوی شخص ہے، اس کی شخصیت پر عقیدت کا رنگ کچھ اس طرح چڑھایا گیا ہے کہ حقیقت بہت حد تک گم ہو کر رہ گئی ہے، کبیر پیدا ایک مسلم گھرانے میں ہوئے، تعلیم رامانند سے حاصل کی جو وشنو جی کے پجاری تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے ہندو اور مسلم دونوں کو اپنانا چاہا، یہی وجہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں ان کو اپنا بزرگ مانتے ہیں، اور یکساں اس کے تئیں اپنے دل میں احترام کا جذبہ رکھتے ہیں، بیان کیا جاتا ہے کہ انتقال کے بعد ہندو مسلمانوں میں جھگڑا ہو گیا کہ لاش کو جلایا جائے یا دفن کیا جائے، اچانک لاش غائب ہو گئی اور میت کی جگہ چند پھول پائے گئے جن کو ہندوؤں نے جلایا، اور بنارس میں ایک مندر بنا کر کبیر چورا ہا اس کا نام رکھ دیا، اور مسلمانوں نے گلور میں جو گورکھپور کے نزدیک ہے، قبر بنائی، کبیر پنتھی ان دونوں مقامات کی زیارت کے لئے جاتے ہیں۔

کبیر کے عقیدے، نظریئے، مذہب اور فکر و فلسفہ کے بارے میں بہت کچھ گفتگو کی گنجائش ہے، تاہم خدا کی بے پناہ محبت ان کے دل میں ہے، اور انسان دوستی کا پیغام انہوں نے نہایت اونچے سُر سے دیا

ہے، ان کے دوہے اور بھجن اپنے اندر بڑی تاثیر رکھتے ہیں، ان کی شاعری سے ان کی عرفانی اور وجدانی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے، ان کی شخصیت اور کلام میں صوفی اور بھگت کی ملی جلی خوبو ہے۔

کبیر نے اپنے کلام میں جہاں بہت ساری چیزوں کے بارے میں اخلاقی درس دیا ہے، اس کے ساتھ انہوں نے یہ بھی پیغام دیا ہے کہ کاہلی، سستی اور غفلت کو چھوڑو، آج کا کام کل پر مت ڈالو، اگر تم کوئی کام کل کرنا چاہتے ہو تو کمر ہمت کسو، اور کل کا کام آج ہی کرلو، اور اگر کسی کام کو آج انجام دینے کا ارادہ ہے تو اٹھو اٹھو ابھی کرلو، معلوم نہیں کل پر جس کام کو تم ٹال رہے ہو، وہ کل تمہاری زندگی میں آئے، یا نہیں آئے، اور آج شام جس کام کے کرنے کا ارادہ ہے، وہ شام تمہاری زندگی کی گزری صبح کی سرحد سے ملے یا نہ ملے، زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، آدمی تو بلبلا ہے پانی کا، جہدِ مسلسل اور سعیِ پیہم کے خوگر رہو، موت کا دھیان رکھو، اور قیامت پر نظر رہنی چاہیے، عبادت و ریاضت اور ذکر و شغل میں بھی کاہلی اور غفلت سے کام مت لو، اس راہ میں بھی اپنی چاق و چوبندی اور سرگرمی دکھاتے رہو۔

یہی وہ پیغام ہے جس کو کبیر اپنے اس شعر میں دینا چاہتے ہیں، جس کے پہلے مصرعہ کو میں نے عنوان بنایا ہے، اور یہ مصرعہ محاورہ کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے، کبیر کہتے ہیں ؎

کال کرے سو آج کر، آج کرے سو اب
پل میں پرلے ہوئے گی بہوری کرے گا کب

(جو کچھ کل کرنا چاہتا ہے، وہ آج کرلے اور آج کا کام ابھی، دم بھر میں

تو قیامت ہو جائے گی، پھر کب کرے گا)۔

کبیر کو صنعت تکریر اور الفاظ سے معنوی خوبی پیدا کرنے میں یدِطولیٰ حاصل ہے، وہ اپنے اسی پیغام کو اس طرح دہراتے ہیں ؎

کال کرے سو آج کر، آج ہے تیرے ہاتھ
کال کال تو کیا کرے، کال کال کے ساتھ

(جو کچھ تجھے کل کرنا ہے، آج کر لے، آج تیرے ہاتھ ہے، تو کل کل کیا کرتا ہے، کل تو کال یعنی موت کے ساتھ ہے)۔

کبیر اپنے اس مفہوم کو اس طرح بھی ادا کرتے ہیں ؎

آج کہے میں کال بھجوں گا، کال کہے پھر کال!
آج کال کے کرت ہی اوسر جاسی چال۔

(آج کہتا ہے میں کل عبادت کروں گا، پھر کل کہہ دیتا ہے کہ کل، اِس آج کل ہی میں زندگی ختم ہو جائے گی)۔

کبیر کہتے ہیں کہ جسم و جان پر قبضہ و اختیار تمہارا نہیں ہے، اس لئے جسم و جان کو سستی میں ڈال کر کام اور عبادت سے غافل نہ ہو جا، مدام چلتے رہو، اور جسم و جان کو پھرتی میں لاکر اسے استعمال کرتے رہو۔

تو مت جانے باورے میرا ہے سب کوئے
پنڈ پران سے بندھ رہا سو نہیں اپنا ہوئے

(اے نادان! یہ نہ سمجھ کہ سب کچھ تیرا ہے، جسم تک جو جان سے وابستہ ہے، وہ بھی تیرا نہیں ہے)

کبیر نے غفلت اور سستی کی کچھ تفصیل اور اس کا مآل بھی بیان کیا ہے، وہ کہتے ہیں ؎

رات گنوائے سوئے کے دوس گنوایا کھائے
ہیرا جنم امول ہے، کوڑی بدلے جائے

(رات سوکر گزاردی، اور دن خورد و نوش میں، زندگی انمول ہیرا تھی، جس کو دو کوڑی کی کردی)۔

کبیر نے ایک شاعر کی حیثیت سے جو کچھ کہا ہے، وہ بلاشبہ قابلِ توجہ اور لائقِ التفات ہے، شخصی زندگی میں ان کے اس فلسفہ کو بنیاد بناکر ہم آگے بڑھتے ہیں تو احترام الدین احمد شاغل یہ کہتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔

مکن برباد آبِ زندگی در خواب و خور ہرگز
کہ ایں آبیست ناید باز چوں از بحر شد بیروں

(خواب و خور میں زندگی ہرگز برباد نہ کر، کیوں کہ یہ وہ پانی ہے جو دریا سے جاکر واپس نہیں آتا)۔

راسخ کی یہ نصیحت بھی خوب ہے ؎

ہر چند کارِ فرداست امروز مفت خود گیر
شاید دماغِ فرصت وقتِ دگر نباشد

(اگرچہ کل کے کرنے کا کام ہے، مگر آج کرلے تو مفت ہے، شاید کل تجھے کام کرنے کا موقع ہی نہ ہو)۔

نعمت علی خان کا شعر ہے ؎

من نمی گویم زیاں کن یا بفکرِ سود باش!
اے ز فرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش

(میں نہیں کہتا کہ اپنا نقصان کر، یا نفع کی فکر میں رہ، اے فرصت کی اہمیت سے بے خبر، جو کچھ کرنا ہے جلد کر)۔

ایک شاعر ہیں ریحانؔ دیکھئے وہ بے خبر کو کس طرح باخبر کرتے ہیں ؎

اے بے خبر حیات کا کیا اعتبار ہے
ہر وقت موت سر پہ بشر کے سوار ہے

شاعر خود چونک کر چونکا رہا ہے ؎

طے ہو رہی ہے منزل چونکو کہ وقت کم ہے
ملکِ فنا کی جانب ہر سانس اک قدم ہے

حالیؔ دنیا کا حال بیان کرتے ہوئے یہ پیام دیتے ہیں ؎

یاں رہنے کی مہلت کوئی کب پاتا ہے
آتا ہے اگر آج تو کل جاتا ہے

جو کرنے ہیں کام ان کو جلدی بھگتاؤ
طلبی کا پیام وہ چلا آتا ہے

حالیؔ کی یہ نصیحت بھی کس قدر کارگر ہے ؎

دنیا کو ہمیشہ نقشِ فانی سمجھو
رودادِ جہاں کو اک کہانی سمجھو

پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا
ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

دنیا کے اس باغ و بہار کی مدت بہت کم ہے، اس لئے اس پر نظر رکھ کر ایک ایک لمحہ کی قدر کرنی چاہیئے، اور قوت کے ساتھ اپنا کام کئے جانا چاہیئے، بقول شاعر ؎

لمحے کو زندگی کے لئے کم نہ جانئے
لمحہ گزر گیا تو سمجھئے صدی گئی!

شاہد صدیقی نے بھی اپنے درجِ ذیل شعر میں یہی پیغام دیا ہے ؎

ایک پل کو رکنے سے دور ہو گئی منزل
صرف ہم نہیں چلتے راستے بھی چلتے ہیں

نظیر اپنے بے نظیر انداز میں اس حقیقت کو اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

دیکھ لے اس چمنِ دہر کو دل بھر کے نظیر
پھر ترا کاہے کو اس باغ میں آنا ہوگا

امیر مینائی توجہ دلاتے ہیں ؎

پھول اے بلبل نہ پھولوں پر دو روزہ ہے بہار
ایک جھونکے میں ہوا سب رنگ و بو ہو جائے گا

انہیں کا ایک دوسرا شعر ہے ؎

عزیز احباب ساتھی دم کے ہیں سب چھوٹ جاتے ہیں
جہاں یہ تار ٹوٹا، سارے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں

غفلت، کاہلی، اور سستی سے باز آنے کے لئے زاہد سہارنپوری اپنے زاہدانہ انداز میں اس طرح توجہ دلاتے ہیں ؎

ہم رہے سرمستِ غفلت صبح پیری آگئی
پڑ کے ایسے سوئے سر پر آفتاب آ ہی گیا

ایک انسان کو چاہیئے کہ قوت اور ہمت کے ساتھ اپنے کام میں لگا چمٹا رہے، سستی اور غفلت سے کام نہ لے، سورج کے قدرتی نظام کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے صائب کس قدر صائب رائے دیتے ہیں ؎

بمغرب می تواند رفت دریک روز از مشرق
گزار دہر کہ چوں خورشید گام آہستہ آہستہ

(مشرق سے مغرب میں ایک دن میں پہونچا جا سکتا ہے، اگر آفتاب کی طرح آہستہ آہستہ چلتا رہے)۔

اقبال زندگی کو سن و سال میں قید کرنا نہیں چاہتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہر عمر میں کام کرنے کا جوش و ولولہ رہنا چاہیئے ؎

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

چکبست ایک انسان کو شکست سے بچانے کے لئے اس کی ہمت اس طرح بندھاتے ہیں ؎

اہلِ ہمت منزلِ مقصود تک آ ہی گئے
بندہ تقدیر قسمت کا گلہ کرتے رہے

فانی کا یہ لافانی شعر دیکھئے ؎

ناکام ہے تو کیا ہے کچھ کام پھر بھی کر جا!
مردانہ وار جی اور مردانہ وار مرجا

جگر، جگر کاوی کا فن اس طرح سکھاتے ہیں ؎

نتیجہ زندگانی کا ہے، کچھ دنیا میں کر جانا!
خیالِ موت بے جا ہے، وہ جب آئے تو مر جانا

وہ لوگ جو اپنے سینہ میں عزم محکم رکھتے ہیں، پختہ طبیعتوں کے حامل ہوتے ہیں، ان کی زندگی کوہسار ہوتی ہے، بقول شاعر ؎

پختہ طبیعتوں پر حوادث کا اثر ہوتا نہیں
کوہساروں میں نشانِ نقشِ پا ملتا نہیں

بہرحال کام دین کا ہو یا دنیا کا، آپ اسے نشاط، مستعدی اور چستی سے

کرتے رہیے، غفلت، سستی اور کاہلی کو قریب نہ آنے دیجئے، یہ مرض شخصی زندگی میں عام ہوگیا ہے، چونکہ معاشرہ اور سماج افراد اور اشخاص کے مجموعہ کا نام ہے، اس لئے آج کل پورا معاشرہ اور سماج اس لپیٹ میں آگیا ہے، بعض عرب اور مسلم ممالک میں بھی اس مرض کی شدت بڑھی ہوئی ہے، کاہلی، سستی، بے اعتنائی اور لاپرواہی کا مشاہدہ ان کے ایرپورٹ کے عملہ سے بھی ہوتا ہے (دوبئی ایرپورٹ کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا جاسکتا ہے) ان ممالک میں غرض مند کو "تعال بکرۃ" (کل آیئے) کا جملہ اکثر سننا پڑتا ہے، جس کا شکوہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی اپنے ایک سفرنامہ میں کیا ہے، بلاشبہ یہ بہت بڑا مرض ہے، جس سے سماج انحطاط پذیر ہوتا ہے، اس مرض کا علاج قوتِ کارکردگی، ارادہ کی پختگی اور عزمِ راسخ ہی سے ہوسکتا ہے، گناہوں، بدکاریوں، فضولیات اور لغویات میں زندگی گزارنے سے اچھے مقصد کے حصول میں انسان ناکام ہوتا ہے، عبادت کا ذوق وشوق جاتا رہتا ہے، اور اس کے اندر کاہلی آتی ہے، اور کاہلی بتدریج زوال اور انحطاط کی طرف لے جاتی ہے اور چستی اور مستعدی عروج اور ترقی کی سمت رواں دواں رکھتی ہے۔

قرآن وحدیث میں کاہلی کی تمام تر صورتوں اور نوعیتوں سے بچنے کی بزور تاکید کی گئی ہے، اور ایمان واعتقاد کو صحیح اور مضبوط کرنے کی تلقین کی گئی ہے، جو نشاط، مستعدی اور چستی کے لئے منبع اور سرچشمہ کی حیثیت رکھتا ہے، سب سے بڑے معلّمِ اخلاق محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دعا میں خصوصیت کے ساتھ "کاہلی اور کسلمندی" سے پناہ مانگی ہے، اور بزرگوں نے اہلِ ہمت اور اصحابِ عزم کی صحبت میں بیٹھنے کی

نصیحت کی ہے تاکہ بیٹھنے والوں میں عزم و ہمت آئے، ایک ماہرِ نفسیات ڈیلی کارنیگی نے بھی بجا طور پر لکھا ہے:

"اپنی زندگی کا کوئی مقصد متعین کیجئے، جب مقصد معین کرلیں تو اس کے حصول کے لئے بھرپور جدوجہد کیجئے، جب ایک مقصد حاصل ہو جائے تو کوئی اور مقصد سامنے رکھ لیجئے، اور اس کے حصول کے لئے جدوجہد شروع کر دیجئے، خود کو شوق اور ولولے کی اہمیت سمجھائیے، اور ایسے لوگوں کی صحبت میں بیٹھئے جو شوق اور ولولہ رکھتے ہوں، اپنے کام کے بارے میں پوری معلومات حاصل کیجئے، جو مقصد سامنے رکھ لیا ہو اس پر قائم رہئے، خود سے روزانہ باتیں کیجئے، خدمت کا جذبہ بیدار کیجئے، خود غرضی سے کام نہ لیجئے۔" (کامیابی کے راز صفحہ ۱۵۲ مطبوعہ لاہور)

اس پسِ منظر میں شاعر کا یہ شعر نہایت فکر انگیز ہے ؎

غور سے دیکھا، نظامِ دہر تو ثابت ہوا
آدمی پیدا ہوا ہے کام کرنے کے لئے

ایک اور شعر کی معنی خیزی پر بھی نگاہ ڈال لیجئے ؎

خدا حامی ہے کارِ خیر میں مردانِ ہمت کا
زمانہ کچھ کہے بندہ تو اپنا کام کرتا ہے

جو لوگ اپنی زندگی میں بامراد اور شاد کام رہنا چاہتے ہیں، ان کے دل کو شاد کا یہ شعر شاد کرے گا ؎

بارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

اُردو ادب اور اُردو شاعری سے جن لوگوں کو لگاؤ اور تعلق ہے، وہ ولی محمد نظیر اکبرآبادی (۱۷۴۰ء ــ ۱۸۲۵) سے خوب واقف ہیں، ادب نواز حلقوں اور جوہر شناس نگاہوں نے ان کی شاعرانہ عظمت کا کھل کر اعتراف کیا ہے، ان کے بعض اشعار تو زبان زد عام ہیں اور "ضرب المثل" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً ؎

نیکی کا بدلہ نیک ہے، بدکر بدی کو سات لے
کانٹے لگا کانٹے پھلیں پھل پات بو پھل پات لے

کل جگ نہیں کر جگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے، اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

کچھ دیر نہیں، اندھیر نہیں، انصاف اور عدل پرستی ہے
اِس ہاتھ کرو، اُس ہاتھ ملے، یاں سودا دست بدستی ہے

گر شال اُڑھائی تو اسی شال میں خوش ہیں پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں

راضی ہم اسی میں، جس میں تیری رضا ہے
یا یوں بھی واہ واہ ہے، اور یوں بھی واہ واہ ہے

ع سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

اُردو انسائیکلو پیڈیا (فیروز سنز) نے نظیر اکبر آبادی کے بارے میں جو معلومات بہم پہنچائی ہیں، وہ یہ ہیں:-

"دہلی میں پیدا ہوئے، احمد شاہ ابدالی کے حملے کے وقت آگرہ چلے آئے اور محلہ تاج گنج میں سکونت اختیار کی، خوش نویسی میں ماہر تھے، معلّمی پیشہ تھا، اوائلِ عمر میں اتالیقی کی خدمت پر متعین ہوئے مگر چند روز کے بعد واپس آگئے، آزاد مزاج اور قانع درویش تھے، نواب سعادت علی خاں کے بلانے پر لکھنؤ گئے، نہایت انسانیت دوست اور وسیع المشرب تھے، اپنے دور کے شعراء کے برخلاف مناظرِ قدرت، ہندو مسلمانوں کے مذہبی تہواروں، میلوں ٹھیلوں، سیر تماشوں، موسموں، پرندوں، جانوروں نیز دوسرے عنوانات پر بکثرت نظمیں لکھیں، آخر عمر میں فالج میں مبتلا ہو گئے، سو برس کی عمر میں انتقال کیا اور تاج گنج میں دفن ہوئے، دو لاکھ سے زائد اشعار کہے، بیشتر ضائع ہو گئے، موجودہ کلام چھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے، پہلے نول کشور پریس میں طبع ہوا تھا، پھر پروفیسر عبدالغفور شہباز نے از سرِ نو مرتب کر کے شائع کرایا، دیوان بھی دستیاب ہو کر چھپ گیا ہے، بول چال کی زبان میں شعر کہتے تھے، خیالات میں عام انسانوں سے محبت اور یگانگت جھلکتی ہے۔"

(اُردو انسائیکلو پیڈیا صفحہ ۹۹۶)

یہ ہے نظیر اکبر آبادی کی شخصیت اور ان کے فن کا مختصر تعارف، اس کے بعد ہم آگے بڑھتے ہیں اور ایک کتاب سامنے لے آتے ہیں، جس کا نام "زندگانی بے نظیر" ہے، جسے ترقی اردو بیورو نئی دہلی نے ۱۹۸۱ء میں شائع کیا ہے، کتاب کے مصنف پروفیسر سید محمد عبد الغفور شہباز ہیں (۳۸۸) صفحات پر مشتمل اس کتاب میں نظیر اکبر آبادی کے حالات بیان کئے گئے ہیں، ان کی شاعری پر تبصرہ کے ساتھ نمونہ کے طور پر ان کے بہت سے اشعار بھی پیش کئے گئے ہیں، راقم الحروف جب اس کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا تو صفحہ (۳۶۶) پر ذکر کردہ ایک شعر نگاہوں کی راہ سے دل میں اتر گیا اور زبان گویا ہوئی کہ "بلاشبہ نظیر کا یہ شعر بے نظیر ہے"۔ لیجئے، آپ بھی پڑھئے:۔

؎ جتنے سخن ہیں سب میں ہے یہی سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

انسان کی خواہشیں بے شمار ہیں، تمناؤں کی کوئی حد نہیں ہے، آرزو ہے کہ ہر وقت سینہ میں مچلتی رہتی ہے، لیکن تمام خواہشوں اور تمناؤں اور آرزوؤں میں سب سے بنیادی خواہش، تمنا اور آرزو جو ہو سکتی ہے وہ وہی ہے جس کا ذکر نظیر اکبر آبادی نے اپنے مذکورہ بالا شعر میں کیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تمام عمر اور پوری زندگی میں "آبرو" اور "تندرستی" سے رکھے، انسان کو اپنی زندگی میں اپنے خالق اور پالنہار کی طرف سے بے شمار نعمتیں ملتی ہیں، الگ الگ ان نعمتوں کا ذکر بے بس انسان کے بس میں کہاں ہے؟ تاہم ان نعمتوں کو "آبرو" اور "تندرستی" کے دو جلی عنوان کے تحت بیان کیا جا سکتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو نظیر نے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے اور دو لفظوں میں وہ ساری باتیں کہہ دی

ہیں جو ایک بڑے دفتر میں بھی بیان نہیں کی جا سکتی۔

پہلی خواہش آبرو کی ہے، یہ ایک جامع لفظ ہے جس میں دینی اور دیگر ہر طرح کی "آبرو" سمٹ کر آ گئی ہے، اہلِ لغت نے اس لفظ کو فارسی بتایا ہے اور معنیٰ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے "منہ کا نور، چہرہ کی چمک، پیشانی کی دمک، عزت، حرمت، شرف، بزرگی، قدر و منزلت، ناموری، شہرت، نیک نامی، رتبہ، مرتبہ، درجہ، منصب، جاہ و جلال، ظاہری شان و شوکت، حیا، شرم، ساکھ، اعتبار، بھرم۔

ایک قدیم کتاب "گنجینۂ اقوال و خزینۂ امثال" میں اس لفظ سے متعلق بعض محاورے نقل کیے گئے ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں:۔

"آبرو بڑی دولت ہے" یعنی آبرو سے بڑھ کر دنیا میں کوئی دولت نہیں ہے، جان سے بھی زیادہ قابلِ قدر ہے ——— "آبرو پر پانی پڑ گیا" "آبرو پر حرف آ گیا" مطلب یہ ہے کہ قدر و عزت جاتی رہی، بات بگڑ گئی، مرتبہ گھٹ گیا، خوار و ذلیل ہو گئے۔ "آبرو جا کے نہیں آتی" مراد یہ ہے کہ عزت ایسی چیز نہیں ہے کہ کھونے کے بعد پھر مل جائے۔ "آبرو جان سے زیادہ عزیز ہے" مقصد یہ ہے کہ آبرو کے آگے جان جیسی شئی بھی ہیچ و بے قدر ہے۔ "آبرو جگ میں رہے تو بادشاہی بوجھیے" بتانا یہ ہے کہ دنیا میں عزت و آبرو سے رہنا بادشاہت کے برابر ہے۔ اسی طرح یہ بھی کہتے ہیں "آبرو جگ میں رہے تو جان جانا پشم ہے" اس سے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ عزت پر جان سی شئی بھی صدقہ ہے۔ ایک محاورہ یہ بھی ہے کہ "آبرو موتی کی سی آب ہے" یعنی ذرا سے میں آدمی کی آبرو جاتی رہتی ہے، عزت نہایت

نازک چیز ہے، اسے شیشہ کی طرح بچا بچا کر رکھنا پڑتا ہے کہ کہیں اس پر بال نہ آجائے یا ٹوٹ نہ جائے۔

(گنجینۂ اقوال و خزینۂ امثال صفحہ ۳، ۲)

آبرو کے لفظ کو شعراء نے اپنے کلام میں بکثرت استعمال کیا ہے صرف چار شعر ملاحظہ فرمائیے۔ آثر لکھنوی کہتے ہیں:۔

اے چشم اس کے سامنے رو کے نہ ہو سبک
انساں کی آبرو جو ہے موتی کی آب ہے

بلبل تخلص اختیار کرنے والے شاعر کا شعر ہے ؎

آبرو جنسِ گراں ہے کہیں بے کار نہ جائے
آپ لے لیں تو یہ سودا سرِ بازار نہ جائے

معنیٰ و مفہوم کی عظیم دنیا بسائے ہوئے غالب کہتے ہیں:۔

؎ ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

امانت نے اپنی شعری امانت اس طرح پہنچائی ہے:۔

؎ خدا دے آبرو جس کو وہی دانائے دنیا ہے
حقیقت کی طرف دیکھو گہر ایک بوند پانی ہے

اِن تفصیلات نے "آبرو" کی حقیقت کو آپ پر واضح کر دیا ہوگا اور یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ "آبرو" ایک "متاعِ عزیز" اور "جنسِ گرانمایہ" ہے جس سے انسان کو خاندان اور سماج میں وقار اور رتبہ حاصل ہوتا ہے اگر اس دولت کو انسان گم کر دے تو خاندان اور سماج کی نظر میں گر جاتا ہے اور اس کی یہ بے وزنی اور بے حیثیتی مسلسل گراوٹ کی طرف لاتی

رہتی ہے۔

آبرو کیا چیز ہوتی ہے اور اس کا لحاظ اور خیال کرنے والے لوگ کیسے ہوتے ہیں؟ اسے آپ ایک واقعہ سے سمجھ سکتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ محدث کبیر حضرت امام بخاریؒ کو تحصیلِ علم کے زمانہ میں ایک دفعہ دریا کا سفر پیش آیا، ان کے پاس ایک ہزار اشرفیاں تھیں، جہاز میں ایک آدمی ان سے بہت گھل مل گیا، وہ خدمت میں حاضر ہوتا اور حسنِ عقیدت کا اظہار کرتا، امام صاحب کو بھی اس آدمی سے ایک گونہ انس ہو گیا۔ انہوں نے ایک دن اس پر اعتماد کرتے ہوئے اپنی اشرفیوں کی اطلاع کر دی تاکہ بوقتِ ضرورت یہ اشرفیاں ان کے بھی کام آسکیں، لیکن یہ آدمی تھا بڑا مکار اور چالباز، اشرفیاں دیکھتے ہی اس کے منہ میں پانی بھر آیا اور کسی طرح ان اشرفیوں کو اپنے قبضہ میں لینے کی ٹھان لی، ایک دن جب وہ سو کر اٹھا تو نہایت زور و شور سے رونے اور چلانے لگا، اپنا سر اور کپڑے بھی پھاڑنا شروع کر دیا، لوگ دوڑے اور سبب دریافت کیا مگر بجائے وہ کچھ کہتا اور بھی چیختا چلاتا گیا، لوگوں نے جب بہت اصرار کیا تو بھرائی ہوئی آواز میں اس نے کہا "میرے پاس ایک ہزار اشرفی کی تھیلی تھی وہ گم ہو گئی"، لوگوں کو اس پر رحم آگیا اور تھیلی کا نشان پتہ پوچھ کر مسافروں کے سامان کی تلاشی شروع کر دی۔

اس سے پہلے کہ تلاشی میں حضرت امام بخاریؒ کی باری آئے، انہوں نے چپکے سے اشرفیوں کی تھیلی دریا میں ڈال دی، دوسری طرف یہ آدمی امام صاحب کی باری کا بے چینی سے منتظر تھا، اس وقت اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب امام صاحب کے پاس وہ تھیلی نہیں نکلی جسے دیکھ کر حاصل

کرنے کے لئے اس نے یہ چال چلی تھی، جب تمام لوگوں کے سامان کی تلاشی لی گئی اور کہیں سے وہ تھیلی نہیں نکلی تو لوگوں نے لعن طعن شروع کر دیا کہ خواہ مخواہ تم نے سب کو پریشان کر دیا۔

جہاز جب ساحل پر لنگر انداز ہوا اور لوگ اتر کر اپنی اپنی منزل کی طرف جانے لگے تو یہ آدمی اترتے ہی امام صاحب کے پیچھے ہو گیا، اس نے امام صاحب سے کچھ دیر کے لئے تنہائی میں ملنے کی خواہش کی، امام صاحب نے اپنی عالی ظرفی سے وقت عنایت فرمایا۔

"آپ نے اشرفیوں کی وہ تھیلی کیا کی؟ تعجب سے اس نے پوچھا"

"میں نے اسے دریا میں ڈال دیا" امام صاحب نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

"آپ کے دل نے اتنی خطیر رقم ضائع کرنا کیوں کر گوارا کر لیا؟" اس نے تاسف کے لب ولہجہ میں دوبارہ سوال کیا۔

"تمہاری عقل کو کیا ہوا؟ تم نہیں جانتے کہ میں نے اپنی تمام عمر حدیث کی طلب میں لگائی ہے، میری ثقاہت عالم میں مشہور ہے، میری آبرو کے شیشہ پر اب تک کوئی دھبہ نہیں پڑا اور بال نہیں آیا، کیا میرے لئے چوری کا اشتباہ لینا کسی طرح بھی مناسب تھا، جس دولت (ثقاہت) کو میں نے تمام عمر میں حاصل کیا ہے اور اپنی آبرو کی ہر طرح حفاظت کی ہے، اسے چند اشرفیوں کے عوض کھو دیتا، امام صاحب نے پورے جوش واعتماد کے ساتھ اس سے فرمایا۔

بالآخر وہ آدمی خفت وندامت کی ٹوکری سر پر لادے ہوئے چلتا بنا مگر امام صاحب اپنے کردار کی عظمت کا نشان رہتی دنیا تک

چھوڑ گئے اور اس حقیقتِ حدیث کو سمجھا گئے کہ "اپنے آپ کو تہمت کی جگہ سے بچاؤ اور اپنی آبرو کو کسی خطرہ میں مت ڈالو"

یہ بات ہوئی "آبرو" سے متعلق، جہاں تک تعلق "تندرستی" کا ہے تو یہ لفظ بھی فارسی ہے، جس کے معنی صحت، سلامتی اور درستی کے ہیں مشہور مقولہ ہے "تندرستی ہزار نعمت ہے" یعنی دنیا کی تمام نعمتوں پر تندرستی کو فوقیت حاصل ہے، انسان لاکھ مالدار ہو، دولت سے اس کو کیا فائدہ جب کہ وہ بیمار ہو۔ یہ مقولہ دراصل غالب کے ایک شعر کا مصرعہ ہے، پورا شعر اس طرح ہے ؎

تنگدستی اگر نہ ہو غالب
تندرستی ہزار نعمت ہے،

بعض اہلِ علم نے غالب سے معذرت کے ساتھ پہلے مصرعہ میں تھوڑی سی ترمیم کی ہے اور "اگر نہ ہو" کی جگہ انہوں نے "اگرچہ ہو" کہا ہے، یعنی ؎

تنگدستی اگرچہ ہو غالب
تندرستی ہزار نعمت ہے

ہادیٔ اعظم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "دو نعمتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں اکثر لوگ دھوکے میں مبتلا ہیں، ایک تندرستی اور دوسری فراغت ——————— (بخاری)

حقیقت یہ ہے کہ تندرستی اور فراغت دونوں عظیم نعمتیں ہیں، مگر بسا اوقات یہ نعمتیں اچانک چھین لی جاتی ہیں، اس وقت انسان کو اس کی قدر معلوم ہوتی ہے۔ ایک دوسری حدیث میں مزید وضاحت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے

غنیمت جانو، بڑھاپے سے پہلے جوانی کو، بیماری سے پہلے تندرستی کو، فقر و افلاس سے پہلے مالداری کو، تفکرات میں پھنسنے سے پہلے فراغت کو اور موت سے پہلے زندگی کو۔" (ترمذی)

ایک دوسری حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ "قیامت کے دن سب سے پہلے بندے سے نعمتوں کے بارے میں جو سوال کیا جائے گا وہ یہ ہوگا کہ "کیا ہم نے تیرے بدن کو تندرستی نہیں عطا کی تھی اور تجھ کو ٹھنڈے پانی سے سیراب نہیں کیا تھا؟" (ترمذی) ایک اور حدیث میں ہے کہ ضعیف، کمزور اور غیر صحت مند مؤمن سے قوی، توانا اور صحتمند مؤمن بہتر ہے۔" (مشکوٰۃ) یہی وجہ ہے کہ بہت سے علماء اور قائدین کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے اپنی صحت اور تندرستی بحال رکھنے کے لئے ایک مقررہ وقت میں چہل قدمی اور جسمانی ورزش کو اپنی زندگی کا معمول بنائے رکھا جس سے اپنے اندر کافی فائدہ محسوس کیا، اس میں کوئی شک نہیں کہ صحتمند اور تندرست آدمی دین و دنیا کا جتنا بہتر طریقہ پر کام کرسکتا ہے غیر صحتمند اور غیر تندرست آدمی اس معیار اور پیمانہ کا کام نہیں کرسکتا، اسی لئے اسلام میں "حفظانِ صحت" کا ایک مکمل نظام ہے، جس میں ان تمام امور کی کامل رعایت رکھی گئی ہے جن کی آج کی دنیا میں "محکمۂ صحت" اور "بلدیہ" کی جانب سے مختلف انداز سے تشہیر کی جارہی ہے، صحت کا راز اخلاقی زندگی کی بہتری اور مکان، باغ، سڑک، تالاب، گلی اور ماحول وغیرہ کی صفائی، ستھرائی، جسم کی نظافت، اچھی غذا اور بہتر پانی کے استعمال میں بھی پوشیدہ ہے، اسلام نے ان سارے پہلوؤں کی طرف اس قدر تفصیل کے ساتھ توجہ دلائی ہے کہ اس سے بہتر تعلیمات کی توقع

نہیں رکھی جاسکتی، اس سلسلہ میں اس کی باریک بینی کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ حضرت ابوقیسؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوئے جب کہ آپؐ خطبہ دے رہے تھے، وہ دھوپ میں کھڑے ہوکر آپ کا خطبہ سننے لگے تو آپؐ نے فرمایا کہ دھوپ سے سایہ کی طرف آجاؤ" (الادب المفرد) ۔۔۔ اس سے جہاں آپؐ کی محبت وشفقت کا حال معلوم ہوتا ہے، اس کے ساتھ اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ معمولی سی معمولی باتوں میں بھی آپؐ یہ خیال رکھتے تھے کہ کسی کو نقصان نہ پہنچ جائے، اور دھوپ میں کھڑے رہنے سے "جسمانی مضرت" کا جو خطرہ تھا اور حفظانِ صحت کے اصول سے جو غلط تھا، اس پر بھی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی کتنی گہری نظر تھی ——— تمام تر احتیاطی تدابیر کے باوجود کوئی بیمار ہوجائے تو حدیث میں دوا اور علاج کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور یہ فرمایا گیا کہ "کوئی ایسا مرض نہیں ہے جس کی شفاء (اور دوا) اللہ تعالیٰ نے نازل نہ کردی ہو، جس سے یقیناً عصر حاضر کی میڈیکل سائنس کو تلاش وجستجو اور تحقیق کا حوصلہ ملتا ہے۔ نذر اور منت (جس میں شرعی تعلیمات کی نزاکت کے ساتھ پوری رعایت ہو) اور صدقہ وخیرات کے ذریعہ بھی بیماری کو دور کرکے تندرستی کی طرف آنے کی ہدایت دی گئی ہے۔

تندرستی کے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے مجھے اس وقت تلوک چند محروم یاد آرہے ہیں، انہوں نے اپنی بیش بہا کتاب "بہارِ طفلی" میں "تندرستی" کا عنوان قائم کرتے ہوئے بچوں کے لئے نظم (مخمس) لکھی ہے لیکن وہ بڑوں کے لئے بھی مفید ہے، اس نظم کے چند

اشعار یہ ہیں :-

کوئی کہتا ہے کہ دنیا میں ہے دولت اچھّی
ہے کسی شخص کی دانست میں حکمت اچھّی
کوئی کہتا ہے کہ اچھی ہے تو طبیعت اچھّی
کوئی کہتا ہے کہ اچھی ہے تو صورت اچھّی
میں یہ کہتا ہوں کہ ہر اک شئی سے ہی صحت اچھّی

نہیں صحت کے برابر کوئی نعمت ہرگز
ہو نہ صحت تو میسّر نہ ہو راحت ہرگز
مال دے دِل کو خوشی اور نہ دولت ہرگز
دل میں باقی نہ رہے زیست کی چاہت ہرگز
کچھ بھی اچھا نہیں جب تک نہیں صحت اچھّی

قدرِ صحت کوئی بیمار کے دل سے پوچھے
حالِ پُرغم کوئی بیمار کا جاکر دیکھے
یوں وہ کہتے ہیں جو اس چیز کو ہیں کھو بیٹھے
زندگانی کا مزہ گر ہے تو ہے صحت سے
اچھّی ہر چیز ہے جب تک کہ ہے صحت اچھّی

گر یہ چاہو کہ بڑے ہو کے بنو با اقبال
اپنی صحت کا تمہیں چاہیئے ہر وقت خیال
پھر نہ پاس آئیں گے اندوہ و غم و رنج و ملال
دل لگا کر جو کرو علم کو حاصل مہ و سال
جی نہ اکتائے گا جب تک کہ ہے صحت اچھّی

بہرحال اپنی "آبرو" (وسیع تر معنی و مفہوم میں) کو بحال اور اپنی تندرستی (جسمانی و روحانی) کو برقرار رکھنا نہایت ضروری ہے، اس میں کسی قسم کی کوتاہی روا نہیں رکھی جائے، جس نے آبرو کی دولت اور تندرستی کی نعمت پالی، اس نے اس دنیا کی بہت بڑی حقیقت پالی، یاد رکھئے "اَلنِّعْمَةُ اِذَا فُقِدَتْ عُرِفَتْ" یعنی نعمت کی سچی قدر اس وقت ہوتی ہے جب وہ جاتی رہتی ہے۔

زیر نظر مضمون کے لئے نظیر اکبرآبادی کے ایک شعر کو بنیاد بنایا گیا تھا اور اسی کے ایک مصرعہ سے عنوان بھی قائم کیا گیا، اب رخصت ہوتے ہوئے انہیں کا ایک دوسرا معنی خیز اور حقیقت افروز شعر زبان پر لے آئیے ؎

تندرستی کو نپٹ فضلِ الٰہی بوجھئے،
آبرو سے جگ میں رہنا بادشاہی بوجھئے

تندرستی ہزار نعمت ہے

اصل شاعر کی تلاش

نثری اور شعری دنیا میں ایک مضمون یا ایک شعر کی نسبت چند مضمون نگار یا چند شعراء کی طرف، کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں ہے، نثر میں ایک مثال "تذکارِ رمضان" کی دی جاسکتی ہے۔ اس عنوان سے لکھا ہوا یہ مضمون نہایت تفصیلی، تحقیقی، ادبی ہے اور رمضان المبارک کی عظمت و فضیلت کو مؤثر انداز میں ظاہر کرتا ہے مگر اس وقت آپ کی حیرت کی انتہا نہیں رہے گی، جب آپ یہی مضمون ایک لفظ کے الٹ پھیر کے بغیر مولانا ابوالکلام آزاد (۱۹۵۸ــــــ۱۸۸۸ء) مولانا سید سلیمان ندوی (۱۹۵۳ــــــ۱۸۸۴ء) اور مولانا عبداللہ عمادی (وفات ۱۹۴۷ء) سے منسوب ان کے مجموعۂ مضامین میں پائیں گے، کون نہیں جانتا کہ یہ یگانۂ روزگار ہستیاں ہیں اور ہم عصر اور ہم زمانہ بھی، کسی دوسرے کے مضمون کو اپنے نام سے شائع کرنے کا انہیں نہ شوق تھا نہ ان کے لئے اس کی ضرورت تھی، پھر ایسا کیوں؟ اس کی حقیقت یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی ادارت میں "الہلال" کے نام سے جو جریدہ نکلتا تھا، اس کے ادارتی بورڈ میں شامل اہلِ قلم کے مضامین اکثر بلا نام شائع ہوتے تھے، ایک تھوڑے سے عرصہ تک مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبداللہ عمادی اس کے

ادارتی بورڈ میں شریک رہے، بعد میں "الہلال" کے فائل سے منتخب کرکے جو مضامین شائع کئے گئے، ان میں سے بعض بیک وقت تینوں کی طرف منسوب ہوگئے، یہ دراصل عقیدتمندوں، انتخاب کرنے والوں اور شائع کرنے والوں کی غلطی تھی، جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے، تاہم مولانا سید سلیمان ندوی کی ایک تحریر اور ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ "تذکار رمضان" کے عنوان سے "الہلال" میں شائع ہونے والا مضمون مولانا سید سلیمان ندوی کا ہے، اس اظہارِ حقیقت سے ممکن ہے کہ مولانا آزاد اور مولانا عمادی کے عقیدتمندوں کے دل پر چوٹ لگے، اور اس کے ماننے کے لئے وہ تیار نہ ہوں، مگر اتنی بات تو ضرور ہے کہ یہ مضمون (تذکار رمضان) ان تینوں بزرگوں کے درمیان "نزاعی" بن گیا ہے، اور "حقیقت" اس نزاع میں دب کر رہ گئی ہے، اس لئے کسی جریدہ کی کسی زمانہ میں "مصلحت" کچھ بھی رہی ہو، مگر بعد کے واقعات بتاتے ہیں کہ اہم اور قابلِ ذکر مضامین کے ساتھ مضمون نگار کے نام ضرور ہونے چاہئیں تاکہ بعد میں ایسی کسی نزاعی شکل کی نوبت نہ آنے پائے۔ یہی حال اسلاف اور بزرگانِ دین کے اقوال وملفوظات کا ہے کہ ایک ہی قول اور ایک ہی ملفوظ کسی ادنیٰ فرق کے بغیر مختلف بزرگوں کی طرف منسوب ہے۔ یہ صورتِ حال اس وقت زیادہ پیش آتی ہے جب ایک آدمی کسی کی بات کو اپنی یادداشت اور حافظہ کی مدد سے بیان کرتا ہے اور صحیح طور پر صاحبِ ملفوظ کا نام اسے یاد نہیں رہتا، اس کے بعد غلط انتساب کا یہ سلسلہ ایسا چلتا ہے کہ اسے کوئی روکنا بھی چاہے تو نہیں روک سکتا، تاہم اس موقع پر اہلِ تحقیق کا تحقیقی چراغ

جو روشنی بکھیرتا ہے وہ غلط اور صحیح کے درمیان واضح لکیریں قائم کر دیتا ہے اور اہلِ بصیرت، بصیرت کے موتی چُن لیتے ہیں۔

ایک شعر کی نسبت متعدد شعراء کی طرف

نثر سے جب ہم شعر کی طرف آتے ہیں تو یہ "ادبی سانحہ" ہمیں یہاں زیادہ نظر آتا ہے۔ ایک شعر متعدد شعراء کی طرف برسہا برس سے منسوب ہوتا چلا آرہا ہے اور اہلِ ذوق اپنے اپنے خیال اور علم کے مطابق ان میں سے ہر شاعر کی طرف الگ الگ نسبت بھی کرتے ہیں، اس نسبت کی حقیقت پر غور کیا جائے تو مختلف باتیں سامنے آتی ہیں، کبھی استاذ اپنے شاگرد کو اپنا کوئی شعر یا غزل عطا کر دیتا ہے، اس موقع پر حقیقتِ حال کا علم رکھنے والے اس شعر یا غزل کو استاذ کی طرف منسوب کرتے ہیں اور جنہیں اس کا علم نہیں ہے وہ شاگرد ہی کا شعر یا غزل سمجھتے ہیں، اس کے برخلاف بھی مثال موجود ہے، بسا اوقات کوئی مشہور شاعر اپنے مضمون یا مکتوب میں دوسرے شاعر کا شعر بغیر نام لئے نقل کرتا ہے اور قاری مضمون نگار یا مکتوب نویس شاعر کا شعر سمجھ کر اس کی طرف منسوب کر دیتا ہے، یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک شاعر دوسرے شاعر کا کوئی مصرعہ لے کر اپنے مصرعہ سے شعر مکمل کرتا ہے اور بعد میں یہ شعر دونوں شاعروں کی طرف منسوب ہو جاتا ہے۔ اس طرح کی مثالیں بھی موجود ہیں کہ ایک نامعلوم خوبصورت مصرعہ مشہور ہوا یا طرحی مصرعہ دیا گیا اور چند شعراء نے اس پر اپنے اپنے انداز میں گرہ لگائی اور پھر یہ شعر ان سب کی طرف منسوب ہو گیا ——— ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک

شاعر کی زمین میں دوسرے شاعر نے کوئی غزل اور نظم کہی اور اپنے اشعار میں پہلے شاعر کے ایک دو اشعار بھی شامل کر لئے۔ اس صورت میں بھی یہ اشعار دونوں کی طرف منسوب ہو جاتے ہیں، حالانکہ کمالِ دیانت کا تقاضا ہے کہ کتاب کے حاشیہ میں اس کی وضاحت کر دی جائے مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے ——— اسی طرح ہوتا یہ بھی ہے کہ ایک شاعر دوسرے شاعر کی فکر اور نتیجہ کے طور پر غلط فہمی کی دو دھاری تلوار چل جاتی ہے۔ اور ہاں سیم و زر کی دنیا کی طرح شعر و ادب کی دنیا میں "چوری" (سرقہ) کی واردات بھی پیش آتی ہیں اور یہ چوری ایسی سینہ زوری کے ساتھ ہوتی ہے کہ ادیب یا شاعر کے مرنے کا بھی انتظار نہیں کیا جاتا، اس سلسلہ میں کچھ لوگ اپنے ماہرانہ فن سے "اصل" کو "نقل" کا مقام دیدیتے ہیں اور "دوسروں کی چیز" کو "اپنی چیز" بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اس تعلق سے عربی زبان میں ایک دلچسپ کتاب موجود ہے۔

چند مثالیں

راقم الحروف کے سامنے مذکورہ بالا صورتوں کی نظیریں موجود ہیں مگر بخوفِ طوالت ان کے ذکر سے گریز اختیار کیا جا رہا ہے، البتہ دلچسپی کی خاطر بعض ایسے مشہور اشعار ذیل میں "شعری ضرب الامثال" نامی کتاب (مرتب جناب شمس بدایونی) سے استفادہ کرتے ہوئے درج کئے جا رہے ہیں جو بیک وقت دو یا اس سے زائد شاعر کی طرف منسوب ہیں، ایک مشہور شعر ہے ؎

① شکست و فتح میاں اتفاق ہی لیکن مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

اس شعر کا پہلا مصرعہ اختلاف کے ساتھ لکھا اور پڑھا جاتا رہا ہے، مثلاً

ع شکست و فتح نصیبوں پہ ہے ولے امیر

یا

ع شکست و فتح تو قسمت سے ہے ولے امیر

بعض لوگ اس شعر کو میر کی طرف منسوب کرتے ہوئے امیر کی جگہ میر پڑھتے ہیں، مگر خمخانۂ جاوید جلد اول صفحہ (۴۱۸) اور "تحقیقی مطالعہ" صفحہ (۲۲) پر یہ شعر محمد یار خاں امیر کے نام سے درج ہے جو صحیح ہے مشہور محدث و شاعر مولانا ظہیر احسن شوق نیموی کے حالات پر جو کتاب "تذکرۂ شوق" کے نام سے لکھی گئی ہے اس میں بھی یہ شعر امیر کے نام ہی سے درج ہے۔

چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط

(۲) بعد مرنے کے یہ گھر سے مرے ساماں نکلا

یہ شعر غالب کی طرف منسوب ہے لیکن ڈاکٹر حنیف نقوی نے اپنے ایک مضمون "غالب سے منسوب ایک شعر" (شائع شدہ "آجکل" دہلی، ڈسمبر ۱۹۸۱ء) میں اس کی نسبت غالب کی طرف غلط قرار دیتے ہوئے عاشق حسین بزمؔ اکبرآبادی کی طرف منسوب کیا ہے، ان کی تحقیق کے مطابق اصل شعر یہ ہے ؎

ایک تصویر کسی شوخ کی اور نامے چند گھر سے عاشق کے پسِ مرگ یہ ساماں نکلا

○

(۳) سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے کتنی طاقت بازوئے قاتل میں ہے

وقت آنے دے بتا دیں گے تجھے اے آسماں
ہم ابھی سے کیوں بتائیں کیا ہمارے دِل میں ہے

اِن اشعار کو "شعری ضرب الامثال" میں پنڈت رام پرشاد بسمل کی جانب منسوب کیا گیا ہے، بہت سارے لوگ اِن کی نسبت بسمل عظیم آبادی کی طرف کرتے ہیں، تاہم بعض اہلِ تحقیق نے لکھا ہے کوئی تحریر ایسی نہیں ملتی کہ جس سے بسمل عظیم آبادی کی طرف نسبت کی صحت تسلیم کی جاسکے۔

(۴) مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے
آجاؤ جو تم کو آنا ہے ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

عام طور پر اس شعر کی نسبت سید محمد علی شاد عظیم آبادی کی طرف کی جاتی ہے مگر پروفیسر مسعود حسن رضوی نے اپنی تصنیف "ہماری شاعری" میں اس شعر کو شاد لکھنوی کی طرف منسوب کیا ہے، جس کی صحت بہرحال مشکوک ہے اور شاد عظیم آبادی کی طرف نسبت صحیح معلوم ہوتی ہے۔

(۵) ؎ قسمت تو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی جا کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

(۶) ؎ مجلسِ وعظ تو تا دیر رہے گی قائم
یہ ہے میخانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں

یہ دونوں شعر میر کی طرف منسوب ہیں، مگر عطا کاکوروی نے اپنی تحقیق میں بتایا ہے کہ یہ اشعار اصل میں قیام الدین قائم چاندپوری کے ہیں اور میر کی طرف بلاتحقیق منسوب ہیں۔ دیوانِ قائم (مرتبہ خورشید الاسلام) کے مطابق اصل شعر یہ ہے ؎

(۷) ایک جاگہ پہ نہیں ہے مجھے آرام کہیں ∴ ہے عجب حال میرا، صبح کہیں شام کہیں

محی الدین قادری زورؔ نے اپنی کتاب "اردو شاعری کا انتخاب" میں اس شعر کو اس طرح درج کیا ہے ؎

ایک جاگہ پہ نہیں ہے مجھے آرام کہیں　　دن کہیں، رات کہیں، صبح کہیں، شام کہیں

بعض لوگ اس شعر کو اس طرح پڑھتے ہیں ؎

اک جا کہیں رہتے نہیں عاشقِ بدنام کہیں　　دن کہیں، رات کہیں، صبح کہیں، شام کہیں

البتہ امداد صابری نے اپنی تالیف "۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء" میں اس شعر کو محمد واصل عباسی واصلؔ اور مشتاق بدایونی سے منسوب کرتے ہوئے اس طرح لکھا ہے ؎

آجکل مجھ کو یہ دل کرتا ہے بدنام کہیں　　دن کہیں، رات کہیں، صبح کہیں، شام کہیں

میر محمد تقی میرؔ کے یہ دو شعر ہیں ؎

(۸) آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم　　ہو گئے خاک انتہا ہے یہ

(۹) ؎ تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو　　رونا ہے کچھ ہنسی نہیں ہے

اوّل الذکر شعر شاہ اکبر داناپوری کی کلیاتِ دوم "جذباتِ اکبر" میں بھی درج ہے، لیکن یہ غلط ہے، یہ شعر بلا اختلاف میرؔ کا ہے، ثانی الذکر میرؔ کی طرف منسوب تو ہے، لیکن اس شعر کو تین اور شعراء (مصحفیؔ، لالہ بدھ سنگھ قلندرؔ، مرزا حسین علی خاں شادؔاں) کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

(۱۰) ؎ ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشقِ دل گیر کو
کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

یہ شعر خواجہ محمد وزیر وزیرؔ کا ہے، ان کے دیوان "دفترِ فصاحت" میں موجود بھی ہے، لیکن نہ جانے کیوں "آبِ حیات" میں یہ شعر ناسخؔ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

۵ لاؤ تو قتل نامہ مرا، میں بھی دیکھ لوں
(۱۱) کس کس کی مہر ہے، سرِ محضر لگی ہوئی

اہلِ تحقیق کہتے ہیں کہ اصلاً یہ شعر نواب میر محبوب علی خاں آصفؔ کا ہے، لیکن اسے جلیلؔ مانک پوری کی طرف بھی منسوب کیا گیا ہے، "ہماری زبان" یکم جولائی ۱۹۹۶ء میں اس پر تبصرہ موجود ہے۔

آوارہ گرد اشعار

کتاب "شعری ضرب الامثال" سے استفادہ کرتے ہوئے ان چند مثالوں کے بعد یہاں اس کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ایک شعر دو یا دو سے زائد شعراء کی طرف منسوب ہو تو اس کے لئے ادبی دنیا میں "آوارہ گرد اشعار" کی ایک اصطلاح ہی مقرر ہو گئی ہے، نیازؔ فتحپوری کے مشہور زمانہ رسالہ "نگار" بابت ماہِ ستمبر ۱۹۵۲ء میں اس عنوان سے نہایت پُرلطف اور معلومات افزا مضمون شائع ہوا تھا۔ ابھی بھی یہ موضوع کسی نہ کسی اعتبار سے ادبی حلقہ میں زیرِ بحث آ ہی جاتا ہے۔ اس لحاظ سے "آوارہ گرد اشعار" کا موضوع ادب کا ایک حصہ ہی بن گیا ہے۔

تندرستی ہزار نعمت ہے

جہاں تک تعلق "تندرستی ہزار نعمت ہے" والے شعر کا ہے تو اس سلسلہ میں جو تحقیقی، کتابی اور تحریری سرمایہ فی الوقت راقم الحروف کے پیشِ نظر ہے، اس سے ظاہر ہے کہ یہ شعر مرزا قربان علی بیگ سالکؔ (۱۸۰۰ــ۱۸۲۴ء) کا ہے لیکن نہ جانے کیوں غالبؔ کی طرف بھی یہ

شعر منسوب ہوتا چلا آرہا ہے اور بہت سے اہلِ علم اور باخبر حضرات کو غالبؔ کی طرف نسبت کرتے ہوئے اس شعر کو پڑھتے ہوئے میں نے سنا ہے، میں نے اپنے مضمون "اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست" (شائع شدہ "سیاست" ۳۰ جون ۱۹۹۷ء) میں اس شعر کو غالب کی طرف نسبت کرتے ہوئے جو نقل کیا ہے، وہ اسی عمومی شہرت کا اثر تھا، تاہم واقعہ ہے کہ "دیوانِ غالب" میں یہ شعر نہیں ہے، ممکن ہے اپنے شاگرد سالکؔ کے اس شعر کو غالبؔ نے تحریری اور زبانی طور پر متعدد بار مختلف انداز سے سراہا ہو اور کسی موقع پر سالکؔ کا نام لئے بغیر بھی غالبؔ کی زبان پر یا تحریر میں یہ شعر آگیا ہو، اور کسی نے اسے سن کر یا پڑھ کر غالبؔ سے نسبت قائم کردی ہو، بعد میں ہوا یہ کہ اس نسبت نے "عوامی شہرت" حاصل کرلی اور اس شعر کو لوگ عام طور پر غالبؔ ہی کا سمجھنے لگے، ایسا سمجھنے میں معقولیت کا پہلو یہ ہے کہ اس شعر کا انداز اور آہنگ غالبؔ جیسا ہے اور غالبؔ نے "تنگدستی" کے لفظ کو اپنے اشعار اور خطوط میں بکثرت استعمال کیا ہے، لیکن ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ کسی چیز کی شہرت سے حقیقت بدلا نہیں کرتی، بقول شخصے

ع ہر حالت میں ہر صورت میں حق حق ہے اور باطل باطل

سالکؔ کا شعر نہ کہ غالبؔ کا

اس لحاظ سے اگر غور کیا جائے تو اس شعر کی نسبت غالبؔ کیطرف ایک عوامی یا عمومی شہرت کی بنیاد پر ہے جب کہ سالکؔ کی طرف نسبت کرنے کی تحریری شہادتیں موجود ہیں، پہلی شہادت تو خود غالبؔ کی ہے،

جس کا اندازہ غالبؔ کے اس خط سے ہوتا ہے جسے انہوں نے سالکؔ کی طرح اپنے دوسرے چہیتے شاگرد میر مہدی حسین مجروح (۱۹۰۳ــ۱۸۳۳ء) کے نام لکھا تھا۔ اس خط کا ایک حصہ یہ ہے :

"تندرستی ہزار نعمت ہے" ہائے! پیش مصرعہ مرزا قربان علی بیگ سالکؔ نے کیا خوب بہم پہونچایا ہے، مجھ کو پسند آیا ہے۔" (خطوط غالبؔ، تالیف : مولانا غلام رسول مہر ص ۳۱۳)

دوسری شہادت بچوں کے مشہور ادیب مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی (۱۹۱۷ــ۱۸۴۴ء) کی ہے۔ سالکؔ کی طرح یہ بھی غالبؔ کے شاگرد اور سالکؔ کے ہم عصر ہیں، انہوں نے اپنی مشہور زمانہ تصنیف "اردو زبان کی کتاب" (تیسرا حصّہ) کے ۴۱ ویں سبق میں "تندرستی" کا موضوع اختیار کیا ہے اور درمیان میں اس شعر کو سالکؔ کی طرف منسوب کر کے نقل کیا ہے۔ ہم عصر اور ہم زمانہ ہونے کے اعتبار سے ان کی اس باخبری کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا، عبارت یہ ہے :

"جسم اور دماغ کے کاموں کا ٹھیک طور پر ہونا صحت اور تندرستی ہے، تندرستی ہی سے زندگی خوشگوار معلوم ہوتی ہے،

؎ تنگ دستی اگر نہ ہو سالکؔ تندرستی ہزار نعمت ہے"

(اُردو زبان کی تیسری کتاب، ص : ۹۱)

تیسری شہادت کتاب "شعری ضرب الامثال" سے دی جا سکتی ہے، جناب شمس بدایونی نے اس کتاب کو بڑی محنت سے مرتب کیا ہے، جسے ۱۹۸۴ء میں روشن پبلیکیشنز، روشن محل، محلہ سوتھ بدایوں، یو، پی نے شائع کیا ہے۔ اس کتاب کے صفحہ ۴۱ پر یہ شعر اس طرح ہے :

؎ تنگدستی اگر نہ ہو سالکؔ تندرستی ہزار نعمت ہے

چوتھی اور آخری مگر اہم شہادت "کلیاتِ سالکؔ" کی ہے، یہ کتاب "اکمل المطابع دہلی" سے (۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء) میں شائع ہوئی ہے، صفحات (۳۸۰) ہیں، ادارہ ادبیات اردو، پنجہ گٹہ حیدرآباد کے کتب خانہ میں موجود ہے اگر آپ اس کتاب کے صفحہ (۲۰۵) کو اپنے مطالعہ میں لائیں تو اس صفحہ کے بالکل آخر میں آپ کو یہ دو شعر ملیں گے۔

شب بلا ہی تو روز آفت ہے زندگی ہجر میں قیامت ہے
تنگدستی اگر نہ ہو سالکؔ تندرستی ہزار نعمت ہے

اس کتاب میں یہ اشعار جس طرح درج ہیں، اس کا یہاں زیرِ اکس دینا مزید تقویت کا باعث ہوگا،

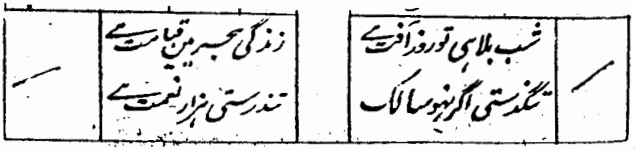

سالکؔ کا تعارف

رہ گئی بات مرزا قربان علی بیگ سالکؔ کے حالاتِ زندگی کی تو متعدد اہلِ علم و اہلِ قلم نے ان کے بارے میں تفصیلی معلومات بہم پہنچائی ہیں، خصوصیت کے ساتھ مالک رام نے اپنی کتاب "تلامذۂ غالب" میں مستند حوالوں سے صفحہ (۲۳۷) سے (۲۴۸) تک جملہ ۱۲ صفحات میں سالکؔ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ بہت عمدہ، بہت خوب ہے، جس سے یہ انکشاف بھی ہوتا ہے کہ سالکؔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

کے نانا تھے، مشہور تذکرہ نگار اور محقق و ادیب مولانا حکیم سیّد عبد الحیؒ (والد ماجد مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ) نے بھی اپنی تصنیف "گلِ رعنا" (اردو شعراء کے صحیح حالات پر مشتمل کتاب) میں سالکؔ کے مختصر حالاتِ زندگی قلمبند فرمایا ہے اور آخر میں ان کی شاعری کے نمونے دیئے ہیں یہاں صرف حالاتِ زندگی کا حصّہ نقل کیا جاتا ہے :

" قربان علی نام، سالکؔ تخلص، نواب مرزا عالم بیگ کے بیٹے تھے، حیدرآباد میں پیدا ہوئے اور دِلّی میں نشو و نما پائی اور فارسی کی درسی کتابیں وہیں کے اربابِ فضل و کمال سے پڑھیں، مومنؔ و غالبؔ بقیدِ حیات تھے، اس زمانہ میں شعر و سخن کا گھر گھر چرچا تھا، ان کو بھی شوق ہوا پہلے بطورِ خود کچھ کہتے رہے، اس کے بعد حکیم مومن خاں کی خدمت میں پہونچے، اس وقت قربان تخلص کرتے تھے غالباً خاں صاحب کے مرنے پر مرزا غالبؔ کے یہاں رسائی پیدا کی اور سالکؔ تخلص اختیار کیا۔

خوش مزاجی اور شگفتہ روئی کے ساتھ خدا نے ان کو ذکاوت ایسی عطا فرمائی تھی کہ چند روز کی مشق میں سخن سنجی اور سخن فہمی میں یہ اپنے معاصرین سے بہت بڑھ گئے اور مرزا غالبؔ کے شاگردوں میں سب سے بہتر نظر آنے لگے۔

۱۸۵۷ء کے عالم آشوب ہنگامہ کے بعد الور میں جاکر پناہ لی اور خوش قسمتی سے وکالت کے عہدے پر سرفراز ہو گئے، ایک عرصہ تک وہاں رہنے کے بعد اپنا مستقر الراس

یاد آیا اور حیدر آباد چلے گئے، وہاں محکمۂ تعلیمات میں سر رشتہ داری کے عہدے پر تقرر ہوگیا، اسی خدمت پر زندگی بسر کردی، حیدر آباد میں مخزن الفوائد کے نام سے ایک موقت الشیوع رسالہ عرصہ تک جاری رہا، اور اس میں بہت بکار آمد تاریخی مضامین نکلا کئے، ساٹھ پینسٹھ برس کی عمر تھی کہ ۱۲۹۱ھ میں سفرِ آخرت اختیار کیا، اور حیدر آباد میں مدفون ہوئے، "ہنجار سالک" دیوان کا نام ہے۔" (گلِ رعنا صفحہ ۴۳۱-۴۳۲)

نثری اور شعری دنیا کی ایک دلچسپ سیر سے ہم یہاں فارغ ہوگئے اس سیرِ چمن میں سالک کے سہارے ایک اہم "ادبی سلوک" بھی طے ہوگیا، اور ایک مرید کو یہ گوہرِ مراد ہاتھ آیا کہ ؎

تنگدستی اگر نہ ہو سالک
تندرستی ہزار نعمت ہے

برسات کی بہاریں

ہندوستان کے موسموں میں موسمِ برسات نہایت خوبصورت، فرحت بخش، نشاط انگیز اور دل آویز ہے، کسان اور عام آدمی سے لیکر عالم، ادیب اور شاعر تک ہر ایک کے دامنِ دل کو اس موسم کی رنگینیاں، رعنائیاں جلوہ طرازیاں اور معنی خیزیاں اپنی طرف اس کی فکری اور ذہنی سطح کے اعتبار سے کھینچتی ہیں، جہانگیر نے اپنی تزک میں لکھا ہے کہ برسات ہی ہندوستان کا موسم بہار ہے، دکن کا ابراہیم عادل شاہ ثانی بھی اس موسم کا نہایت گرویدہ تھا، اس نے اپنے ایک گیت میں اس موسم کے بارے میں اپنے گہرے جذبات اور حسین تخیلات کا اظہار کیا ہے، عادل شاہ ثانی برسات کی آمد پر جشن بھی مناتا تھا، سلطان محمد قلی قطب شاہ بھی موسمِ برسات کا شیدائی تھا، اس موسم پر اس کی کم و بیش پندرہ نظمیں ملتی ہیں۔

موسمِ برسات سے متعلق کسانوں، عامیوں، عالموں، ادیبوں، شاعروں اور شاہوں کی یہی وہ "اجتماعی چاہت" ہے، جس کی ترجمانی داغ دہلوی نے اپنے اس شعر میں کی ہے ؎

ڈرنا کسی کا اور وہ بجلی کا کوندنا
موسم بہت پسند ہے برسات کا مجھے

برسات کے موسم میں جب نظر آسمان کی طرف اٹھتی ہے تو بادل چھایا ہوتا ہے، یہ بادل کبھی ہلکا ہوتا ہے، کبھی گہرا، اس کی رنگ برنگی اور سورج سے آنکھ مچولی بھی خوب ہوتی ہے، ہوا سواری کا کام دیتی ہے جس کے دوش پر سوار ہر وقت بادل کا سفر جاری رہتا ہے، قرار اور سکون اسے ایک لمحہ نہیں، بادل کا دامن ہے کہ بارش کے "عطیۂ الٰہی" سے بھرا ہوا ہے، جہاں جس قدر حکمِ ربانی ہوا وہاں اسی قدر اپنے دامن کو خالی کیا، کبھی گرج اور چمک کر، کبھی خاموشی کے ساتھ، پورے موسم میں بادل اپنا یہ کرشمہ دکھاتا رہتا ہے، جس کے نتیجہ میں ندی، نالے اور تالاب بھرتے رہے، کنویں بھی سیرابی حاصل کرتے رہے، زمین بھی اپنی پیاس بجھاتی رہی، کھیتیاں لہلہاتی رہیں، درخت نہا دھوکر اپنی شادابی بڑھاتے رہے، بیل بوٹوں کے چہروں کی رونق میں بھی اضافہ ہوتا رہا، کوئل کی کوک اور بلبل کی ہوک بھی تیز تر ہوتی گئی، جنگل میں مور بھی ناچنے لگا، ہر طرف ہریالی چھائی ہوئی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے یہاں سے وہاں تک ہری چادر تان دی ہو، جس کو دیکھ دیکھ کر دل اور نظر، دونوں تسکین حاصل کرتے رہتے ہیں، برسات کے موسم کی ظاہری حالت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ گویا ہر سمت خوشیاں ابل رہی ہیں اور مسرتیں رقص کر رہی ہیں، بچے، جوان، بوڑھے، سبھی اپنی اپنی حیثیت کے لحاظ سے لطف اندوز ہوتے ہیں، بقول نظیر اکبرآبادی ؎

یہ رُت وہ ہے کہ جس میں خرد و کبیر خوش ہیں
ادنیٰ، غریب، مفلس، شاہ و وزیر خوش ہیں
جتنے ہیں اب جہاں میں سب اے نظیر خوش ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ موسمِ برسات کی معنی خیزی اور جلوہ طرازی سے جہاں اور لوگ متأثر ہوئے ہیں، ان میں اردو شعراء بھی ہیں، اسی لئے اردو شاعری میں "برسات" ایک اہم عنوان ہے، جس کے تحت شعراء مختلف انداز سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے آرہے ہیں، ذیل میں اس موضوع سے متعلق بعض شعراء کے اشعار پیش کئے جارہے ہیں، امید کہ موسمِ برسات میں برسات سے متعلق یہ اشعار فکر و نظر کو جلا بخشیں گے اور دل و دماغ کو آسودگی اس کے ساتھ قدرت کے ایک عظیم اور بے مثال "فیاضانہ عطیہ" (جو موسمِ برسات میں "پانی" کی شکل میں عطا ہوتا ہے) کی قدر دانی کے جذبات بھی پروان چڑھیں گے، اور منعمِ حقیقی کے اس انعام کے لئے اپنی جبینِ نیاز بھی ہم اس کے سامنے جھکاتے رہیں گے، اسی لئے قرآنِ حکیم نے بارش اور اس کے فوائد و منافع اور فیوض و برکات کا مختلف انداز سے تذکرہ کیا ہے، جس پر اظہارِ خیال کا یہ موقع نہیں ہے، اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کم از کم سورہ النحل آیت (۱۱-۱۰) سورہ قٓ آیت (۱۱، ۱۰، ۹) اور سورہ عبس آیت ۲۴ تا ۳۲ کا مطالعہ فرما سکتے ہیں۔

آئیے، موضوع سے متعلق سب سے پہلے عبدالمجید شمسؔ عظیم آبادی کی نظم "برسات" کا مطالعہ کریں، (۳۷) اشعار پر مشتمل پوری نظم نہایت رواں ہے، موسمِ برسات چوں کہ مجموعۂ فیوض و برکات ہے۔ اس لئے نظم کے ابتدائی حصہ میں اس کی آمد کا بے تابانہ انتظار ہے، پھر آمد کی مبارک ساعت ہے اور آمد کے بعد اس کے نمایاں اثرات کا اظہار اور دل کش ماحول کی دلکش الفاظ میں منظر کشی، چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

ہے شدت سے برسات کا انتظار　　پریشاں بہت ہے دلِ کاشتکار

کہ اَب نکلے جاتے ہیں کھیتی کے دن
نہ دیکھیں کہیں خشک سالی کے دن

ہر اک دن قیامت ہر اک شب بلا
اذیت میں مخلوق ہے مبتلا

یکایک گھٹا آسماں پر اُٹھی
ہر اک سمت تیزی سے بڑھنے لگی

ہوا تھی جو ساکت ہوئی تیز پا
چلی دوش پر لے کے کالی گھٹا

برسنے لگا ابرِ تر ٹوٹ کر
ہوئیں کرنیں خورشید کی بے اثر

نمی فتح خشکی پہ پانے لگی
نئی زندگی مسکرانے لگی

جو کچھ دیر کے بعد بارش رُکی
گھروں سے نکلنے لگے آدمی

جو پانی کا بچوں نے دیکھا بہاؤ
چلانے لگے اپنی کاغذ کی ناؤ

جو بدلا سماں آن کی آن میں
مویشی نکل آئے میدان میں

دُھلی گرد پتے چمکنے لگے
درختوں پہ طائر چہکنے لگے

اُمنگیں کسانوں کی تازہ ہوئیں
اُمیدیں نئی دل میں پیدا ہوئیں

جو بارش سے مٹی میں آئی تری
جلی گھاس ہونے لگی پھر ہری

نہا کر ترو تازہ تھیں جھاڑیاں
پہننے لگی پھر نئی ساڑیاں

خوشی سے لگیں جھومنے ڈالیاں
بجانے لگیں پتیاں تالیاں

جدھر دیکھئے کھیت ہیں دھان کے
جو کیسر ہیں پانی میں ڈوبے ہوئے

لبالب ہے ہر کھیت اَب آب سے
خزانے ہیں پانی کے ہر جا بھرے

نئی مٹی اَب آگئی کھیت میں
بڑی تازگی آگئی کھیت میں

جھلکتی ہے پانی کی لہروں پہ دھوپ
نرالا ہے بارش سے فطرت کا روپ

بے نظیر شاہ کی نظم "آمدِ ابر" کے عنوان سے ہے، جس کے چند اشعار یہ ہیں:

گھٹا اودی اودی یہ کیا چھا گئی
بہارِ چمن رنگ پر آگئی

پَروں کو ادھر مور تولے ہوئے　　گھٹائیں ادھر بال کھولے ہوئے
وہ کوئل غضب نے بجاتی ہوئی　　پپیہوں سے تانیں لڑاتی ہوئی
ہوا دوش پر شال ڈالے ہوئے　　گھٹاؤں کے آنچل سنبھالے ہوئے
گھٹائیں وہ بگلوں کی ہر سو قطار　　کہ ظلمت میں آبِ حیات آشکار

نظیر اکبر آبادی کو فطرت نگاری اور منظر کشی میں کمال حاصل ہے، کوئی بھی موضوع ہو، اس سے متعلق جزئیات کو جمع کرنے میں نظیر اپنی نظیر آپ ہیں۔ "برسات" پر جو ان کی نظم (مخمس) ہے، وہ بڑی ہی البیلی ہے، اور ان کی شاعرانہ خصوصیات کی پوری جھلک اس میں موجود ہے۔ نظم کے (۲۵) بند میں سے صرف چار بند لطف اندوز ہونے کے لئے کافی ہیں۔

کیا کیا رکھے ہے یارب سامان تیری قدرت　　بدلے ہے رنگ کیا کیا ہر آن تیری قدرت
سب مست ہو رہے ہیں پہچان تیری قدرت　　تیتر پکارتے ہیں "سبحان" تیری قدرت
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

بولیں بٹیریں، قمری پکارے کو کو　　پی پی کرے پپیہا، بگلے پکارے تو تو
کیا ہُدہُدوں کی حق حق، کیا فاختہ کی ہُو ہُو　　سب ٹر رہے ہیں تجھ کو کیا پنکھ کیا پکھیرو
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کوئی پکارتا ہے لو یہ مکان ٹپکا　　گرتی ہے چھت کی مٹی اور سائبان ٹپکا
چھلنی ہوئی اٹاری کوٹھا ندان ٹپکا　　باقی تھا اک اسارا سو وہ بھی آن ٹپکا
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کیچڑ سے ہو رہی ہے جس جا زمین پھسلنی　　مشکل ہوئی ہے واں سے ہر اک کو راہ چلنی
پھسلا جو پاؤں پگڑی مشکل ہے پھر سنبھلنی　　جوتی گری تو واں سے کیا تاب پھر نکلنی
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

علی سردار جعفری کہتے ہیں ؎

دیکھنا میگھ کا وہ شہسوار آپہونچا
گونج اٹھے کوہ و دمن گونج اٹھے دشت و جبال
گھن گرج وہ ہے مری جان کہ شاہی ڈنکے
جس طرح بجتے ہیں میداں میں بہ صد شانِ جلال
بجلی لہراتی ہے شعلوں کا سنہری پرچم
ابر کے فیل پہ بارش کا شہنشاہ سوار

میر تقی میرؔ "کثرتِ بارش" کے عنوان سے فرماتے ہیں ؎

کیا کہوں اب کے کیسی ہے برسات — جوشِ باراں سے بہہ گئے ہیں پات
بوند تھمتی نہیں ہے اب کے سال — چرخ گویا ہے آب در غربال
نہ ہے جلسہ نہ ربط یاراں ہے — شہر میں ہے تو بادوباراں ہے
آدمی ہیں سو کب نکلتے ہیں — مردم آبی چلتے پھرتے ہیں
لکھئے کیا میرؔ مینہ کی طغیانی — ہو گئی ہے سیاہی بھی پانی

جوشؔ ملیح آبادی کا قلم "برسات کی پہلی گھٹا" کا منظر بیان کرتے ہوئے یہ بھی کہتا ہے ؎

ابر کے سیلاب میں ڈوبا ہوا ہے جزو کل
خار کی نبضوں میں بھی دوڑا ہوا ہے خونِ گل
صحن میں پانی ہے اور پانی میں ہے بچوں کا غل
اک طرف لکڑی کی کشتی، اک طرف مٹی کا پل
جھوم کر برسی ہے کیا برسات کی پہلی گھٹا

○

مولانا الطاف حسین حالیؔ "برسات" کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

گرمی کی تپش بجھانے والی — سردی کا پیام لانے والی
قدرت کے عجائبات کی کان — عارف کے لئے کتابِ عرفان
وہ سارے برس کی جان برسات — وہ کون خدا کی شان برسات
آئی ہے بہت دعاؤں کے بعد — اور سینکڑوں التجاؤں کے بعد
برسات کا بج رہا ہے ڈنکا — ایک شور ہے آسماں پہ برپا
گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں — جنت کی ہوائیں آ رہی ہیں
کوسوں ہے جدھر نگاہ جاتی — قدرت ہے نظر خدا کی آتی

موسمِ برسات، مولانا حسرتؔ موہانی کو بھی قفسِ حسرت سے نکال کر میدانِ مسرت میں لاتا ہے، پھر حسرت کی طبیعت "برسات کی امنگ" کے عنوان سے اس طرح لہراتی ہے ؎

گھر کے آخر آج برسی ہے گھٹا برسات کی
میکدوں میں کب سے ہوتی تھی دُعا برسات کی
موجبِ سوز و سرور و باعثِ عیش و نشاط
تازگی بخش دل و جاں ہے ہوا برسات کی
شامِ سرما دل ربا تھی، صبحِ گرما خوش نما
دل ربا تر خوش نما تر ہے فضا برسات کی

ماہرؔ القادری برسوں حیدرآباد دکن میں رہ چکے ہیں، انہیں حق پہنچتا ہے کہ "دکن کی برسات" پر ایک طویل نظم کہتے ہوئے ان اشعار پر اپنی بات ختم کریں ؎

ہوا ٹھنڈی فضا بدمست سی ہے — شرابِ زندگانی ڈھل رہی ہے

عجب رُت ہے نہ سردی ہے نہ گرمی ہوا میں انتہا درجہ کی نرمی
بڑی پُرکیف رم جھم ہو رہی ہے گھٹا جیسے فضا کو دھو رہی ہے
مسرّت کارواں در کارواں ہے دکن برسات میں جنت کا نشاں ہے

موسمِ برسات کی معنویت کے پسِ منظر میں جن شاعروں کی طبیعتیں کچھ کہنے پر آمادہ ہوئی ہیں اور ان کی کہی ہوئی باتیں اَب ادبی اور شعری سرمایے کے درجہ میں ہیں، ان میں مذکورہ شاعروں کے ساتھ منشی دُوارکا پرشاد افقؔ بھی ہیں۔ "برسات کی بہار" کے عنوان سے سترہ اشعار پر مشتمل ان کی نظم بہت خوب ہے، اچھے الفاظ میں اچھی منظر کشی کی ہے، یہ تین شعر دیکھئے ؎

رُت آئی حسن و عشق انگیز فصلِ خوشگوار آئی
بہار آئی، بہار آئی، بہار آئی بہار آئی

غبارِ دل زمین کا دھل گیا بادل کے پانی سے
جڑیں سینچی گئیں سبزے کی آبِ زندگانی سے

ہری کھیتی ہوئی شادابیِ کشتِ زراعت سے
پڑا سوکھے ہوئے دھانوں میں پانی آبِ رحمت سے

افقؔ لکھنوی کی اس نظم کا آخری شعر ایک تاریخی اور جغرافیائی حقیقت کو اُجاگر کرتا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ برسات کے اس موضوعاتی مطالعہ کو اسی شعر پر ختم کیا جائے ؎

کہاں تک ذکر ہو اس فصلِ عیش افزا کے عالم کا
فقط ہے ہند میں گھر، اس بہار انگیز موسم کا

غم۔ شاعر اور شریعت

موسم کوئی بھی ہو، اگر آپ آسمان کی طرف دیکھیں تو ہر موسم میں آسمان پر بادل کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی انداز میں تھوڑا یا زیادہ نظر آئے گا، یہی حال انسان کا ہے، وہ اپنی زندگی کے جس مرحلہ اور جس منزل میں بھی ہو غم کا بادل اس پر سایہ فگن رہتا ہے، غربت ہی میں نہیں بلکہ امارت، دولت، راحت سہولت اور مسرت کے ظاہری نقشوں میں بھی "غم" کہیں نہ کہیں چھپا رہتا ہے، اس سے نجات مشکل ہے، دیکھا جائے تو زندگی اور غم دراصل ایک ہی شئ کے دو رُخ ہیں، بقول غالب ؎

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غالب اپنے ایک دوسرے شعر میں کہتے ہیں کہ غم سے کسی انسان کو نجات نہیں مل سکتی، کیوں کہ ہر انسان صاحبِ دل ہے، اور غم دل کے ساتھ ہے، یعنی دل کی فطرت یہ ہے کہ وہ جویائے غم ہے، لہٰذا جب تک انسان کے سینہ میں دِل ہے، انسان غم سے بچ نہیں سکتا، خواہ غمِ عشق ہو یا غمِ روزگار۔ ؎

غم اگرچہ جاں گسل ہے، پہ بچیں کہاں کہ دل ہے !
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

غم کی حقیقت کو غالب اپنے اس شعر میں بھی بیان کرتے ہیں ؎

غمِ ہستی کا اسد، کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے، سحر ہونے تک

غالب کے اِس شعر کی تشریح پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے ان الفاظ میں کی ہے:

"انسانی زندگی رنج والم، زحمت واذیت اور درد وغم کی ایک مسلسل داستان ہے، اس دکھ اور مصیبت (غمِ ہستی) کا علاج کسی سے نہیں ہوسکتا، کیوں کہ زندگی نام ہی ہے دکھ کا، بلکہ دکھوں کے ایک طویل سلسلہ کا، یہ سلسلہ تو صرف موت سے ختم ہوسکتا ہے، دیکھ لو! شمع کی زندگی جلنے کے تسلسل کا نام ہے، اس لئے وہ سحر ہونے تک (یعنی تادمِ وفات) بہر صورت جلتی رہتی ہے، ہر رنگ کا ٹکڑا بہت دلکش اور معنی خیز ہے، مطلب یہ ہے کہ جس طرح شمع خواہ محفلِ خوباں میں ہو یا گورِ غریباں پر، ہر حالت میں جلتی رہتی ہے، اور جب تک ختم نہیں ہوجاتی اس کے جلنے میں کمی نہیں ہوتی، اسی طرح انسان خواہ وہ سرمایہ دار ہو یا مزدور، شاہ ہو یا گدا جب تک زندہ ہے، غمِ ہستی میں گرفتار ہے، ہر وقت کسی نہ کسی پریشانی یا دکھ میں مبتلا ہے" (شرح دیوانِ غالب صفحہ ۴۷۵)

سراج اورنگ آبادی کی شاعری میں "چراغِ غم" اس طرح جلا ہے ؎

بنی سمتِ غیب سیں کیا ہوا کہ چمنِ سرو جل گیا !
مگر ایک شاخِ نہال غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

جگر کا یہ حقیقت آفریں شعر بھی خوب ہے ؎

اس سے بڑھ کر دوست کوئی دوسرا ہوتا نہیں
سب جدا ہو جائے لیکن غم جدا ہوتا نہیں

جگر یہ بھی کہتے ہیں ؎

بے فائدہ الم نہیں بے کار غم نہیں
توفیق دے خدا تو یہ نعمت بھی کم نہیں

جگر کا خیال یہ بھی ہے ؎

دل گیا رونقِ حیات گئی!
غم گیا ساری کائنات گئی!

غم اور دل، دل اور غم دونوں کی رفاقت ہمیشہ برقرار رہی ہے، جگر کی نظر کا کمال دیکھئے ؎

دونوں جہاں تو اپنی جگہ پر ہیں برقرار
کیا چیز تھی کہ جس کو مرا دل بنا دیا

جگر کی یہ بات بھی خوب ہے ؎

غم میسر ہے تو اس کو غمِ کونین بنا
دل حسیں ہے تو محبت بھی حسیں پیدا کر

جگر کے نزدیک غمِ حیات کی قیمت دام دام لینا چاہئے، اور زمانہ راحت کا ہو یا مصیبت کا دونوں کو بھرپور استعمال کرنا چاہئے ؎

قیمت غمِ حیات کی تو دام دام لے
یعنی بہار ہو کہ خزاں سب سے کام لے

کہنے والے نے یہ بھی کہا ہے ؎

غمِ کامل ہی اصلی زندگی ہے
مسرت تو حیاتِ عارضی ہے

نظر مغموم ہے، لب پہ ہنسی ہے
اسی کا نام شاید زندگی ہے

غم کی تشریح میں فانی کا یہ شعر بھی لافانی ہے ؎

غم بھی گذشتنی ہے، خوشی بھی گزشتنی
کر غم کو اختیار کہ گزرے تو غم نہ ہو

یہ شعر بھی فانی ہی کا ہے ؎

جیئے جانے کی تہمت کس سے اٹھتی کس طرح اٹھتی
ترے غم نے بچائی زندگی کی آبرو برسوں

فراق گورکھپوری کہتے ہیں ؎

یوں ہی فراق نے عمر بسر کی!
یا غمِ جاناں یا غمِ دوراں!

اصغر گونڈوی کا احساس یہ ہے ؎

آلام روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا

اصغر کی رودادِ زندگی یہ بھی ہے ؎

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

اصغر کے شاگرد جگر اپنے استاذ کے نقشِ قدم پر ہیں ؎

جگر ان حوادث سے گھبرا نہ جانا یہی تو ہے دل چسپیوں کا زمانہ

آغا شاعر لکھنوی اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہیں ؎

جو غمِ حبیب سے دور تھے، وہ خود اپنی آگ میں جل گئے
جو غمِ حبیب کو پا گئے، وہ غموں سے ہنس کر نکل گئے

شاعر کا یہ بھی خیال ہے ؎

غمِ حبیب، غمِ زندگی، غمِ دوران
یہ اہتمام ہے دو دن کی زندگی کے لئے

غم کا کرشمہ دیکھئے ؎

کبھی تیرے در، کبھی دَر بدر، کبھی عرش پر، کبھی فرش پر
غمِ عاشقی تیرا شکریہ، میں کہاں کہاں سے گزر گیا

ایک شاعر نے کہا ہے ؎

خوشیاں نہیں ہوتی ہیں تو غم ہوتے ہیں آباد
خالی کبھی ہم دل کی عمارت نہیں رکھتے

ایک دوسرے شاعر کا شعر ہے ؎

غمِ شکست نے ہر ہر قدم پہ ساتھ دیا
کسی رفیق، کسی رازداں کی طرح

شکیل بدایونی کس بلند حوصلگی کے ساتھ کہتے ہیں ؎

میری زندگی پہ نہ مسکرا، مجھے زندگی کا الم نہیں
جسے تیرے غم سے ہو واسطہ وہ خزاں بہار سے کم نہیں

اثر صہبائی کی یہ بات بھی نہایت پر اثر ہے ؎

خدا کی دین ہے، جس کو نصیب ہو جائے
ہر اک دل کو غمِ جاوداں نہیں ملتا

ایک شاعر کا یہ تاثر ہے ؎

غم کی دولت حاصل کرنا سب کے بس کی بات نہیں
ہم نے کچھ ایثار کیا ہے، تب یہ دولت پائی ہے

بہادر شاہ ظفر کے "خانۂ دل" میں ہزاروں رنج و غم ہیں، ان کے سامنے یہ راز نہیں کھلتا کہ ان میں "صاحبِ خانہ" کتنے ہیں، اور "مہمان" کتنے ع:

ہزاروں رنج و غم ہیں خانۂ دل میں نہیں کھلتا
کہ صاحب خانہ اِن میں کتنے اور مہمان کتنے ہیں ؟

غم کے سلسلہ میں ظفر کی بے نیازی بھی دیکھئے ؎

غم نہیں ہونے نہ ہونے کا کہ بے پروا ہیں ہم
ہے تو ہے سب کچھ میسر کچھ نہیں تو کچھ نہیں

عالمِ شادی و غم میں ظفر کا عالم یہ ہے ؎

نے کبھی ہوں شاد شادی میں نہ غمگین غم میں ہوں
میرا عالم اور ہے میں اور ہی عالم میں ہوں

غم کے گرداب میں پھنسنے کے بعد اپنے اپنے ظرف اور اپنے حوصلے کے لحاظ سے کوئی ہنستا ہے کوئی روتا ہے ؎

غم کا عالم عجیب ہوتا ہے
کوئی ہنستا ہے، کوئی روتا ہے

غم "قانونِ فطرت" ہی کا ایک حصہ ہے، اس لئے اکبر الہ آبادی اپنا مسلک یہ بتاتے ہیں ؎

غم میں بھی قانونِ فطرت سے میں کچھ بدظن نہیں
یہ سمجھتا ہوں کہ میرا دوست ہے دشمن نہیں

اکبر کی یہ بات بھی بڑی حکیمانہ ہے ؎

لطافت کو نہ چھوڑے رنگ تیری شادی وغم کا
ہنسی آئے تو پھولوں کی جو رونا ہو تو شبنم کا

بے حس الٰہ آبادی کا یہ شعر بھی رگِ حس کو پھڑکانے کے لئے بہت کافی ہے

تو ہی یہ بتا دلِ مضطرب کہ میں سمجھوں اب کیسے معتبر
ملی جو بھی شئ ملی عارضی نہ تو غم رہا نہ خوشی رہی

شکیل بدایونی کہتے ہیں ؎

غم ہو کہ انبساط، کسی کو نہیں قرار
فصلِ بہار آئی تو فصلِ خزاں گئی

خوشی بانٹنی چاہیے ؎

غم ہے تو اک یہی ہے کہ اس جستجو میں ہوں
خوشیاں اگر ملیں تو زمانے کو بانٹ دوں

غم بھی بانٹنے ہی کی چیز ہے ؎

اس بات پہ دنیا نے اٹھائی ہے قیامت
میں نے کسی مجبور کے غم بانٹ لئے ہیں

تلوک چند محروم نے محرومی سے ہٹ کر بامرادی کی یہ راہ بتائی ہے ؎

تو غم خوار ہو جائے تو غم کیا
زمانہ کیا زمانے کا ستم کیا

مبارک عظیم آبادی کی یہ مبارک تلقین ہے ؎

دنیا کے بت کدے میں مبارک خوشی کہاں
غم کو خوشی بنا کوئی پہلو نکال کے

شاید اسی تلقین کا اثر ہو جس کے سبب ایک شاعر نے غم کے سلسلہ میں "آپ بیتی" اس طرح بیان کی ہے ؎

دنیا نے ضبطِ غم کے سلیقے سکھا دیئے
حد سے بڑھا ملال تو ہم مسکرا دیئے

مولانا عامر عثمانی اپنے ایک شعر میں نصیحت کے ساتھ حکمت سے لبریز یہ بات بیان کرتے ہیں ؎

غم کی بڑھتی ہوئی یورش سے نہ گھبرا عامر
غم بھی اک منزلِ راحت کا نشاں ہوتا ہے

اسی حقیقت کو جگر فلسفیانہ انداز میں اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

طولِ غمِ حیات سے گھبرا نہ اے جگر
ایسی بھی کوئی شام ہے جس کی سحر نہیں

غم سے متعلق اب تک جن شعراء کے اشعار پیش کئے گئے، ان سب سے جداگانہ رنگ اور آہنگ لئے علامہ اقبال کی ایک پوری نظم "بانگ درا" میں ہے، نظم کا عنوان "فلسفۂ غم" ہے جو ۶ بند اور ۳۲ اشعار پر مشتمل ہے فلسفی اقبال ہی کو یہ حق پہونچتا تھا کہ غم کے بارے میں "دین و دانش" کا حاصل اور نچوڑ اپنی اس نظم میں پیش کریں، اقبال کی یہ نظم مستقل ایک موضوع ہے تاہم نظم کے چار بند ملاحظہ فرمائیے ؎

گو سراپا کیف عشرت ہے شرابِ زندگی!
اشک بھی رکھتا ہے دامن میں سحابِ زندگی
موج غم پر رقص کرتا ہے حبابِ زندگی
ہے الم کا سورہ بھی جزوِ کتابِ زندگی

ایک بھی پتی اگر کم ہو تو وہ گل ہی نہیں
جو خزاں نادیدہ ہو بلبل، وہ بلبل ہی نہیں

مطلب: اگرچہ انسانی زندگی میں آسائش و مسرت بڑی اہمیت رکھتی ہے اور ہر شخص اس کا طالب نظر آتا ہے، لیکن آنسو (رنج و غم) بھی اس کے لئے بہت ضروری ہے، بلکہ غور سے دیکھا جائے تو زندگی کی بنیاد ہی غم پر ہے، اسی لئے الم بھی انسان کے لئے اتنا ہی ضروری ہے، جس قدر عشرت اور راحت گلاب کے پھول میں ہے، اگر ایک پتی بھی کم ہو جائے تو اسے گلاب نہیں کہہ سکتے، اسی طرح زندگی میں سے اگر ایک پہلو یا جز بھی کم ہو جائے تو زندگی مکمل نہیں ہو سکتی، ایسی بلبل آج تک نہیں پیدا ہوئی جس .... نے خزاں کی مصیبت نہ اٹھائی ہو، اسی طرح دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں ہے جس نے رنج و الم کا ذائقہ نہیں چکھا، باغ کے لئے خزاں ضروری ہے تو انسان کے لئے غم بھی ضروری ہے، (شرح بانگِ درا از پروفیسر یوسف سلیم چشتی ۴۰۹)

آرزو کے خون سے رنگین ہے دل کی داستان
نغمۂ انسانیت کا بل نہیں غیر از فغاں

دیدۂ بینا میں داغِ غم چراغِ سینہ ہے
روح کو سامانِ زینت آہ کا آئینہ ہے

حادثاتِ غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال
غازہ ہے آئینہ دل کے لئے گردِ ملال!

غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے
ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے

طائرِ دل کے لئے غم شہپرِ پرواز ہے !
راز ہے انساں کا دل، غم انکشافِ راز ہے

غم نہیں غم، روح کا اک نغمہ خاموش ہے
جو سرود بربطِ ہستی سے ہم آغوش ہے

تشریح : ہر انسان کے دل میں آرزوئیں مچلتی رہتی ہیں، اور چونکہ کسی شخص کی بھی ساری آرزوئیں پوری نہیں ہوسکتیں، اس لئے ہر شخص کبھی نہ کبھی غمگین ہو ہی جاتا ہے، لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ رنج و غم کے بغیر انسانیت کامل ہی نہیں ہوسکتی، جو آدمی عقل مند ہے، وہ داغ کو اپنے سینہ کا چراغ تصور کرتا ہے، اور آہ و نالہ کو اپنی روحانی ترقی کا ذریعہ سمجھتا ہے، غم سے انسانی فطرت اپنے مرتبۂ کمال کو پہونچتی ہے، اور رنج و ملال سے دِل کے آئینہ پر صیقل ہو جاتی ہے، اگر جوانی میں کسی پر غم مسلط ہو جائے تو وہ خوابِ غفلت سے بیدار ہو جاتا ہے، اور زندگی (کائنات) کی حقیقت پر غور کرنا شروع کر دیتا ہے، یہ غور و فکر اس کے اصلاحِ باطن کا ذریعہ بن جاتی ہے، دل کی ترقی کے لئے غم "شہپر" کا کام دیتا ہے، اور اس غم کی بدولت انسان اپنے دل کی پوشیدہ طاقتوں سے آگاہ ہو جاتا ہے، غور سے دیکھو تو لوگ جسے غم کہتے ہیں، وہ ہماری روح کا ایک نغمہ ہے، جو زندگی کے نغمہ سے متحد اور وابستہ ہے، یعنی غم زندگی کا جزو لازمی ہے۔ (ایضاً صفحہ ۴۱۰)

آتی ہے ندی جبین کوہ سے گاتی ہوئی
آسماں کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی

آئینہ روشن ہے اس کا صورتِ رخسارِ حور
گر کے وادی کی چٹانوں پر یہ ہو جاتا ہے چور

نہر جو تھی اس کے گوہر پیارے پیارے بن گئے
یعنی اس افتاد سے پانی کے تارے بن گئے

جوئے سیماب رواں پھٹ کر پریشاں ہوگئی
مضطرب بوندوں کی ایک دنیا نمایاں ہوگئی

ہجر، ان قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے
دو قدم پر پھر وہی جو مثلِ تارِ سیم ہے

ایک اصلیت میں ہے نہرِ روانِ زندگی!
گر کے رفعت سے ہجوم نوعِ انساں بن گئی

بستی عالم میں ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم!
عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم

مفہوم: اقبال کہتے ہیں کہ اب ندی کی مثال پر غور کرو، ندی پہاڑ کی چوٹی سے شور کرتی ہوئی آتی ہے، اس کا پانی نہایت شفاف ہوتا ہے، وادی کی چٹانوں سے ٹکرا کر اس کا پانی لاکھوں بوندوں کی شکل میں نمایاں ہو جاتا ہے اور چاروں طرف پھیل جاتا ہے، لیکن کچھ دور چل کر وہ پانی پھر ندی کی شکل اختیار کر لیتا ہے، پس یہی زندگی (کی نہر) کا حال ہے، وہ بھی لاکھوں انسانوں کی صورت اختیار کر لیتی ہے، دنیا میں ہم ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں، دوسری دنیا میں (آگے چل کر) پھر سب جمع ہو جائیں گے، لیکن ہم اپنی کوتاہ بینی کے سبب سے عارضی فرقت کو دائمی سمجھ کر غمگین ہو جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ مر جاتے ہیں، وہ ہم سے عارضی طور پر جدا تو بیشک ہو جاتے ہیں لیکن فنا نہیں ہوتے۔

انسان کے مر جانے سے اس کے اعزہ، اقربا اور متعلقین کو جو غم

ہوتا ہے، اس کے ازالہ کی تدبیر اقبال نے اپنے فلسفیانہ اور حکیمانہ ذہن سے خوب تلاش کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ جو لوگ مرجاتے ہیں، وہ ہم سے عارضی طور پر جدا تو بے شک ہوجاتے ہیں، لیکن فنا نہیں ہوتے، جس وقت عقل انسانی دنیا کی آفتوں میں گھر جاتی ہے، یا جوانی کے جذبات سے مغلوب ہوجاتی ہے، یا جس وقت انسان اچھائی اور برائی میں تمیز نہ کرسکے، اور اپنے لئے کوئی راہ معین نہ کرسکے، یا جس وقت وہ ہمت ہار جائے، اور اس کی عقل (فکر) عاجز ہوجائے، اور کوئی صحیح فیصلہ نہ کرسکے، اور اس کا ضمیر بھی رہنمائی سے قاصر ہو، اور کوئی ناصر اور ہمدرد بھی نہ ہو جو اسے اصلاح دے سکے، اور امید کی کوئی جھلک بھی اسے نظر نہ آئے، ہر طرف مایوسی ہو، اس وقت انسان ان لوگوں کی زندگیوں سے ہدایت حاصل کرسکتا ہے، جو اس دنیا سے رخصت ہوچکے ہیں، ان کی زندگیاں ہمارے لئے سبق آموز ہیں۔ (شرح بانگِ درا صفحہ ۴۱۲، ۴۱۱)
اشعار یہ ہیں ؎

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

عقل جس دم دہر کی آفات میں محصور ہو
یا جوانی کی اندھیری رات میں مستور ہو

دامن دل بن گیا ہو رزم گاہِ خیر و شر
راہ کی ظلمت سے ہو مشکل سوئے منزل سفر

خضر ہمت ہو گیا ہو آرزو سے گوشہ گیر
فکر جب عاجز ہو اور خاموش آوازِ ضمیر

وادیِ ہستی میں کوئی ہم سفر تک بھی نہ ہو
جادہ دکھلانے کو جگنو کا شرر تک بھی نہ ہو

مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں

اِس دنیا کی حیثیت پَردیس کی سی ہے، اور آخرت کی حیثیت وطن اصلی کی، موت کا مطلب ہے کہ ایک آدمی پردیس سے اپنے وطن کی طرف اللہ تعالیٰ کے پاس چلا گیا، جہاں آگے پیچھے سب کو جانا ہے، اس پسِ منظر میں مشہور بزرگ مرزا مظہر جان جاناں (وفات ۱۷۸۱ء) نے اپنے انتقال سے پہلے اپنی ڈائری میں یہ شعر لکھ دیا تھا، جس سے ان کے گھر والے تسلی حاصل کیا کرتے تھے ؎

لوگ کہتے ہیں کہ مظہر مر گیا
اور مظہر درحقیقت گھر گیا

غم کا لفظ خوشی کے مقابلہ میں استعمال کیا جاتا ہے، اور شعرا نے "غم" کو جس جس انداز سے سمجھا اور سمجھایا ہے، اس کے کچھ اعلیٰ جمالیاتی اور عزم وہمت والے نمونے آپ کے سامنے آئے، فلسفۂ غم سے متعلق اقبال کی فکر انگیز اور معنی خیز نظم کے بعض حصے بھی آپ نے پڑھے، ہم نے غم سے متعلق ان اشعار کو یہاں قصداً چھوڑ دیا ہے، جن کو پڑھنے کے بعد مایوسی محرومی، نامرادی اور کم ہمتی کا سایہ ذہن ودماغ پر پڑنے لگتا ہے۔

صاف سیدھی بات یہ ہے کہ ہر غم کسی نہ کسی حادثہ کا نتیجہ ہوتا ہے اور حادثات زندگی کی رفتار کو کم کرنے کے لئے نہیں، بلکہ بڑھانے کے لئے ہوتے ہیں، یہ مرحلہ نئی امنگوں کے ساتھ زندگی کو از سرِ نو ترتیب دینے کا ہوتا ہے۔

ہمیں یہ تسلیم ہے کہ خوشی اور غم کے اسباب سے ایک انسان فطری اور طبعی طور پر متاثر ہوتا ہے، اور چہرہ کا انبساط اور اضمحلال، انسان کی اس اندرونی کیفیت کو ظاہر کر دیتا ہے، اگر حد کے اندر ہو تو دینِ شریعت میں بھی "طبعی مسرت" کا اظہار جائز ہی نہیں بلکہ مستحسن ہے، اسی طرح "طبعی صدمہ" کے اظہار کی ممانعت اسلام میں نہیں ہے، البتہ محبوبات و مرغوبات میں سے کوئی چیز (مثلاً مال یا اولاد یا صحت و عافیت، یا حسن و شباب یا کوئی عزیز یا دوست) نہ رہے تو رنج و غم حد سے زیادہ نہیں کرنا چاہیئے (دیکھئے سورہ الحدید آیت ۲۳)

مومنانہ نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہم سب عبد محض ہیں، اور تمام تر اللہ تعالیٰ کی ملک، ہم خود بھی اور ہماری ہر چیز بھی، اپنی کوئی شئی ہی نہیں، نہ بیوی نہ بچے، نہ ماں نہ باپ، نہ مال نہ جائیداد، نہ وطن نہ خاندان، نہ جسم نہ جان، یعنی ع

جو کچھ ہے سب خدا کا وہم و گماں ہمارا

قرآنی آیت اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (البقرہ ۱۵۶) بے شک ہم اللہ ہی کے لئے ہیں، اور بے شک ہم اسی کی طرف واپس ہونے والے ہیں) کا یہی مطلب ہے، اس سے پہلے کی آیت میں مختلف چیزوں کی آزمائش میں صبر کرنے والوں کو خدائی بشارت دی گئی ہے (البقرہ ۱۵۵)۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت تاریخ کا بیان ہے کہ آپ ادنیٰ ادنیٰ تکلیف یا ناگواری کے موقع پر بھی یہ کلمہ زبان پر لاتے رہتے تھے، اور یہی معمول آپ کے صحابیوں کا بھی تھا، مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ یہ کلمہ (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ) تمام مصیبتوں کا علاج ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص حسبی اللہ لا الٰہ الا ھو علیہ توکلت وھو رب العرش العظیم سات مرتبہ صبح اور سات مرتبہ شام پڑھ لیا کرے اللہ تعالیٰ

اس کے دنیا اور آخرت کے ہر غم اور ہر فکر کے لئے کافی ہو جائے گا (ابو داؤد)

مشہور مفسر علامہ آلوسیؒ "تفسیر رُوح المعانی" میں تحریر فرماتے ہیں کہ الحمدللہ میں اس وِرد کا پابند ہوں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی معاملہ غمگین کرتا تو آپ یہ فرماتے: یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِیْثُ (اے زندہ! اے قائم رکھنے والے (مخلوق کو) میں تیری رحمت کے ذریعہ فریادرسی چاہتا ہوں (نسائی)

غمزدہ افراد سے تعزیت کرتے ہوئے آپؐ فرماتے کہ تم صبر کرو، اور دیکھو تمہاری بے قراری اور بے صبری تمہیں اجر سے محروم نہ کرے ورنہ پچھتاؤ گے، اور اس بات کا یقین کرو کہ میری بے صبری سے کوئی مرنے والا لوٹ کر نہیں آسکتا، اور نہ غم دور ہو سکتا ہے، اور جو حادثہ واقع ہوا ہے اسے ہونا ہی تھا۔ (طبرانی)

ایسے غمزدوں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان الفاظ میں تعزیت فرماتے اَعْظَمَ اللّٰهُ لَكَ الْاَجْرَ وَاَلْهَمَكَ الصَّبْرَ وَرَزَقَنَا وَاِیَّاكَ الشُّكْرَ (اللہ تعالیٰ تمہیں اجرِ عظیم دے، اور تمہیں صبر دے، اور ہمیں اور تمہیں شکر کی توفیق دے)۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہر انسان طبعی طور پر بعض چیزوں سے خوش ہوتا ہے، بعض سے غمگین، لیکن ہونا یہ چاہئے کہ جس کو کوئی مصیبت پیش آوے تو وہ اس پر صبر کرکے آخرت کا ثواب کمائے، اور اگر راحت و خوشی سے ہم کنار ہو تو (اس پر اترانے اور فخر کرنے کی بجائے) شکرگزار ہو کر اجر حاصل کرے (حاکم)

آخر میں یاد رکھئے کہ غم اور خوشی کی جو حقیقت، حکمت اور حد شریعت نے متعین کر دی ہے، اور شعراء نے اپنے اشعار میں جن بلند اور اونچے تصورات کو پیش کیا ہے، ان کا ہمہ دم پاس و لحاظ رکھنا چاہئے، مومن کا کام ہر حالت اور ہر صورت میں راضی بہ رضا رہنا چاہئے، بقول مولانا محمد علی جوہر ؎

ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو تو مزہ دیکھ
دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ

ہے یہ شامِ زندگی، صبحِ دوامِ زندگی

دُنیا کی کوئی ایسی چیز نہیں جس میں لوگوں کا باہمی اختلاف نہ ہو، یہاں تک کہ خُدا، رسول اور آخرت جیسی حقیقتوں کا بھی مادّی خاکوں میں اُلجھے ہوئے لوگوں نے انکار کیا ہے، لیکن موت سے انکار کی جرأت کوئی نہیں کرسکا۔ "كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ" (العنکبوت: ۵۷) "ہر شخص موت کا مزا چکھنے والا ہے"۔ اس قاعدہ اور ضابطہ سے اس کائنات کے خالق اور پالنہار کے سوا اور کوئی مستثنیٰ نہیں (الرحمٰن: ۲۷-۲۸) یہ ایک حقیقت ہے کہ موت ایک غیر اختیاری شئی ہے، جس پر کامل اختیار اللہ تعالیٰ ہی کی ذات کو ہے (آلِ عمران: ۱۴۵) موت سے کسی کو راہِ فرار کی کوئی گنجائش نہیں ہے (النساء: ۷۸) موت کے معاملے میں انسان اتنا بے بس اور مجبور ہے کہ موت کی مقرر کردہ گھڑی میں نہ ایک لمحہ کی عجلت کرسکتا ہے نہ تاخیر (العنکبوت) اور یہ اس لئے کہ خود قادرِ مطلق اپنی مقرر کی ہوئی گھڑی میں ذرّہ برابر تاخیر گوارا نہیں کرتا (المنافقون: ۱۱) موت کے بارے میں یہ حقیقت بھی عجیب ہے کہ یہ جس قدر "یقینی" ہے، اس کا وقت، سبب اور مقام اتنا ہی "غیر یقینی" ہے۔ زندگی کی شام کب، کہاں

اور کس جگہ ہو جائے کوئی نہیں کہہ سکتا، اس کا صحیح علم اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو نہیں (لقمٰن: ۳۴) اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہم سب زندگی کے اسٹیشن پر کھڑے موت کے ٹکٹ کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ ٹکٹ کسی کو پہلے مل جاتا ہے اور کسی کو بعد میں، جہاں یہ ٹکٹ ملا وہ شخص فنا کی ریل میں بیٹھ کر آخرت کی لامتناہی زندگی کا سفر شروع کر دیتا ہے۔

گویا انسان قدم قدم چل کر زندگی کا سفر طے کرتا ہے، پھر جب یہ سفر ختم ہوتا ہے تو وہ بھی ایک قدم پر یہ "قدم" ایک سفر کا اگر اختتام کرتا ہے تو دوسرے سفر کا آغاز بھی! اس قدم پر دُنیا پیچھے رہ جاتی ہے۔ اور آخرت کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

مولانا رُوم نے اس حقیقت کو بڑے حکیمانہ اور فلسفیانہ انداز میں سمجھایا ہے، وہ فرماتے ہیں:

تو ازاں روزے کہ درہست آمدی
آتشے یا خاک یا بادے بُدی
گر بداں حالت تُرا بودے بقا
کہ رسیدے مرتُرا ایں ارتقا
از مبدّل ہستی اول نماند
ہستیٔ دیگر بجائے او نشاند
ایں بقاہا از فناہا یافتی
از فنائش رو چرا برتافتی

ترجمہ: "ابتداءً تیرا وجود مٹی، ہوا اور آگ کا مرہونِ منّت تھا۔ پھر تیری حالت بدلی اور تو نے ارتقاء کی سیڑھیاں طے کیں۔ اس تبدیلی نے تیری پہلی ہستی کو فنا کر کے تجھے دوسری ہستی سے ہمکنار کیا، تجھے یہ بقا بار بار فنا ہونے سے ملی ہے۔ اَب تو اس ہستی کے فنا ہونے سے کیوں کتراتا ہے؟"

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ دُنیا انسان کا اصل وطن نہیں ہے، یہ تو اس کے لئے ایک پردیس یا سرائے ہے، جہاں اس کو بحیثیّتِ مسافر گنتی کے چند روز رہنا ہے، پھر سب کچھ چھوڑ کر خالی ہاتھ اپنے حقیقی وطن یا عالَمِ آخرت کو سِدھار جانا ہے اور پھر وہیں ہمیشہ کیلئے رہنا ہے۔ بقول میر انیسؔ:

مقام یوں ہوا اس کارگاہِ دُنیا میں
کہ جیسے دن کو مسافر سَرا میں آکے چلے

قرآنِ حکیم نے دُنیوی زندگی کی بے ثباتی کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

"خوب جان لو کہ دُنیوی زندگی محض ایک کھیل کود اور ظاہر خوشنمائی اور آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرنا اور مال و اولاد میں ایک دوسرے پر برتری جتلانا ہے، گویا کہ بارش ہے کہ اس کی پیداوار کاشتکاروں کو اچھی معلوم ہوتی ہے، پھر خشک ہو جاتی ہے، سو تو اُسے زرد دیکھتا ہے، پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہے اور آخرت میں عذابِ شدید بھی ہے۔ اور اللہ کی طرف سے مغفرت اور خوشنودی

بھی اور دُنیوی زندگی محض دھوکے کا سامان (متاعُ الغرور)
ہے۔" (الحدید: ۲۰)

اس آیتِ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ دُنیا عارضی و فانی ہے۔ اس کے برعکس عالمِ آخرت باقی ولازوال ہے۔ اور وہاں کی کیفیتیں دو ہیں، دونوں ثابت و باقی۔ ایک کافروں کے لئے اور وہ عذابِ شدید ہے۔ دوسری ایمان والوں کے لئے اور وہ اللہ کی رحمت و مغفرت ہے۔ اَب انسان کو اختیار ہے کہ ان دو میں سے جس کو چاہے اپنا مقصود بنالے۔

انسان کی زندگی کی فانی حیثیت اور بے ثباتی کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نقشہ کے ذریعہ نہایت دلنشیں انداز میں سمجھایا ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ راوی ہیں کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایک مربع شکل بنائی، اس شکل کے بیچ میں ایک لکیر کھینچی جس کے اوپری حصّہ کو اس مربع کی حد سے تھوڑا سا باہر نکال دیا۔ اس درمیانی لکیر کے ہر ایک طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوٹی چھوٹی لکیریں اور کھینچیں، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا درمیان کی لمبی لکیر یہ انسان ہے جسے چاروں طرف سے موت نے گھیر رکھا ہے، مربع کی حد سے لکیر کا جو حصّہ باہر ہے وہ انسان کی آرزو اور خواہش ہے۔ اور یہ جو چھوٹی چھوٹی لکیریں ہیں وہ مصائب و آلام اور آفات و بلیّات ہیں جو انسان کی زندگی کا لازمہ ہیں۔ تم دیکھو گے کہ اگر انسان کو ایک آفت سے نجات ملی تو دوسری نے آگھیرا، اس سے اس نے چھٹکارا حاصل کیا تو تیسری نے اپنی گرفت میں

لے لیا۔ اور موت تک یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ (ریاض الصالحین)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ نقشہ انسانی زندگی کی کتنی بہترین تمثیل پیش کرتا ہے، اس کا تجربہ شب و روز انسان کو ہوتا رہتا ہے، موت ہے کہ ہر سمت سے اُسے اپنے احاطہ میں لئے ہوئی ہے، نہ جانے کب، کہاں اور کس حال میں اس پر حملہ کر کے اس کے وجود کو مٹا ڈالے۔ اس سے پہلے مختلف مصائب و آفات ہیں، متعدّد بیماریاں اور پریشانیاں ہیں جو انسان کے پیچھے سایہ کی طرح لگی رہتی ہیں، جس طرح رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات آتی ہے اسی طرح یکے بعد دیگرے کوئی نہ کوئی آفت اس پر نازل ہوتی رہتی ہے اور کسی نہ کسی مصیبت میں وہ گرفتار رہتا ہے۔ اس کے باوجود اگر انسان حرص و ہوس میں پڑا رہے، آرزوؤں اور تمنّاؤں کا محل بناتا رہے، پچاس برس کی عمر نہیں، مگر صدہا برس کا سامان کرتا رہے اور قناعت سے دُور، ننانوے کے پھیر سے کبھی قدم باہر نہ نکالے، تو یقیناً انسان کی بہت بڑی بے وقوفی اور حماقت ہے، دانا اور عقلمند ہے وہ انسان جس نے اپنی حیثیت کو پہچانا، دُنیا کے امتحانی دَور سے صحیح سالم گذرنے کی کوشش کی اور زندگی کے ایک ایک لمحہ سے آخرت کے لئے توشہ جمع کرتا رہا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

"عقلمند وہ ہے جس نے اپنے نفس سے محاسبہ کیا اور موت کے بعد کی زندگی کے لئے عمل کرتا رہا اور عاجز (بے ہمّت) وہ ہے جس نے اپنے نفس کو خواہشات کا تابع کر دیا، اور اللہ سے (فضل و کرم کی) اُمیدیں باندھتا

رہا۔" (ترمذی)

اس موقع پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی ایک مشہور روایت کا سامنے رکھ لینا ہر طرح مناسب ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ مجھے پکڑ کر فرمایا:۔

"دنیا میں اس طرح رہو گویا کہ تم یہاں ایک اجنبی ہو یا ایک راستہ چلنے والے مسافر ہو اور اپنے آپ کو قبر والوں میں شمار کرو۔"

یہ حدیث بیان کرنے کے بعد حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے شاگرد سے کہا:۔

"جب تم صبح کرو تو شام کا انتظار نہ کرو، اور جب تم شام کرو تو صبح کا انتظار نہ کرو، اور اس وقت جو صحت تم کو حاصل ہے اس کو بیماری آنے سے پہلے استعمال کر لو، اور موت سے پہلے جو زندگی ہے اس میں کچھ کام کر ڈالو، کیوں کہ اے خدا کے بندے! تمہیں نہیں معلوم کہ کل تم کو کیا کہہ کر پکارا جائے گا (زندہ یا مُردہ)" (ترمذی)

یہ حدیث مؤمن کے جذبات کی ترجمان ہے، ایمان یہ ہے کہ آدمی اس حقیقت کو پالے کہ دُنیا کا خالق اور مالک اللہ ہے، اور وہی میرا سب کچھ ہے، اگر وہ مجھ سے خوش ہو جائے تو میں کامیاب ہوں اور اگر وہ ناراض ہو جائے تو کوئی بھی میرے کام نہیں آسکتا، جس کے دل میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے اس کا دل خدا کی طرف لگ جاتا ہے، وہ ہر وقت بس اسی کو یاد کرتا ہے۔ وہ رات دن اسی

کوشش میں لگا رہتا ہے کہ کس طرح اپنے رب کو راضی کرلے، اس کی انتہائی تمنّا یہ ہو جاتی ہے کہ مرنے کے بعد جب وہ خدا کے حضور میں پہنچے تو اس کو اپنے مالک کے آگے شرمندہ نہ ہونا پڑے، ایسے آدمی کو یہ دُنیا بالکل ہیچ معلوم ہونے لگتی ہے، یہاں کی چیزوں میں اس کے لئے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی، وہ دُنیا میں رہتے ہوئے آخرت کی مخلوق بن جاتا ہے۔ وہ دنیا میں اس طرح رہتا ہے جیسے کوئی شخص کسی اجنبی مقام پر آگیا ہو یا کوئی مسافر ہو جو آگے جانے کے لئے کسی راستے سے گذر رہا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایک مسافر یا ایک راہ چلتے آدمی کو راستے سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، راستہ اس کے لئے گذرنے کی جگہ ہوتی ہے نہ کہ ٹھہرنے کی جگہ، وہ راستہ کے مناظر کو چھوڑتا ہوا آگے بڑھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ منزل پر پہنچ جاتا ہے۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا "اور اپنے آپ کو قبر والوں میں شمار کرو"۔ گویا اللہ تعالیٰ نے ہم کو جو دُنیا میں بھیجا ہے اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم یہاں کی نعمتوں میں غرق ہوں اور یہاں رہ کر اپنے دل کی تمنّائیں پوری کریں بلکہ وہ تو یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ ہم میں سے کون ہے جو دنیا کو اپنے حوصلوں اور تمنّاؤں کا مدفن بناتا ہے تاکہ آخرت میں "وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنْفُسُكُمْ" (اور جس چیز کو تمہارا جی چاہے جنّت میں تمہارے لئے موجود ہے) کا منظر سامنے آئے۔

حقیقت یہ ہے کہ مرنے کے بعد کی زندگی اگر آدمی کے سامنے ہو اور جنّت و دوزخ کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو تو وہ ایسا ہی بن جائے گا جیسا کہ وہ مرنے سے پہلے مرگیا ہے، اور غیب کی ساری

چیزیں اس کی نگاہوں کے سامنے ہیں۔ موت کی یہی وہ حقیقت ہے جس کے پیشِ نظر حضرت عمرؓ نے اپنی انگوٹھی پر ہمہ وقت استحضار کے لئے یہ کندہ کرایا تھا، کَفٰی بِالْمَوْتِ وَاعِظًا یَا عُمَرُ! (اے عمر! تمہارے لئے موت کا واعظ ہونا کافی ہے)

اس حدیث کو سُنانے کے بعد حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے شاگرد کو جو نصیحت کی ہے گویا وہ صحیح ترین تأثر ہے جو ایسے کسی ارشاد کو سننے کے بعد ایک مومن کے اندر پیدا ہونا چاہیئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صبح و شام کا جو لمحۂ زندگی کا جو موقع تمہیں اس وقت نصیب ہے، سمجھو کہ یہی وہ آخری وقت ہے جو تمہیں دیا گیا ہے، اس لئے اس کو پوری طرح استعمال کرو، کیوں کہ تمہیں نہیں معلوم کہ عاقبت اور آخرت کے لئے کام کرنے کی مہلت جو آج تمہیں حاصل ہے وہ کل بھی باقی رہے گی یا نہیں۔

بہرحال انسان کی زندگی کا سفر جاری ہے، مومنانہ نقطۂ نگاہ سے اس سفر کا مطلب یہ ہے کہ وہ "دارالعمل" سے "دارالجزا" کی طرف جارہا ہے، وہاں اسے اپنے اچھے بُرے اعمال کی جزا یا سزا ملے گی۔ یاد رکھئے! ہماری یہ زندگی چند روزہ ہے جو ختم ہونے والی ہے۔ اگر سو سال، سوا سو سال کی عمر ہو گئی تب بھی چند روزہ ہی ہے مگر اس زندگی کے ختم ہو جانے کے بعد انسان ختم نہیں ہو جاتا، انسان پھر بھی باقی رہتا ہے، پھر بھی وہ زندہ رہتا ہے۔ اس زندگی کا نام "اَلْحَیَاۃُ الْاٰخِرَۃُ" ہے، یعنی اُخروی زندگی، جو موت کے بعد سے شروع ہوتی ہے، پھر اس کے ختم ہونے کی حد نہیں۔ قرآنِ حکیم

نے اسی کو حقیقی زندگی کہا ہے "اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ" (بیشک دارِ آخرت وہی ہے زندگی) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کو دانشمند اور عقلمند قرار دیا ہے جو موت کے بعد والی زندگی کے لئے محنت اور تیاری کرے۔

مؤمنانہ اور اسلامی نقطۂ نظر سے زندگی کی یہ جو حقیقت ہے اسے پیشِ نظر رکھ کر اقبالؔ بہت اُونچی آواز سے یہ کہتے ہیں:

اِسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

وہ یہ بھی صدا دیتے ہیں:

کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحبِ ہوش
اِک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا ہے نہ دوش

اقبالؔ کی مشہور نظموں میں ایک نظم "گورستانِ شاہی" بھی ہے اس نظم میں زندگی کی ناپائیداری و بے ثباتی کو کس خوبصورتی کے ساتھ سمجھاتے ہیں:

زندگی انسان کی ہے مانندِ مرغِ خوشنوا
شاخ پر بیٹھا کوئی دم، چہچہایا اُڑ گیا
آہ! کیا آئے ریاضِ دہر میں ہم، کیا گئے
زندگی کی شاخ سے پھُوٹے، کِھلے، مُرجھا گئے

زندگی کی شاخ سے پھُوٹنے اور کِھلنے کے بعد مُرجھا جانا، گویا یہ "موت" ہے، اقبالؔ اپنے ایک شعر میں کہتے ہیں کہ عقلمند آدمی موت سے نہیں ڈرتا، کیوں کہ جس طرح رات کے بعد دن کا آنا یقینی ہے،

اسی کی طرح موت کے بعد دوبارہ زندگی بھی یقینی ہے۔

موت کی لیکن دلِ دانا کو کچھ پروا نہیں
شب کی خاموشی میں جز ہنگامۂ فردا نہیں

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جو لوگ نادان ہیں، وہ موت کو زندگی کا خاتمہ سمجھتے ہیں لیکن دراصل موت کے بعد ایسی زندگی نصیب ہوتی ہے جس کو کبھی فنا نہیں۔

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی، صبحِ دوامِ زندگی،

اسی لئے اقبالؔ یہ تلقین کرتے ہیں کہ دُنیا جو دراصل "دارالعمل" ہے اس میں عملِ صالح کے ذریعہ اپنی زندگی کو بنا اور سنوار لینا چاہیئے، کیوں کہ آخرت جو "دارالجزا" ہے، اس میں "جنّت" اور "جہنّم" کا خدائی فیصلہ انسان کے اچھّے اور بُرے اعمال کو ہی سامنے رکھتے ہوئے ہوگا، کیوں کہ یہ خاکی انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے نہ نوری (جنّتی) ہے اور نہ ہی ناری (جہنّمی)، بلکہ یہ اپنے عمل سے ہی نوری اور ناری بنتا ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے، جنّت بھی جہنّم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اس کتاب سے

"ایک عالم، فاضل، محقق، دانشور، باخبر اور باادب آدمی کے لئے ضروری ہے کہ وہ الفاظ کا صحیح استعمال کرے، معنیٰ و مفہوم اور مراد و مطلب کو الفاظ کا جو جامہ پہنائے وہ موزوں اور چست ہو، الفاظ سے اندر کی حقیقت چھلک رہی ہو اور زبان واقعات کی تابع ہو، اس سے اخلاقی نظام کی درستی اور بہتری میں بڑی مدد مل سکتی ہے، آج کی دنیا میں جو فتنہ و فساد، عداوت و نفاق اور ظاہر و باطن میں دوعملی اور تضاد کا سکہ ہر طرف چلتا نظر آتا ہے، اس کی بڑی وجہ نیت کا کھوٹ اور الفاظ کی ملمع سازی ہے، بقول شاعر ؎

یوں تو الفاظ ہیں اظہارِ مطالب کے لئے
لوگ الفاظ میں نیت کو چھپا دیتے ہیں

اصحابِ دل اور قلندروں کے اس طریق سے بہت کم لوگ آشنا ہیں، جس کے بارے میں علامہ اقبالؒ کا فرمان ہے ؎

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق"

(مؤلف)